Scanned PDF WAQAR

ہمدرد نونہال

جملہ حقوق محفوظ ہیں

© فیروز سنز لاہور

بار اوّل ــــــــــــــ ۱۹۸۹ء

مطبع ــ فیروز سنز

غیر مجلّد ISBN 969 0 00935 4

WAQAR
Scan & PDF

انتساب

الف کے لیے!

کتنی دیواروں کے ساتھ ہاتھ چھڑاتے رہے
عشق نے لیکن ہمیں بے خانماں رہنے دیا

WAQAR
Scan & PDF

ترتیب

۱-	پورب کی سمت	۷
۲-	خانگی	۱۳
۳-	بابر کی تلاش	۲۱
۴-	بے نام سی عقیدت	۴۱
۵-	اسرار پانیوں کی کڑواہٹ	۹۵
۶-	سدا سہاگن	۱۰۵
۷-	جنم جلی	۱۱۳
۸-	انانیت کی بھینٹ	۱۳۳
۹-	جیو ندیاں وے میلے	۱۴۷
۱۰-	اُس نے کہا تھا	۱۶۷
۱۱-	اوما	۱۷۵
۱۲-	احتجاج	۲۴۹

پورب کی سمت

WAQAR
Scan x PDF

"سنو!"

"جی فرمائیے۔" کہنیاں میز پر ٹکا کر ہاتھوں کے کٹورے میں اپنے چاند چہرے کو سجائے اس نے حیرت سے آنکھیں پٹپٹائیں۔

"ایک تھا بے چارہ مسافر۔ دھندے کی تلاش میں نکلا تھا گھر کا راستہ اسے ایک چوراہے پر لے آیا، جس کے ایک کونے میں فقیر دھونی رمائے بیٹھا تھا۔

"بابا قسمت آزمانے نکلا ہوں کون سی سمت اختیار کروں؟" مسافر نے اس خدا مست درویش سے رہنمائی چاہی۔

"بچہ تین سمتیں اختیار کرنا۔ پورب کی سمت ہرگز نہ جانا۔ بڑی خطرناک راہ ہے وہ۔ قدم قدم پہ آسیب جال پھیلائے بیٹھے ہیں اور ہاں سنو! سنو اس راستے میں کالی چڑیل کا مسکن ہے جس نے بڑی خوبصورت شہزادی کو قید کر رکھا ہے۔ جو بھی اس طرف گیا پتھر کا بن کر رہ گیا۔"

وہ جو مسافر تھا نا! مہم جو طبیعت تھی اس کی اور مظلوم شہزادی کے ذکر سے تو اس کا دل بھر آیا۔ درویش سے بولا۔

"بابا میں تو اب پورب ہی کی سمت جاؤں گا۔"

درویش نے بہتیرا سمجھایا، ڈرایا، دھمکایا لیکن وہاں تو عزم راسخ تھا۔ مسافر اپنی بات پر اڑا رہا تب فقیر نے ترس کھا کر اسے سلیمانی ٹوپی اور جادو کا ڈنڈا دے دیا لیکن اس شرط کے ساتھ کہ وہ ان کی کرامت کا تماشہ صرف ایک مرتبہ ہی کر سکے گا۔ مسافر کو جلد ہی ایک اور شہر میں مقید مشہور شہزادی دکھائی پڑی جس کی درد بھری التجا اسے رلا گئی اور جان پر کھیل کر اس نے سلیمانی ٹوپی اور جادو کے ڈنڈے کی مدد سے شہزادی کو ظالم چڑیل کے چنگل سے رہائی دلا دی۔ اس کوشش میں بے چارے نے سلیمانی ٹوپی اور جادو کے ڈنڈے سے بھی ہاتھ دھو لئے کہ فقیر نے انہیں صرف ایک مرتبہ استعمال کرنے کی اجازت دی تھی۔"

"اچھا جی" ساحرہ کی شرارتی آنکھوں نے انگڑائی لی۔

"جانتی ہو شہزادی نے اسے کیا انعام دیا؟ میں نے چائے کا کپ اپنی طرف کھسکاتے ہوئے کہا۔

"جناب کہانی سنانا آپ کا پیشہ ہے میرا نہیں۔ میں بے چاری تو سن رہی ہوں۔ ہاں انجام بھی بتا دیجئے نا!" مسکراہٹ اس کے ہونٹوں سے چپک گئی۔

"وہ جو شہزادی تھی نا، وہ اصل میں کوہِ قاف کی پری تھی۔ رہائی پا کر اس نے مسافر کا شکریہ ادا کیا اور اسے اکیلا چھوڑ کر اپنے دیس پرواز کر گئی۔

"چہ چہ چہ لیکن یہاں تو بڑی رحمدل ہوتی ہیں۔" ساحرہ نے بڑے عجیب سے لہجے میں کہا۔

"اب کیا کیا جائے کہ ظالم یہاں بھی ہوتی ہیں۔" میں نے چائے کا لمبا گھونٹ حلق میں انڈیلا۔

"ایک بات بتائیے؟"

"پوچھیے"

"یہ سارے شاعر ادیب ایک سی باتیں ہی کیوں کرتے ہیں؟ بڑی الجھی الجھی سی گفتگو

ہوتی ہے آپ سب کی۔ کم از کم میرا تو یہی خیال ہے۔"

"اچھا! اس سے پہلے بھی ایسی باتیں سن رکھی ہیں تم نے؟" اس لمحے مجھے خود اپنی آواز اجنبی سی محسوس ہوئی۔ ساحرہ کی بات نے ایک درد سا میرے لہجے میں گھول دیا۔ چائے کا ذائقہ بھی بدمزہ ہونے لگا۔

میری اس تبدیلی کو اس نے فوراً محسوس کر لیا اور ہنستے ہوئے بات کا رخ بدل دیا۔

ساحرہ سے یہ میری پہلی ملاقات اس حوالے سے تو ضرور تھی کہ ہم پہلی مرتبہ ملے تھے۔ لیکن ہم میں اجنبیت بھی ایسی کوئی باقی نہیں رہی تھی۔ پچھلے دو سال سے ہمارا خطوط کے ذریعے ایک دوسرے سے رابطہ تھا۔ وہ میری تحریروں کی بڑی مداح تھی۔ خود مجھے بھی اپنی لکھی وہ کہانیاں یاد نہیں رہی تھیں جن کے حوالے وہ اپنے خطوط میں دیا کرتی تھی۔ آہستہ آہستہ وہ مرحلہ بھی آ گیا جب مجھے اس کے خط کا شدت سے انتظار رہنے لگا۔ ساحرہ سے مجھے اب قلبی لگاؤ ہو گیا تھا اور دن رات اس سے ملاقات کے سپنے دیکھتا رہتا۔ خدا خدا کر کے وہ دن بھی آ ہی گیا۔

کمبخت دفتر سے ہفتے کی چھٹیاں لے کر میں کراچی آیا تھا۔ اس کے حالات جہاں تک میں جان پایا اس کی امارت کے غماز تھے۔ میں نے دانستہ اسے اپنی آمد کی اطلاع کراچی پہنچنے کے بعد کی۔ اصل میں میں یہ نہیں چاہتا تھا کہ وہ مجھے ٹرین کے تھرڈ کلاس ڈبے سے برآمد ہوتے دیکھ لے۔ بوتل سے جب میں نے اسے ٹیلی فون کر کے اپنی آمد کی اطلاع دی تو حیرت اور خوشی کے ملے جلے جذبات سے اس نے مجھے خوش آمدید کہا۔

کراچی پہلی مرتبہ آیا تھا اور راستوں سے قطعاً اجنبی۔ اس نے مجھے رکنے کو کہا اور تھوڑی ہی دیر بعد جب دروازہ کھلا تو میرے سامنے "ساحرہ" کھڑی تھی۔ وہ الف لیلوی کہانیوں کی خوبصورت جادوگرنیاں جو راہ بھٹکے مسافروں کو اپنے حسین دامِ الفت میں پھنسا کر آدمی سے پتھر کا بت بنا دیا کرتی تھیں۔ ساحرہ جتنی خوبصورت ہرگز نہیں ہوں گی۔ کراچی کی جاں سوز گرمی میں اسے دیکھ کر یوں محسوس ہوتا تھا جیسے پہاڑی کے دامن میں کوئی جھرنے کے نیچے بیٹھا غسلِ صحت

WAQAR
Scan x PDF

فرما رہا ہو۔

وہ میرے تصورات سے زیادہ حسین تھی۔ جب میں اس کی سحر زدہ معیت میں ہوٹل کی سیڑھیاں اتر رہا تھا تو کرسمس کے کارڈوں پر بنی ننھے فرشتوں کی تصویریں میرے ذہن میں ابھر رہی تھیں۔ وہ اپنی گاڑی میں مجھے لینے آئی تھی۔ میری شخصیت اس کے سامنے دب کر رہ گئی۔ اس لمحے مجھے اپنے کارڈ کا خیال آیا۔ دل نے چاہا اس سے ملنے پر میں نے سوچا اگر ساحرہ سے نہ ملتا تو زیادہ بہتر تھا اب تو بھرم ٹوٹتا نظر آ رہا تھا۔

لیکن یہ پہلی ملاقات تک ہی محدود رہا جلد ہی ہم قریب ہو گئے۔ میری لفاظی نے کسی حد تک مجھے سہارا دیا۔ ساحرہ مجھے رات کافی دیر تک شہر نگاراں کی سیر کراتی رہی۔ اس دوران میں اس نے میرا تعارف اپنے والدین سے بھی کروا دیا۔ بڑے نفیس لوگ تھے وہ۔ مجھے بڑی گرمجوشی سے ملے۔ اور اس بات پر ناراضی کا اظہار بھی کیا کہ میں ہوٹل میں کیوں قیام پذیر ہوں۔

میرے جی میں کئی مرتبہ آئی کہ اس پر اپنا حالِ دل بیان کر دوں۔ لیکن یہ رعب حسن تھا یا میری بزدلی کہ میں اسے ہیں اسطور بھی ڈر کے مارے کچھ نہ کہہ سکا۔ کل مجھے واپس چلے جانا تھا اور آج میں بڑے پختہ عزم سے اس کے سامنے بیٹھا تھا کہ اس پر اظہارِ محبت کر کے رہوں گا۔

ہم لوگ ایک خوبصورت ہوٹل میں بیٹھے تھے۔ نیم تاریک ماحول اور ساحرہ کی محبت نے مجھے زیادہ ہی جذباتی کر دیا۔ اس لمحے جب میں حالات سازگار پا کر اس سے مدعا بیان کرنے والا تھا۔ اچانک ساحرہ کی خوبصورت آنکھوں کا زاویہ بدل گیا۔ اس کی نظروں کا تعاقب مجھے ہال میں داخل ہوتے اس وجیہہ و شکیل نوجوان تک لے گیا جو بڑے وقار سے ہماری طرف آ رہا تھا۔

"میں نے کہا تھا نا کہ آپ کا تعارف آج ایک دلچسپ شخصیت سے کراؤں گی۔" ساحرہ کے شوخ لہجے نے میری سماعت کو جھنجھوڑا۔

"ہوں۔" میرے منہ سے بمشکل نکلا۔ وہ اسمارٹ نوجوان اب ہمارے بالکل قریب کھڑا تھا۔

"ہیلو ساحرہ!"

"ہیلو ذاہر۔ ان سے ملو یہ ہیں میرے فیورٹ رائٹر مسٹر شاہد عزیز۔"

"بڑی خوشی ہوئی جناب آپ سے مل کر۔ ساحرہ تو آپ کی تحریروں کی دیوانی ہے۔" اس نے گرمجوشی سے مجھ سے مصافحہ کیا۔

[illegible] نے اپنا ہاتھ ہیلو ٹرم کے کسی "معمول" کی طرح اس کی طرف بڑھایا۔ ہال کے مختلف کونوں [illegible] خوش گپیوں میں مصروف جوڑوں کے قہقہے میری سماعت میں دھماکے پیدا کرنے لگے۔ [illegible] کے گمراہ کن کا دھواں مرغولے بن کر میرے حلق میں اترنے لگا۔ ایک پھانس سی گلے میں اٹک گئی تھی۔ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے میری قوتِ گویائی کو موت آ گئی ہو۔ مجھے کسی نادیدہ ہستی نے اٹھا کر کھڑا کیا اور پھر بٹھا دیا۔ عامر ساحرہ کا منگیتر تھا اور قریباً پندرہ بیس منٹ ہمارے درمیان موجود رہا۔ وہ بڑی مشکل سے میرے "اعزاز" میں اتنا وقت نکال سکا تھا ورنہ بزنس مین کے پاس اتنا فالتو وقت کہاں ہوتا ہے وہ تو وہاں ہرگز نہ آتا لیکن منگیتر کی خواہش نہ ٹھکرا سکا۔ میرے موڈ کی اچانک تبدیلی کو شاید اس نے محسوس ہی نہیں کیا یا پھر اس کی پروا نہ کی۔ اس کے جاتے ہی میں نے بھی ساحرہ سے اٹھ جانے کی درخواست کی اور ایک ضروری کام کا بہانہ کر دیا۔ اس نے مجھے روکنا چاہا لیکن اب رکنے والی بات ہی کیا رہ گئی تھی۔

"ٹھیک ہے جناب ادیب تو موڈ کا مالک ہوتا ہے۔ ہم ٹھہرے بیچارے عام سے بندے کیا سمجھ پائیں گے۔" اور میں صرف مسکرا کر رہ گیا۔

اکثر جس جگہ ساحرہ مجھے لے جایا کرتی تھی میں معلومات میں اضافے کے لئے اس جگہ کا نام ضرور پوچھ لیا کرتا تھا۔ لیکن کچھ اتفاق جانیے کہ اس روز میں نے ساحرہ سے اس جگہ کا نام دریافت نہ کیا۔ وہ رات میں نے کانٹوں کی سیج پر کاٹی۔ زندگی نے کتنا بھیانک مذاق کیا تھا مجھ سے، اس کا احساس کچھ میں ہی کر سکتا تھا۔

اگلے روز جب ساحرہ مجھے الوداع کہنے آئی تو میری ذہنی ہی نہیں جسمانی حالت بھی بڑی ابتر دکھائی دے رہی تھی۔

"کیا بات ہے جناب بڑے سوگوار نظر آ رہے ہیں کہیں کوئی محبت وغیرہ کا چکر تو نہیں چل گیا؟"

Scan by PDF

اس کے لہجے کی شوخی حسبِ معمول برقرار تھی۔

ہم دونوں ان سیڑھیوں کے نزدیک پہنچ چکے تھے جنہیں عبور کر کے مجھے دوسری طرف کھڑی شہزادی تک جانا تھا۔ میں اچانک رک گیا۔ دل بھر آیا تھا۔ اس کی بات کا اور تو کوئی جواب نہ سوجھا میں نے اتنا ہی پوچھ لیا۔

"ساحرہ۔ جس جگہ ہم گئے تھے اس کا نام کیا تھا؟"

"چورنگی"۔ اس نے جواب دیا۔

"چورنگی شاید اس جگہ کو کہتے ہوں گے۔ جہاں سے چار راستے پھوٹتے ہیں۔" میں کسی سحر زدہ معمول کی طرح گہرے کنوئیں سے اسے خطاب کر رہا تھا۔

"کیوں؟" حیرت زدہ آنکھوں کی حیرت جاگی۔

"سنو! میں نے غلطی سے پورب کی سمت اختیار کر لی تھی۔" میری آنکھیں بے اختیار چھلکیں اس کی طرف دیکھے بغیر میں نے قریباً بھاگتے ہوئے سیڑھیاں عبور کی تھیں۔ سیڑھیوں کے ایک کونے میں سانس لینے کو رکتے ہوئے مسافر نے دھندلائی آنکھوں سے نیچے نظر دوڑائی۔ کوہ قاف کی شہزادی حیرت سے اس کا نظارہ کر رہی تھی۔

خانگی

سرداراں ایسی طوائف بھی پورے بازار میں ایک تھی۔ سانولی نکل گئی تو کیا ہوا؟

"اے بی وہ تھی کن کی کن میں سے تھی۔ ہائے رے وہ گھڑی جب اماں نے بغیر قوم پوچھے رسم ادا کروا دی۔"

ایک روز جب پچھلے بازار والی پٹھانی نے کہہ دیا۔ "بہن بڑھاپے کا سہارا تو تھا اب دو ملتی عمر ہے۔ گڈو کی تعلیم جانے کب مکمل ہو تو تم کو لی سکھ کی گھڑیاں دیکھو گی۔"

تو! سرداراں اسے مارنے کو اٹھی تھی۔ وہ تو بھلا ہو مائی جیونی کا جس نے بیچ بچاؤ کروا دیا۔ ورنہ تو بازار میں وہ ڈگڈگی بجتی کہ ایک عالم تماشہ کرتا۔

"سانولی نکلی تو کیا ہوا؟ مولا عباس رکھے میری گڈی کو۔ لونڈیا کے پیر دیکھتے ہیں۔ استاد نے۔ اور میری بیٹی کا گلا پیٹیالے والے خان صاحب سے تعلیم دلوا رہی ہوں۔ دیکھنا پورے بازار کی ناک ہو گی میری بیٹی۔" سرداراں نے بھری مجلس میں پٹھانی کے دہ لتے لئے کہ سب چپ چاپ دیکھا کیے۔

"رسی جل گئی پر بل نہ گئے۔" اس کے اٹھتے ہی پٹھانی نے دل کی بھڑاس نکال دی۔

سانولی نے کوئی معمولی دھچکا نہیں لگایا تھا سرداراں کو۔ اس کی ساری زندگی کی کمائی یہی دو بیٹیاں ہی تو تھیں۔ پہلے روز جب سانولی مجرے پہ بیٹھی تو سارے بازار نے دیکھا سرداراں نے

WWW.PAKSOCIETY.COM
Scanned by PDF

کیا نہیں کیا تھا؛ کون سی کمی رہنے دی تھی اس نے؛ تین روز تک گھر کی رونق تمام استادوں پر حرام تھی۔ انہیں پہ کیا موقوف ارد گرد کے تمام بھیک منگے وہیں چلے آئے تھے۔ پھر شاید اس کی خوشبو کو کسی کی نظر کھا گئی۔ ابھی دو مہینے ہی گزرے تھے کہ لونڈیا کی دھوم مچ گئی۔ سارے شہر کے شرفاء اڈے سے چلے آتے تھے جس روز وہ موا کباڑیا آیا روز سرداراں کا ماتھا تو سر در ٹھنکا۔ آخر زر و جواہر کی طوائف تھی۔ تماشبین کی نظر کی پہچان اس سے زیادہ اور کسے ہوگی؛ لیکن چپکی ہو رہی۔ آسائش الدار شتی۔ پھر سرداراں نے بھی گھاٹ گھاٹ کا پانی پی رکھا تھا۔ یہی تو سبق اسے پڑھایا جا رہا تھا پچھلی تین نسلوں سے۔

"چودھری یہ بوتل لے کر یہاں نہ آیا کرو۔ اس کوٹھے پہ شرفاء آتے ہیں۔ ایسا شوق پورا کرنے کو باقی بازار مر تو نہیں گیا۔" بالآخر اس نے ایک روز بڑے کباڑیے سے کہہ ہی دیا۔

"بائی کیوں بھتہ کرتی ہو۔ ہم نے تو اپنے اندر کی آگ میں جلنے آتے ہیں۔ تمہارا کیا لیتے ہیں اور یہ تم جانتی ہی ہو کہ سارے شرفاء ایک طرف اور بلا ایک طرف۔ جب جی چاہے آزما لینا۔" اس نے سو سو کے پانچ نوٹ سرداراں کی طرف اچھال دیئے۔

"اے نئیں میاں!" سرداراں نے نوٹوں پہ جھپٹتے ہوئے کہا۔ "میں تو یونہی کہہ رہی تھی تم جانو تحصیل دار ہے نا۔ اس نے بڑا غصہ کیا تھا۔" سرداراں نے کمال مکاری سے بڑے کباڑیے کی بلائیں لیتے ہوئے رقابت کا مؤثر ہتھیار آزمایا۔

"دیکھ لیں گے اسے بھی۔" بڑے نے... سیڑھیوں کی طرف قدم بڑھائے۔

اس کے بعد وہ کبھی بوتل لے کر نہ آیا۔ یہ ضرور تھا کہ اس کی آمد و رفت کے اوقات میں کچھ زیادہ ہی بڑھ گئی تھی۔ سانولی بھی سرداراں کی بیٹی تھی۔ کیا مجال جو ماں پہ کبھی کچھ ظاہر ہونے دیا ہو۔ صاحبزادی کے بچپن تب کھلے جب ایک روز غائب ہو گئی۔ جاتے ہوئے وہ سوائے تن کے کپڑوں کے اور کچھ نہ لے گئی تھی۔ وہ بھی ایک روز سرداراں کو وصول ہو گئے۔ اس اطلاع کے ساتھ کہ سانولی اور بڑے نے عدالت میں نکاح کر لیا ہے اور اب سانولی اپنی پچھلی گھناؤنی زندگی کو بالکل بھول جانا چاہتی ہے۔

کیا کیا دکھ نہ اٹھائے تھے اس نے اپنی اولاد کے لئے۔ ایک دفعہ جب سانولی کو یرقان ہوا تو سرداراں نے چاندی کا پنجہ اور علم چڑھایا تھا۔ مولا عباس کی نیازیں اس سے سوا تھیں۔

"ہائے بیٹی تو اسی روز کیوں نہ مر گئی۔ تب مجھے حوصلہ تو رہتا۔" اس نے صرف ایک ہی بات کہی اور چپ سادھ لی۔

ماکھے کو بلا کر اس نے بات سمجھائی تو ماکھے نے کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے کہا۔

"نہ مائی مولا حسین کی قسم میرے جیسے تو اس کے ڈیرے پہ پانی بھرتے ہیں۔ تم بس اس کو تقدیر جان کر قبول کر ہی لو تو بہتر ہے۔" جب بازار کے بڑے بڑے معاش نے یہ بات کہہ دی تو سرداراں بھنا کر رہ گئی۔ لیکن اس نے شکست تسلیم نہیں کی تھی۔ اپنی سی کر گزری تھی وہ تو برا ہو ستاروں کا کہ الٹے ہی پھر گئے۔

سرداراں نے اس انتظار میں کہ عشق کا نشہ اترتے ہی سانولی واپس آ جائے گی۔ دو ماہ تک اس کا انتظار کیا لیکن اسے نہ آنا تھا نہ آئی۔ پھر تو جیسے سرداراں کو صبر آ گیا۔ اس نے حالات سے مفاہمت کر لی اور سب کچھ بھلا کر گڈو کی تربیت میں جت گئی۔

گڈو کے سارے اگلے تگلے پورے ہو رہے تھے۔ کیا مجال جو کسی چیز کی فرق آنے دیا ہو سرداراں نے۔ ایک سے ایک بڑھ کر استاد، ناچ کا بھی، گانے کا بھی، شریکے برادری کا معاملہ تھا کبھی کسی "ختم" سے ناغہ نہ کرتی۔ مبادا بازار والیوں کو کچھ کہنے سننے کا موقع مل جائے۔ ہر جمعرات کو حضرت شیر شاہ کے ہاں حاضری ہوتی۔ چڑھتے چاند کی پہلی جمعرات کو مائی حیداں کے اہم بارے میں مجلس علیحدہ جمتی۔ ایک سے ایک بڑھ کر ذاکر بلوائی جاتی سرداراں۔

بابا بہنگا جو اپنے مربعے اس کے عشق میں پھونک کر کنگلا ہو گیا تھا۔ پھر اسی چوکھٹ کا ہو رہا۔ سرداراں احسان فراموش ہوتی تو دانے ختم ہوتے ہی جوتے مار کر بھگا دیتی۔ لیکن تھی رحم دل۔ ذرا کہیں پیاسوں کا بیان سنا پچھاڑیں کھا کر گرتی۔ آنسوؤں کے تو جیسے جھرنے بہنے لگتے تھے اس کی آنکھوں سے۔

Scan x PDF WAQAR

"اللہ بخشے اماں بتاتی تھی میں بٹالے والے سیدوں میں سے ہوں" وہ بڑے فخر سے کہا کرتی۔

دوسرے تیسرے روز بابا جہنگا کو بھی آدھ تولہ افیم ملتی ہی رہتی تھی۔ ڈیرے کی چاندنی کا پل علیحدہ اٹھ رہا تھا۔ خدا جانے کون سے خزانے دبار کھے تھے سرداراں نے۔ جہاں دیدہ یہ سارا دھندہ چل رہا تھا ورنہ تو وہ سیٹائر منٹ کی زندگی گذار رہی تھی۔

"خانگی ہے" ایک روز مشیدہ نے کہیں کہہ دیا۔

پھر کیا تھا وہ حشر کیا تھا۔ سرداراں نے اس کا کہ بے چاری کئی روز تک تو کوٹھے سے نیچے نہ اتری۔ بالوں سے پکڑ کر گھسیٹا تھا اسے بھرے بازار میں۔

"حرام خور۔ گھروں سے بھاگ کر کوٹھے بچانے آجاتی ہیں خاندانیوں کی گویا کوئی بات ہی نہیں" اس کے بعد سے پھر کسی کو کچھ کہنے کی ہمت نہ ہوئی۔

اس روز جب استاد گامی خان گانچا پی کر اٹھنے لگا تو سرداراں نے بڑی ملتجی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔ "استاد جی! آپ تو جانتے ہی ہیں میرے حالات۔ کوئی قارون کا خزانہ تو ہے نہیں۔ یہ تو بڑے بزرگوں کی جمع پونجی تھی۔ اب تو نوبت ادھار پہ آرہی ہے کہیں یہ بھرم ٹوٹ ہی نہ جائے۔ کب بیٹھے گی گڈو مجرے پہ؟"

"بی بی! ۔ ساری اولاد ایک سی تو ہوتے سے رہی۔ تم جانو میں نے سانولی کو دو ماہ ہی میں سارے نرت بھاؤ بتا دیئے تھے۔ یہ لونڈیا دماغ کی بس ایسی ہی ہے۔ جی جان سے محنت کروا رہا ہوں۔ مولا عباس نے چاہا تو بس اب ایک ڈیڑھ ماہ ہی کی بات ہے۔" استاد نے بڑی ہمدردی سے کہا۔

"جہاں اتنا کشٹ کاٹا۔ مولا نے چاہا تو یہ دن بھی بیت جائیں گے۔" سرداراں نے سرد آہ بھر کر سگریٹ کا لمبا کش لیا۔

بابا جہنگا نے جب اس روز بی بی کو سوگوار دیکھا تو حوصلہ دے کر بولا "اپنی گڈو کو

کار میں گھومتا دیکھ لوں اس سے پہلے نہیں مرنے کا میں بھی۔"

"اللہ تیری زبان مبارک کرے بابا" سرداراں نے مستقبل کے سنہرے سپنے میں کھوتے ہوئے کہا۔

چودھری شفیع نے دھوپ میں بال سفید نہیں کئے تھے۔ لدھیانہ سے وہ سرداراں کی خاندانی طوائفیں اس کا پالن بھرتی تھیں تھانے کچہری کے معاملے سب وہی نمٹاتا تھا کیونکہ اس کے تعلقات للو پنجو لوگوں سے نہیں، شہر کے راٹھوں سے تھے اور وہ جواب تک لوگوں کے دلوں کی تسکین کا سامان کرتا آیا تھا، گڈو کی اٹھان دیکھ کر اپنا دل بھی ہار بیٹھا تھا۔ اسی لئے سرداراں کے پل پل کی خبر تھی اسے۔ ٹال والے پٹھانوں کے ہاں اس کی آمد و رفت کا مطلب وہ بخوبی جانتا تھا۔ سود کا روپیہ بانس کے بچدے سے زیادہ تیز رفتاری سے بڑھتا ہے۔ اسے علم تھا بازار کی جو عورت اس ٹال پہ گئی ہمیشہ کے لئے محتاج ہو کر رہ گئی۔ سو کے دو سو لوٹانے ہوتے تھے۔ گڈو پہ اس کی نظریں سانولی کے فرار کے فوراً ہی بعد جم گئی تھیں۔

چودھری شفیع نے لوہا گرم دیکھ کر چوٹ لگائی تھی۔ صبح اس نے ٹال والے پٹھان کو سختی سے تقاضہ کرتے اپنی آنکھوں سے دیکھا اور کانوں سے سنا تھا۔

"گھر کی بات ہے بی بی منہ مانگے تو نہیں مناسب رقم دے دوں گا ویسے کام آنے والا بندہ ہوں۔ پھر سارا معاملہ چپ چاپ طے ہو جائے گا۔ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوگی۔" شفیع نے بڑی رازداری سے اسے سمجھایا۔

"چودھری یہ ڈیرے دار کا گھر ہے۔ کسی خانگی کا کوٹھا نہیں۔ آئندہ ایسی بات کبھی بھی منہ سے نکالی تو یاد رکھنا مونچھیں اکھاڑ کر ہاتھ میں دے دوں گی۔"

"تمہاری ماں کے زمانے سے صاحب سلامت چلی آرہی ہے۔ تمہیں اپنی جان کر خود چلا آیا ہوں۔ بڑی بڑی خاندانی طوائفوں کے جوتے گھس جاتے ہیں۔ میرے ڈیرے کے چکر لگاتے

Scan by PDF

بہرحال میری پیش کش موجود ہے جب جی چاہے چلی آنا۔ بس ایک بات یاد رکھنا جو عزت میرے آنے سے تھی وہ تمہارے آنے سے نہیں ہوگی۔ اب ضرورت مند میں ہوں۔ تب تم ہوگی۔" یہ کہہ کر چودھری شفیع اٹھ آیا۔

سرداراں نے حالات کی نزاکت کو جان لیا تھا۔ سارا بازار ہاتھ دھو کر اس کے پیچھے پڑا تھا۔ سود والے قرض کا معاملہ الگ تھا۔ اب سود خور پٹھان بھی منہ لگنے لگے تھے۔ مزید انتظار اس نے مناسب نہ سمجھا۔

"استاد جی! میں نے بچی کو مجرا کروانا ہے۔ کھٹک نہیں بجوانا۔"

اس نے اگلے ہی روز فیصلہ کن لہجے میں استاد گامی خان سے کہہ دیا۔

"جو حکم بی بی"۔ استاد نے گانجے کا لمبا کش کھینچا۔

اگلے روز گڈو کا مجرا شروع ہو گیا اور آٹھویں ہی روز جب سود خور جان کو آنے لگے تو سرداراں نے اپنی دانست میں بڑا ہی معزز گاہک چنا تھا۔ خوش لباس نوجوان جس نے پہلے ہی روز سے استاد گامی کے ذریعے بات بڑھائی تھی۔ تین ہزار ماہانہ اور بیس ہزار نقد پر معاملہ ٹھہرا تھا۔ زیور رات جو اس نے لونڈیا کو پہنانے تھے وہ الگ سے۔

سرداراں نے دشمنوں کو جلانے کا پورا سامان کیا تھا..... سارے بازار کی معزز طوائفیں اس کے کوٹھے پہ جمع تھیں۔ خود اس نے بنارسی کام دار ساڑھی پہن رکھی تھی جو اس کے ہونے والے "داماد" نے اسے کل ہی نذر کی تھی۔ ہاتھ میں گولڈ لیف کی ڈبیا اور گیس لائٹر پکڑے۔ وہ خود تمام کاموں کی نگرانی کر رہی تھی۔ کوٹھا قمقموں سے جگمگا رہا تھا۔ بابا مہنگے نے دوہاری دار پاجامہ، سفید کرتے اور چار خانے رومال کے ساتھ پہن رکھا تھا۔ پیروں میں سفید فلیٹ پہنے اس کے خوشی کے مارے پاؤں نہ ٹکتے تھے۔

"ملک جی" نے اسے پورا ایک تولہ افیون لے کر دی تھی۔ صبح جو انعام فی بی اور ملک جی کی طرف سے ملنا تھا وہ الگ، خود اپنے ہاتھ سے کمر سجایا تھا اس نے۔!!

بیٹھک باجے کے شور میں مائی جیونی نے پلنگ پر سفید چادر خود بچھائی تھی۔ بیس ہزار روپیہ بریف کیس میں پلنگ کے سرہانے رکھی تپائی پہ دھرا تھا۔ بریف کیس صبح سب کی موجودگی میں کھلنا تھا تاکہ بعد میں کسی کو باتیں کرنے کا موقع نہ مل سکے۔ یہ اس کی خاندانی رسم تھی خود اس کے ساتھ بھی یہی ہوا تھا۔

گڈو کو کمرے میں بھیجنے سے پہلے سرداراں نے اکیس سو روپے کی نذر اتاری اور سب کے سامنے پیسے استادوں میں تقسیم کر دیئے۔ جل بھن کر ہی تو رہ گئی تھیں ساری بازار والیاں۔

علی الصبح سرداراں کی آنکھ سیر مٹھیوں سے اٹھتی "دھمر وِنڑ" کی آواز سے کھلی تھی۔ بازار کی تین چار بوڑھیاں اس کے ہاں ہی سو گئی تھیں صبحگی کی رسم ادا ہو جائے۔ پھر اسے یوں محسوس ہوا جیسے وہ کوئی بھیانک سپنا دیکھ رہی ہے۔ اسے۔ ایس۔ آئی اور تین سپاہی ایک دوسرے کے پیچھے وہاں گھس آئے۔ ان سب کا رُخ حجلۂ عروسی کی طرف تھا۔

سرداراں سکتے کے عالم میں انہیں دروازہ توڑ کر اندر داخل ہوتے دیکھا۔ وہ ملک جی کو گالیاں دیتے۔ بریف کیس اور زیورات اٹھائے باہر نکل رہے تھے۔

"ایسے یہ پولیس ہے یہاں فراڈ کر کے کوئی مائی کا لال کہاں جا سکتا ہے" چھوٹے تھانیدار نے اسے گریبان سے پکڑ رکھا تھا اور گالیاں دیتا باہر کھینچ رہا تھا۔

"تم لوگ بھی فوراً تھانے پہنچو" اس نے نیم بے ہوش سرداراں کو گھرکی پلائی۔

بابا مہنگا اور استاد گامی کی تقریباً گھنٹے بھر کی جدوجہد کے بعد جب سرداراں ہوش میں آئی تو اس نے دیکھا سامنے چودھری شفیع بیٹھا مسکرا رہا ہے۔ سرداراں نے اس کی طرف دیکھا اور شکست خوردہ سی ہو کر نظریں جھکا لیں۔ اگلے روز بابا مہنگا سرداراں کے پیغام کے ساتھ چودھری شفیع کے دروازے پہ دستک دے رہا تھا۔

Scan & PDF WAQAR

WAQAR
Scan x PDF

بابر کی تلاش

چالیس سال ریوڑ میں جوتیاں چٹخانے کے بعد میرے والد مرحوم نے سوائے اس کے اور کوئی کارنامہ انجام نہ دیا کہ جاتے جاتے اپنی بلا میرے گلے منڈھ گئے۔ میں نے بارہ سال تعلیم حاصل کر کے دسویں جماعت تھرڈ ڈویژن میں پاس کی تھی، پھر ریلوے ملازمین کے "سپیشل کوٹے" کے صدقے کلرکی بہادر بن کر اسی دفتر کی فائلوں سے سر پھوڑنے لگا جہاں میرے والد صاحب نے زندگی کا سنیاس بھگتا تھا۔ عموماً ایک کلرک کے گھر پیدا ہونے والا بچہ زیادہ ذہنی اپروچ حاصل نہیں کر پاتا، جبکہ بدقسمتی سے اسے ماحول بھی مجھ جیسا میسر آیا ہو۔ ہم لوگ اندرون شہر کے ایک محلے کی ٹیڑھی میڑھی تنگ و تاریک گلی کے آخری سرے والے تین منزلہ مکان کی درمیانی منزل میں قیام پذیر تھے جہاں شریف آدمی دن کو بھی ٹارچ لئے بغیر داخل نہیں ہو سکتا۔

"ماں جی آپ کو لاہور میں اور کوئی ڈھنگ کا مکان رہنے کو نہیں ملا"۔ میں جب بھی یہ سوال اپنی ماں سے کرتا وہ ایک ہی جواب دیتی۔

"بیٹا وہاں جالندھر میں بھی ہم ایسے ہی محلے میں رہا کرتے تھے۔"

بہار، حال بالکل اس طوطے جیسا تھا جسے پنجرے سے دھکے دے کر باہر نکالو تب بھی وہ واپس اسی میں گھس آتا ہے۔ جن لوگوں نے یہاں اپنی ریاستیں قائم کر رکھی تھیں وہ ادھر کے رہنے تو تھے نہیں۔ میرے والد صاحب تو بیچارے دس جماعتیں پڑھے ہوئے تھے، لیکن محمد یار کورا ان پڑھ تھا اور جبلی

کھیسوں پہ آدھا محلہ اس نے اپنے نام الاٹ کروا رکھا تھا۔ ہر مہینے کی سات تاریخ کو جب آڑھتی موٹی بیوی ہم سے کرایہ لینے آتی تو میرا جی چاہتا اس کا پوپلا منہ نوچ لوں جس میں پان کی پیک بھری رہتی تھی یا پھر سارے محلے کی چغلیاں۔

جس روز والد صاحب میری تقرری کے بعد مجھے اپنے اعلیٰ افسر کے سامنے لے [illegible] پیش ہوئے اور نئے غلام کی حیثیت سے وہاں سب مجھے متعارف کروایا تو میرے ذہن میں پہلی بات یہی آئی تھی کہ ابھی تک انہوں نے گناہوں کا مکمل کفارہ ادا نہیں کیا باقی کی سزا مجھے بھگتنی ہے۔

"برخوردار تمہارے والد کی نیک نامی اور ایمانداری کا یہاں ہر شخص معترف ہے۔ مجھے امید ہے تم اپنے والد کی روایت کو زندہ رکھو گے۔" خشخشی ڈاڑھی اور گول آنکھوں والے افسر اعلیٰ نے عینک کے شیشوں کے اوپر سے میری اوقات کا اندازہ لگاتے ہوئے حاکمانہ لہجے میں کہا۔

میرے ذہن میں تو اس کی بات کا کچھ اور جواب آیا تھا لیکن اس وقت میں نے بڑی عاجزی سے گردن جھکا کر گویا اس کی ہاں میں ہاں ملا دی۔ اصل میں میرا یہاں صرف ایک ہی "انٹرسٹ" تھا کہ تنخواہوں میں سے سو پچاس تو مجھے مل ہی جایا کریں گے اور پھر "اوپر کی آمدنی" وہ بھی تو ہوتی تھی وافر مقدار میں۔ اگر کسی کا باپ پاگل ہو تو اس کا بیٹا پاگل ہونے لگے یہ شرافت کے جراثیم خون میں منتقل ضرور ہوتے ہیں لیکن یہ خون کی خرچ جسم کا حصہ نہیں بنتے رہتے۔ سکول سے بھاگ کر جب میں باغ کے ایک کونے میں بیٹھ کر سگریٹ پیا کرتا تو میرے لئے دلچسپی کا واحد ذریعہ وہ سکوٹر اور کار سوار ہوا کرتے جن کے پہلوؤں سے قسم قسم کی لڑکیاں برآمد ہو کر ان کے ساتھ چہلیں کیا کرتی تھیں۔ تب میں سوچتا آخر ان سکوٹر اور کار سواروں میں ایسے کیا سرخاب کے پر لگے ہیں کہ زمانے بھر کی خوبصورت لڑکیاں ان کے ساتھ منہ اٹھائے گھومتی پھرتی ہیں۔ پھر میرا ذہن خود ہی میری بات کا جواب مہیا کر دیتا۔ "پیسہ۔ حرام کا پیسہ۔ اوپر کی کمائی۔"

"اوئے جا اوئے جھڈو کیا کیا تیرے باپ نے ساری زندگی چالیس سال کلرکی کی اور اپنا مکان نہ بنا سکا۔ پانچ وقت کا نمازی بن کر کوئی مسجد کمیٹی کا ممبر تو نہیں لگ گیا۔ میاں بالا! دیکھ لے

تیرے باپ سے تو یہ بھی نہ ہو سکا۔" خلیفہ عمر دین ارائیوں کے تھڑے پہ لڑکوں کے درمیان بیٹھ کر مجھے ہمیشہ یہی بات کہتا آیا تھا اور یہ تھا کڑوا سچ۔ اس محنت کا کیا فائدہ جو ثمر آور نہ ہو۔ اگر میرے والد نے ساری زندگی نیکیاں کماتے ہی گزار دی تھی تو وہ محلے کی مسجد کمیٹی کے ممبر کیوں نہ بن سکے!

"اچھا خلیفہ ایک دفعہ مجھے لگ جانے دے کہیں اگر سارے دھونے نہ دھو دیئے تو غلام محمد کا لڑکا نہ کہنا۔" میں چڑ کر جواب دیتا۔

"تو بچہ کیا کرے گا۔ میٹرک تو کر نہ سکا کہ سرکاری ملازم لگے اور نہ ہی ریڑھی لگانے کے لئے سارے بازار کا کوئی کونہ خالی نہیں بچا۔ گڈی سائیں قریب سے جواب دیتا۔

میں کھسیانہ ہو کر منڈلی سے اٹھ کر گھر چلا آتا اور سارا غصہ ماں سے بحث کر کے نکالنے لگتا۔

"بیٹا تو بھی تو جوان ہے۔ اللہ نے تجھے دماغ بھی دے رکھا ہے تو کچھ کر کے دکھا دے۔ تیرے باپ نے تو پھر بھی دو بیٹیاں بیاہی ہیں اور تیسری پھر سر چڑھی بیٹھی ہے تو ہی ہمت کر اپنا مکان بنا لے۔" ماں نرچ ہو کر کہتی اور میں جھنجلایا ہوا ڈور گڈی لے کر اوپر کوٹھے پر جا چڑھتا۔

ہمارا مکان تین منزلہ تھا جس میں تین گھرانے قیام پذیر تھے۔ یہ الگ بات کہ ان کو "ایکتا" کا احساس دلانے کے لئے وہاں کچھ چیزیں مشترکہ تھیں خصوصاً نلکا اور ٹائیلٹ۔ جس پر ہمیشہ سے تینوں کے درمیان لڑائی ہوتی آ رہی تھی اور مستقبل بعید میں بھی اس کے خاتمے کا کوئی امکان نظر نہیں آتا تھا۔

نچلی منزل کے دو کمروں میں باؤ رفیق مع اہل و عیال فروکش تھا۔ درمیانی منزل میں ہم اور اوپر والے ایک کمرے میں بابا بھنگا اور بے بے رانی۔ ان محلوں میں ایک دوسرے سے محبت جتنی جلدی ہوتی ہے اتنی تیزی سے پنجابی فلموں میں بھی پروان نہیں چڑھتی۔ باؤ رفیق کی لڑکی بشیراں میٹرک میں کے ایک کونے میں جہاں انہوں نے پتھار رکھ کر اسے باورچی خانے کی شکل دے رکھی تھی۔ جب وال کو تڑکا لگا کر بگھارتی تو اس کی خوشبو میں نور جہاں کی وہ کٹیلی آواز بھی شامل ہوتی تھی جو اس کے قریب رکھے

Scan by PDF

ٹرانسسٹر سے بلند ہو رہی ہوتی۔ جب کبھی کوئی "خاص قسم کا گانا" ریڈیو پر بجتا وہ اس کا پورا والیم کھول دیتی اور اس وقت تک آواز نیچی نہ کرتی جب تک میری ماں اس کے سرہانے پہنچ کر اسے آگاہ نہ کر دیتی۔ "بیٹی میری نماز کا حرج ہوتا ہے"۔!

"تو یہ خالہ تم تو ہر وقت نماز ہی پڑھتی رہتی ہو" بشیراں اکثر کوسے بھرے انداز میں کہتی اور بڑبڑا کر آواز نیچی کر لیتی۔

میں نے اگر لڑکپن میں سکول سے بھاگ کر کبھی باغ میں چہل قدمی کرتی لڑکیوں کو نہ دیکھا ہوتا تو شاید مجھے وہ سانولی سلونی تیکھے نین نقشوں والی بشیراں غنیمت دکھائی دیتی۔ لیکن برا ہو ان دوستوں کا جنہوں نے مجھے سکول سے بھاگنا اور بھاگ کر کمپنی باغ میں سگریٹ پی کر چھٹی تک کا وقت گزارنا سکھایا اور میرا دماغ خراب کر دیا۔

نیچے اوپر بشیراں کا آنا جانا تو مختلف کاموں کی وجہ سے لگا ہی رہتا تھا اور میری بہن سے اس کی "دوستی" بھی تھی۔ اس لئے میرا اور اس کا ٹاکرا بھی ہوتا رہتا۔ ایسے ٹکراؤ پر وہ ہر دفعہ میری طرف کوئی ذو معنی فقرہ ضرور اچھال دیتی۔ اس نے اب تک مجھے کئی مرتبہ ہونٹوں پر مختلف رنگ کی لپ اسٹک اور ناخنوں پر نیل پالش لگانے کے علاوہ گلے اور کانوں میں پیتل اور جعلی نگینوں کے طرح طرح کے زیورات پہن کر بھی دکھائے تھے۔ لیکن میں ان "داؤں" سے ابھی تک صرف اس لئے محفوظ رہا تھا کہ مجھے تو خوب تر کی تلاش تھی۔ مجھے کڑھائی والے رومالوں، پیتل کی انگوٹھیوں، گھٹیا عطر میں لپٹے محبت ناموں یا نور جہاں کی چیختی چلاتی آواز میں نہیں، باغ میں گھومتی پٹاخ پٹاخ باتیں کرتی، کٹے بالوں والی زوردار قہقہے لگاتی لڑکیوں میں دلچسپی تھی۔

میرا مقصود بشیراں نہیں بابرا تھی۔ بابرا۔!

اور ایک روز وہ بابرا مجھے مل گئی۔ مجھے ملازمت کرتے ابھی دو ماہ ہی گزرے تھے، اور تین نئے جوڑے کپڑوں کے میں نے سلوا لئے تھے۔ حبیب محمد یار کے سامنے والے مکان میں نئے کرایہ دار آ گئے۔ یہ لوگ "خاصے پڑھے لکھے" تھے اور ماڈرن بھی۔ یہ عقدہ تو کافی دیر بعد کھلا

کہ وہ ہمارے محلے میں آئے کیوں تھے؟ پہلے وہ جہاں مقیم تھے وہاں سے انہیں "تھانہ" باندھ کر محلہ والوں نے رخصت کیا تھا۔

ہماری کھڑکی بالکل اس کمرے کے سامنے کھلتی تھی جسے ان لوگوں نے ایک طرح سے اپنا "ڈرائنگ روم" بنا رکھا تھا۔ میں ذرا قناعت پسند آدمی ہوں۔ اس لئے میں نے صرف "دستیاب" کو انتخاب کیا تھا ورنہ وہاں تو شمع سے لے کر اجالا تک ہر شے موجود تھی۔

پہلی نظر شمع پر ڈالنے کے بعد مجھے اس بات کا قائل ہونا پڑا کہ سچی محبت واقعی پہلی نظر میں ہو جاتی ہے۔ میں نے اس کی صرف ایک جھلک دیکھی اور صدق دل سے اس پر فاشق ہو گیا۔ اس کے نام کا علم مجھے اپنی بہن سے ہوا جب اس نے میری بہن سے تعارف حاصل کیا۔ ایمانداری کی بات تو یہ ہے کہ اسے نگینہ ہونا چاہیئے تھا۔ اور ایک روز یہ بات میں نے اس سے کہہ بھی دی۔ وہ اپنی آمد کے تیسرے ہی روز ہمارے گھر آ گئی۔ گھر والے قریبی گھر "مولود شریف" پر گئے تھے میں اکیلا ہی شیشے کے سامنے اب تک درجنوں بار اپنا تنقیدی جائزہ لے کر اس کے کھڑکی سے طلوع ہونے کی دعائیں مانگ چکا تھا۔ جب وہ اچانک سیڑھیوں سے نمودار ہوئی۔

"السلام علیکم"۔ اس نے مجھے دیکھتے ہی کھٹاک سے کہہ دیا۔

میرا تو ہونقوں کی طرح صرف گردن ہلا دی۔ بجلی گرنے سے اتنی جلدی تو کسی کا سنبھلنا آسان نہیں ہوتا۔

"منور کہاں ہے"؟ اس نے تو مجھے سنبھلنے کی مہلت ہی نہ دی۔

"جی بیٹھئے ابھی آتی ہے"۔ میں نے بجائے سچ بولنے کے اسے سامنے رکھی کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

اس نے خدا جانے یہی سمجھا ہو گا کہ منور ادھر گئی ہے بڑی ادا سے اٹھلاتی ہوئی وہ اسی کرسی پر بیٹھ گئی میں اس کے قریب کھڑا رہا۔ "پہلا وار کاری ہو تو شکار بچ نہیں سکتا"۔ میرے لاشعور میں سویا کسی ناول لائبریری کے ناول کا فقرہ جاگ اٹھا۔ "برخوردار اس سے پہلے کہ چڑیا اڑ جائے جال پھینک دو"

Scanned with CamScanner

اندر سے آواز آئی۔

ڈیڑھ دو منٹ جب یونہی گزر گئے تو اس نے میری چوری پکڑ لی۔ "کہاں گئی ہے منور؟"

"دیکھئے اصل میں وہ اماں جی کے ساتھ مولود شریف پر گئی ہے۔ میں نے تو..."

"اوہ۔ اب میں سمجھی"۔ اس نے بے باکی سے میرا فقرہ اچک لیا۔

"آپ کا نام شمع ہے نا؟"۔ میں نے پورٹ کی ٹوہ چاہ پائی کے پائے پر بجاتے ہوئے پوچھا۔

"جی۔ آپ کو اعتراض ہے کوئی"۔ اس نے اٹھتے ہوئے مخصوص انداز سے کہا۔

"دراصل آپ کا نام نگینہ ہونا چاہیئے تھا"۔ میرا حوصلہ اس نے خود ہی بڑھا دیا۔

"جی۔ وہ کیوں جناب؟" اس نے میری طرف گھومتے ہوئے پوچھا۔

"تاکہ کوئی آپ کو اپنے دل کی انگوٹھی میں ہمیشہ کے لئے محفوظ کر لے"۔ میں نے خالص فلمی انداز اپنایا۔

اس کے گالوں پر سرخیوں کے بھنورے ناچنے لگے۔ اپنی جھلمل کرتی غزالہ آنکھیں اس نے پہلے سے کھول کر میری طرف دیکھا۔ "آپ شاعری کرتے ہیں یا نوکری"۔ کہہ کر دھڑ دھڑ کرتی وہ نیچے بھاگ گئی۔

شمع کو اپنے خیالوں کے شیشہ محل میں تو میں نے اسی روز سجا لیا تھا۔ جب اس کی پہلی جھلک دیکھی تھی لیکن اس کی پروانوں کو موت کی راہ پر گامزن کرنے والی روشنیوں کا احساس مجھے آج ہوا تھا۔ وہ واقعی ایسی لڑکی تھی جس کی خاطر دو سلفیتی آپس میں ٹکرا جاتیں۔ یہاں تو قدم قدم پر اس کے لئے جال بچھے تھے۔ کتنے ہی پروانے اس کے اوپر جل مرنے کو تیار بیٹھے تھے۔ میری بچی جس بار بار یہی کہہ رہی تھی "صاحبزادے ذرا بچ کر کے ہاتھ ڈالنا"۔ !!

میں شیشے کے سامنے سے ہٹا اور کھڑکی کے آگے کرسی بچھا کر اس کی کھڑکی پر نظریں جما کر بیٹھ رہا۔ لیکن وہ پٹ پھر اگلی صبح تک وا نہ ہوئے۔

وہ رات میں نے کانٹوں کی سیج پر کاٹی۔ ساری رات شمع میرے نہاں خانۂ دل میں

سلگتی رہی اور میں پتنگوں کی طرح اس کا طواف کرتا رہا۔ صبح چھ بجے میں نے کھڑکی سنبھال لی اور ناشتہ بھی وہیں منگوا لیا۔ ابھی چائے کی پیالی میرے ہونٹوں سے لگی ہی تھی کہ سامنے کھڑکی سے چاند نکل آیا۔ میں بھی تیار بیٹھا تھا۔ اس نے سفید کپڑوں پر سرخ سویٹر پہن رکھا تھا۔ شاید کالج جانے کی تیاری تھی۔ چائے کی پیالی ہونٹوں سے لگائے کنکھیوں سے اسے تاکا اور جیسے ہی ہماری نظریں ٹکرائیں سر کے بالوں کا طواف کرنے لگا۔

سلام محبت پیش کرنے کا یہ طریقہ کس نے کب ایجاد کیا تھا؟ اس کا تو مجھے علم نہیں لیکن اس روز جب شمع نے گردن کو خم دے کر مجھے جواب سے نوازا تو میرے دل سے اس موجد کے لئے دعائیں نکلیں۔ میری رات بھر کی تپسیا بار یاب ہو گئی تو جیسے میں ہلکا ہو کر فضاؤں میں اڑنے لگا۔ میری طرف دیکھ کر اس نے ادائے خاص سے مسکراتے ہوئے اپنے دوپٹے کے پلو کو انگلی پر مروڑا اور نیچے بھاگ گئی۔ اس کی ماں کسی کام سے اس کمرے میں آ گئی تھی۔ میں نے بھی گردن موڑ کر دوسری طرف دیکھنا شروع کر دیا۔

بمشکل دو تین منٹ بعد ہی میدان خالی دیکھ کر وہ پلٹی اور خراماں خراماں چلتی کھڑکی میں آ گئی۔ ہم دونوں ہی ایک دوسرے کے چور بنے ایک دوسرے کے سامنے کھڑے تھے۔ اس بات کا ہمیں بخوبی احساس تھا کہ ایسی ہی کئی کھڑکیاں ان سلسلہ ہائے مکانات میں کھلی ہیں اور کسی کی بھی نظر ہم پر پڑ سکتی ہے۔ اس لئے احتیاط کا دامن ہم نے نہ چھوڑا۔

"ذرا منور کو بلا دیں"۔ اس نے خود ہی پہل کی اور آواز اتنی نیچی رکھی کہ دوسرے کمرے میں ریڈیو کے زیر سایہ روٹیاں پکاتی میری بہن تک نہ پہنچ سکے۔

"آپ نے منور ہی سے ملنا ہے"؟۔ میں نے بے اختیار کہہ دیا۔

"آپ تو پاگل ہیں"۔ اس نے مجھے احتیاط کا دامن تھامنے کی تلقین کی۔

"ہاں"۔ میں نے ٹھنڈی سانس لی۔ "کل تک تو نہیں تھا"۔ اس کے لب لعلین وا ہوئے اور موتی چمکنے لگے۔ "ہائے اللہ میں کیا جاگی جا رہی ہوں۔ بلائیے نا پلیز"۔ بولنے کا

Scan by PDF WAQAR

اندازہ بھی کم بخت کا انہی لڑکیوں جیسا تھا جو میرے دل و دماغ میں رچی بسی تھیں۔ مجھے بادل نخواستہ اس کا پیغام منور کو دینا پڑا لیکن اس سے پہلے میں نے اسے کہہ دیا کہ میں نیچے گلی میں اس کا منتظر ہوں۔

ایک مرتبہ پھر اپنے چوکھٹے کا شیشے کے سامنے کھڑے ہو کر میں نے تنقیدی جائزہ لیا اور کنگھی کی روز بس میں خریدی۔ دو روپے والی عطر کی شیشی قریباً آدھی اپنے اوپر انڈیل کر نیچے گلی میں آ گیا۔

محلے سے باہر تک ہم اسی طرح ایک دوسرے کا تعاقب کرتے آئے تھے جیسے دونوں ایشیائی بلیاں بازار میں پہنچ کر جب تحفظ کا احساس ہوا تو نزدیک آ گئے۔ ہم نے راستے میں مشکل دو تین فقروں کا تبادلہ کیا تھا۔

میں اس کے کالج کے بس سٹاپ پر ہی اتر گیا اور اسے کالج پہنچانے کے بعد اپنے دفتر گیا دفتر میں کام تو کیا خاک کرتا بس شمع ہی سارا دن خیالوں پر چھائی رہی۔ میرے والد کی سابقہ ایمانداری خدمات کے پیش نظر مجھے افسر اعلیٰ نے حساس قسم کی سیٹ پر بٹھایا تھا۔ جہاں پبلک ڈیلنگ کچھ زیادہ ہی رہتی تھی۔ میں نے "بخشش" یا "انعام" پکڑنے میں کبھی بخل کا مظاہرہ نہیں کیا تھا۔ لیکن یہ بات ہمیشہ مدنظر رہی کہ کامیابی کا راز خرگوش کی طرح قلابچیں بھرنے میں نہیں۔ کچھوے کی طرح رینگ رینگ کر چلنے میں ہے۔ میں صرف خاص لوگوں سے انعام قبول کرتا وہ بھی اتنی احتیاط سے کہ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہونے پاتی۔ دوسرے ساتھی مجھے اس لئے نظر انداز کر دیتے کہ میں بہر حال "مولوی صاحب" کا بیٹا تھا جن کی ایمانداری کی دھوم سارے دفتر میں مچی تھی۔

اس روز پہلی مرتبہ میں نے بجائے ڈرنے کے ذرا کھلے دل سے انعامات اور بخششیں وصول کیں۔ خود کسی سے تقاضہ نہ کیا البتہ کسی کو مایوس بھی نہ ہونے دیا۔ چھٹی تک میری جیب میں قریباً ستر اسی روپے اکٹھے ہو چکے تھے جو میرے لئے فاروں کے خزانے سے کم نہ تھے۔ شام کو جب میں گھر پہنچا تو میری جیب میں اس کے لئے ایک خوبصورت اور قیمتی انگوٹھی موجود تھی۔

رات کو میں نے میدان صاف پا کر کاغذ کے ایک محبت نامے میں وہ انگوٹھی لپیٹ کر اس کی طرف اچھال دی۔ شمع نے فوراً دونوں چیزیں اٹھا کر مٹھی میں چھپا لیں اور وہاں سے چلی گئی۔ شاید

جو اب کہ اپنے "شکار" کے پہلے نذرانے کا جائزہ لینا چاہتی تھی۔ واپسی پر اس کے انگ انگ سے مسرت پھوٹ رہی تھی۔ اس نے وہ جگمگاتی انگوٹھی اپنی انگلی میں سجا رکھی تھی۔ اسے چومتے ہوئے [illegible] جھک کر ادائے دلربانہ سے میرا شکریہ ادا کیا اور واپس چلی گئی۔

پھر تو جیسے یہ میرا معمول بن گیا۔ تحفے دینے سے لب لعین کی مسکراہٹ چرانے تک کے مراحل [illegible] ہم نے بڑی تیز رفتاری سے طے کر لئے۔ محتاط میں دفتر میں ہیرا پھیری کرتے وقت بھی اتنا ہی ہوا کرتا تھا جتنا اس سے ملتے وقت۔ میری بہن اس کی سہیلی تھی لیکن بشیراں کی طرح اسے بھی ہماری خاموش محبت کا علم نہیں تھا۔ بشیراں نے البتہ ہتھیار نہیں ڈالے تھے۔ اس نے ہارنا شاید سیکھا ہی نہیں تھا۔ شمع کا ہمارے وہاں آنا جانا اسے کھٹکا ضرور ہو گا لیکن میری مسلسل بے نیازی کی شاندار ایکٹنگ نے اسے کبھی شک نہ ہونے دیا۔

ابتدائے آفرینش سے انسان کی گھٹی میں جو قبائلی نظام زندگی سمایا ہوا ہے وہ جدید تہذیب کی چمک دمک کے سامنے کسی حد تک ماند تو پڑ گیا ہے۔ لیکن حکومت کی خواہش سے شاید کبھی انسان کو چھٹکارا نصیب نہ ہو سکے گا۔ محمد یار کے نزدیک بھی ہمارا محلہ اس کی ذیلی ریاست تھی اور اس کے لڑکے کو سربراہ مملکت ہونے کے ناطے اپنے مکانوں میں رہنے والے کرایہ داروں پر مکمل حق حاصل تھا۔ اپنے مکانات میں بسنے والی تمام مخلوق کو اس کے مادی وسائل سمیت وہ اپنی جاگیر جانتے تھے اور یہ حقوق ملکیت "بلا شرکت غیرے" قسم کے تھے۔ میں چونکہ "پہلے آنے پہلے پائے" کا قائل تھا۔ اس لئے یہ بات فراموش کر گیا کہ شمع اور اس کے گھر والے محمد یار کے کرایہ دار ہیں پھر میرے خیال میں ہم رازداری ہی اتنی زیادہ برت رہے تھے کہ کسی کے شک کرنے کے امکانات صفر کے برابر رہ جاتے تھے۔

ہمارے محلے کی سیاسی اور سماجی قریباً سبھی قسم کی سرگرمیوں کا سب سے بڑا مرکز حمیدے نائی کی دکان تھی جس کے باہر لگے تھڑے پر محلے کے لڑکے سارا دن چرس پیتے رہتے اور اندر محلے کی اندرونی اور بیرونی سیاست پر تازہ ترین تبصرے کئے جاتے۔ وہ شاید ہمارے محلے کا سب سے زیادہ باخبر آدمی تھا جس کو فلاں کی لڑکی کے فلاں کے لڑکے سے معاشقے سے لے کر اس بات کا علم ہوتا تھا کہ

Scanned with CamScanner

مستقبل میں ان کا عشق کیا رنگ لانے والا ہے۔ حمیدہ نائی بڑا زمانہ شناس آدمی تھا جس کا ثبوت اس کی دکان کے ایک کونے میں حالات کے مطابق بدلتی رہنے والی لیڈروں کی تصاویر سے بخوبی لگایا جا سکتا تھا۔

اس روز جب میں صبح صبح شیو کروانے اس کی دکان پہ گیا تو وہاں محمد یار کانڑ کا تھیلا بھی موجود تھا۔

"واہ جی مولوی صاحب! مجھے والد صاحب کی نسبت سے محلے میں مولوی صاحب ہی کہتے تھے) بڑا لمبا ہاتھ مارا ہے۔" حمیدے نائی نے استرا میرے گالوں پہ چلاتے ہوئے کہا۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے اس نے میری شاہ رگ کاٹ دی ہو۔

"کیا مطلب؟" میں نے سب کچھ سمجھتے بوجھتے ہوئے حواس باختہ لہجے میں کہا۔

"مطلب تو بچو تجھے ابھی بتا دیتا۔ ذرا مولوی جی سے بات کر لوں"۔ بجائے حمیدے کے چھدو نے جواب دیا۔

"میرے منہ لگنے کی کوشش نہ کرو..." میں تولیہ ایک طرف پھینکتے ہوئے پھنکارا۔

"بہن کی آڑھ میں عاشقی کر رہا ہے سالا بڑا آیا مولوی کا بیٹا۔" دو تو پہلے ہی تیاری کر کے آ

"تمہاری ایسی کی تیسی" میرا خون کھول اٹھا۔

ہم آپس میں بھڑ گئے۔ اکیلا چھدو بے چارہ میرا کیا بگاڑتا۔ چرس نوشی نے اس کی ہڈیوں کا گودا بھی جلا دیا تھا۔

"چھوڑو دھرمی جانے دو۔ اوئے تو بھی بس کر اوئے مولوی۔" حمیدے نے ہمارے درمیان آتے ہوئے کہا۔ محلے کے دو تین اور بزرگ وہاں گھس آئے اور ہمیں علیحدہ کر دیا۔

یہاں تو خیر بیت رہی لیکن حمیدے نائی کے سیاسی ہیڈ کوارٹر سے جو اعلان چھدو نے نشر کر دیا تھا اس سے محلے کے در و بام گونجنے لگے۔

شام کی نماز سے فارغ ہو کر والد گھر آئے تو مجھے لے کر بیٹھ گئے۔

"بیٹا ہمارے پاس نیک نامی کے علاوہ اور ہے ہی کیا؟ ۔ میری ساری زندگی کی یہی تو کمائی

ہے سیانو تم اسے ہی مٹا دینے پہ تلے ہو"۔!!

"ابا جی اپنے پاس رکھیے اپنی نیک نامی میں کسی سے دبنے والا نہیں۔ میری طرف سے چھدو چھوڑ اس کا باپ بھی آ جائے۔ اگر کوئی میرے منہ لگا تو اس کا منہ توڑ دوں گا۔" میں گلہ پھاڑ کر چلایا۔ کیونکہ سامنے دیوار پہ لٹکتی چق پہ میں نے شمع کی لرزتی پرچھائیاں دیکھ لی تھیں اور اپنی محبوبہ کے سامنے شکست تسلیم کرنا میرے مردانگی کی توہین تھی۔

"تم ہی سمجھاؤ اسے عقل دو اس کو میری چٹی ڈاڑھی میں مٹی نہ ڈالے۔" والد نے ہمیشہ کی طرح معاملہ زماں پہ چھوڑ دیا اور خود پیر پٹکتے باہر نکل گئے۔

ماں آخر ماں ہے۔ بے چاری میرے آگے ہاتھ باندھنے لگی۔ "بیٹا ان کے منہ نہ لگ۔ بڑے ظالم ہیں بیٹا۔ ہم بے چارے تو کوئی حیثیت ہی نہیں رکھتے ان کے سامنے"۔!

اماں ہوئی تو بشیراں بھی کسی کام سے اوپر آ گئی۔ وہ کچھ الجھی الجھی اور غمزدہ سی دکھائی دے رہی تھی۔ بالکل یوں جیسے کسی نے اس سے کچھ چھین لیا ہو۔

"ایک بات پوچھوں وسیم" اس نے دروازے کے پٹ کا سہارا لیتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں ہاں ضرور پوچھو۔ ایک تمہاری ہی کسر تو رہ گئی تھی"۔ میں نے تلملا کر جواب دیا۔

"تم تو خواہ مخواہ غصہ کر جاتے ہو۔ میں نے کیا بگاڑا ہے تمہارا جو تمہیں میری بات بھی بری لگنے لگی"۔ اس نے قریباً روہانسی ہوتے ہوئے کہا۔

جانے کیوں مجھے اس روز اس سانولی سی کمزور لڑکی پہ ترس آ گیا۔ "اچھا بابا پوچھو"؟

"یہ جو بات خلیے میں پھیلی ہوئی ہے کیا سچ ہے؟" اس نے لرزتی ہوئی آواز میں پوچھا۔

"محلے میں تو روزانہ نئی بات سننے کو ملتی ہے۔ وہ کیا ساری باتیں سچی ہوتی ہیں"؟ میں نے کہا۔

"یہ تو ٹھیک ہے لیکن پھر بھی تمہاری زبان سے..." اس نے امید بھری نظریں مجھ پہ جمائیں۔

"یا اللہ تو ہی ان لوگوں کو سمجھا" جانے کیوں اس لمحے میں اس کے سامنے جھوٹ نہ بول سکا اور گول مول سی بات کر دی۔

SCAN PDF WAQAR

"کیا ہوا بیٹا۔ کون ہے" دوسرے کمرے سے ماں جی کی آواز سنائی دی۔ انہوں نے ابھی ابھی سلام پھیرا تھا۔

"میں ہوں خالہ۔ ہلدی کو پوچھ رہی تھی" نسرین کی آواز کی چلبلاہٹ لوٹ آئی۔

صبح جب میں کام پر جانے کے لئے گھر سے نکلا تو میرے اور شمع کے تعاقب میں چھ دو اور لڑکے بھی آ رہے تھے۔ اس بات کو شمع نے مجھ سے پہلے محسوس کر لیا تھا۔ وہ محلے کی "سیانی" لڑکی تھی اور جس ماحول میں پرورش پا رہی تھی وہاں تو مزا ہی ایسے کھیل میں آیا کرتا تھا۔ ہم دونوں ایک ہی بس میں جایا کرتے تھے۔ بچپا بس اس کے کالج سے گزر کر میرے دفتر جاتی تھی۔ ہم دونوں نے ہی ان کی طرف دیکھنا گوارا نہ کیا۔ وہ بھی ہمارے ساتھ ہی بس میں سوار ہو گئے۔ لیکن اترتے وقت کمال ہشیاری سے شمع نے میری طرف یہ پیغام اچھال دیا کہ میں گیارہ بجے اس سے یہیں ملوں۔ مجھے فرتکسے پہنچا کر وہ دونوں دفع ہو گئے۔

گیارہ بجنے ہی میں نہیں آ رہے تھے۔ خدا خدا کر کے ملاپ کی گھڑی آئی۔ کالج کے دروازے سے ہی میں نے اسے برآمد ہوتے دیکھ لیا تھا۔ وہ سنبھل کر اور محتاط انداز میں چاروں اطراف کا جائزہ لیتی ہوئی اس طرف آ رہی تھی۔

ہم دونوں ایک رکشہ میں بیٹھ کر اپنے مخصوص ہوٹل پہنچ گئے۔ یہاں اس سے پہلے بھی ہم کئی مرتبہ آ چکے تھے۔

"وسیم۔ ساری دنیا ایک طرف ہو جائے تو بھی کوئی ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ تم دل نہ چھوٹا کرنا میں تمہاری خاطر سارے زمانے سے ٹکرا سکتی ہوں"۔ اس کی آواز میں بے پناہ اعتماد تھا۔

اس دن کے بعد سے ہمارا چھپ چھپ کر ملنا کچھ زیادہ سے بڑھ گیا۔ اس کے ساتھ ساتھ تحائف کی رفتار میں بھی اضافہ ہونے لگا۔ اصل میں شمع کے جوہر اب کھلنے لگے تھے اور اس کے گھرانے نے بھی اپنے قدم مضبوط کرنے کے بعد اپنی اصلیت دکھانی شروع کی تھی۔ محلے کے امیر لڑکوں کی آمد و رفت وہاں لگی رہتی تھی۔ کوئی کسی کا بھائی بنا تھا کوئی کسی کی بہن اور کسی نے اس کی ماں کو خالہ بنا رکھا تھا۔ ان آنے جانے والوں

میں چچا بھی شامل تھا اور اس کی آمد و رفت کا مطلب کسی سے بھی پوشیدہ نہیں تھا۔

شمع کے چھوٹے بھائی کی سالگرہ ہوئی تو محلے بھر کے "بھائی جانوں" نے اسے تحائف سے لاد دیا پھر کسی نہ کسی روز کسی نہ کسی بہانے ان کے ہاں کچھ نہ کچھ ہنگامہ معمول سا بن گیا۔

چھ دو کے غنڈے اس دوران میں تین چار مرتبہ مجھ سے ٹکرا چکے تھے۔ ہمارا یہ ٹاکرا محلے سے باہر ہی ہوا کرتا تھا۔ میں چونکہ سچا عاشق تھا اور سچے عاشق دلیر بھی ہوتے ہیں۔ اس لئے کبھی کسی بات سے نہ گھبرایا۔ جہاں ان کا بس چلا انہوں نے کھل کر دل کے ارمان نکالے اور جہاں کوئی اکیلے دکیلے میرے قابو آ گیا میں نے سب کا حساب چکا لیا۔ ہمارے درمیان ایک قسم کا یہ ملزمانہ معاہدہ طے پا گیا کہ ہم نے محلے کو کبھی کارزار نہ بنایا۔ یہ الگ بات کہ حمیدے نائی کو بہرحال ان سب باتوں کی خبر رہتی تھی۔

ایک روز جب میں حال ترشوانے اس کے پاس بیٹھا تھا اور اتفاق سے وہاں اور کوئی تھا بھی نہیں تو اس نے مجھے بڑی رازداری سے کہا "مولوی بچو تیرے ساتھ جو کھیل ہو رہا ہے نا اس کا علم تجھے تب ہوگا جب چھرے چل جائیں گے۔ اب بھی موقعہ ہے بچو سنبھل جا بندہ بن جا یہ زنانہ قینچی بیلی یا میرا کچھ والا نہیں۔ یہ سارا ڈرامہ وہ اپنی ماں کے اشارے پہ کر رہی ہے۔ جیسے تیسے طرح اسے ہدایت ملتی ہے اسی طرح وہ عمل پیرا ہوتی ہے تو شریف اور ایماندار گھرانے کا بچہ ہے جس دن دفع ہو گئی کوئی سیرا کھیری پکڑی گئی اس روز اپنے گھرانے کے کسی فرد کی چھٹی سمجھ لینا۔ یہ اڑتی چڑیاں ہیں بچو ان کو دور ہی سے دیکھ کر خوش ہوا جاتے ہیں۔ قریب جا کر پکڑنے کی حماقت کبھی نہ کرنا"۔

اس وقت تو یہی بات سچ ہے میرا جی بھی یہی چاہتا تھا کہ حمیدے نائی کا منہ نوچ لوں جو ایسی پاکباز عورتوں پر الزام تراشی کر رہا تھا۔ ممکن ہے میں ایسا کر بھی گزرتا لیکن یہ سوچ کر کہ یہ تو اس کی فطرت ہے میں چپکا ہو رہا اور اس سے کچھ کہے سنے بغیر واپس آ گیا۔

شمع نے واقعی جو کہا کر دکھایا آٹھویں دسویں روز وہ خود پہ ٹوٹنے والے ظلم و ستم کی نئی کہانی سنا کر مجھ سے کوئی سوٹ یا اور چیز اینٹھ لیتی۔ جس شدت سے اس کے ساتھ میری محبت میں اضافہ ہو رہا تھا اسی تیز رفتاری سے میری دفتر میں بدعنوانیاں بھی بڑھتی جا رہی تھیں۔ پھر ایک روز وہ بھی

Scan by PDF WAQAR

آیا جب لوگوں نے کہنا شروع کر دیا کہ یہ تو باپ کے بالکل ہی الٹ نکلا۔ مجھے ان باتوں کی پرواہ نہیں تھی ہی کب؛ مجھے تو اس بات کی بھی پرواہ نہیں تھی کہ گھر میں کوئی مجھے جنتی جوان بہن بیٹی ہے جس کے ہاتھ پیلے کرنے کی فکر میں ماں باپ گھلے جا رہے ہیں۔ والد صاحب کے جمع شدہ فنڈز نہ اگر ہوتے تو میرے کالج کے اخراجات کیسے پورے ہوتے۔ جب بھی سویا ہوا ضمیر انگڑائی لیتا میں اسے انہی فنڈز کا لالچ دیتا رہتا کہ تمہیں تو ان پیسوں سے محل خریدنے تھے۔ یہ سارا پیسہ بہن کے ہاتھ پیلے کرنے ہی کے لئے تو تھا۔

ایک روز جب میں اور شمع ایک ریستوران سے برآمد ہوئے۔ ہم تھے تو محلے کے ایک "بزرگ" کی نظر ہم پر پڑ گئی۔ یہ بزرگ میرے والد سے کچھ فروعی اختلافات رکھنے کی وجہ سے ہم پر کچھ زیادہ ہی مہربان رہتے تھے اور کبھی کوئی موقعہ ہمیں نیچا دکھانے کا ہاتھ سے نہ جانے دیتے۔

انہوں نے حمیدے نائی کے حمام پر بات پہنچائی کہ اپنا بوجھ ہلکا کیا اور حمیدے نے حسب توفیق اسے تبرک کی طرح محلے کے باقی لوگوں کے منہ میں ڈال دیا۔ چھدو نے خالہ (شمع کی والدہ) کے گھر تحائف کے ڈھیر لگا دیئے تھے اور خالہ نے اسے "بیٹا" بنا لیا تھا اس لئے اسے کچھ زیادہ ہی تکلیف ہوئی۔ نظری بات تھی۔ اگلے روز وہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ ایک کرائے کی ٹیکسی میں ہمارا تعاقب کرتا رہا۔ ان لوگوں نے کسی کارنامے کی امید پر ہمارا پیچھا نہ چھوڑا اور حسب پروگرام جب شمع اپنے کالج سے اور میں اپنے دفتر سے بہانہ کرنے کے بعد ایک ٹھکانے پر ملنے لگے تو وہ ہماری جان کو آ گئے۔

اس روز میری طبیعت کچھ خراب تھی۔ تین چار روز سے مسلسل بخار آ رہا تھا اور میں بجائے آرام کرنے کے اس "راحت جان" کے کالج کے طواف کرنے میں اپنی توانائیاں ضائع کر رہا تھا۔

"حرامی! محلے کی دو بہن کے ساتھ گلچھرے اڑاتے تجھے شرم نہیں آتی۔" چھدو نے مجھے للکارا۔ اور اس کے مددگار ہوتے کے مجھ پر پل پڑے۔ انہوں نے وہاں موجود لوگوں کی ہمدردیاں بھی اس "کارِ خیر" میں شرکت کے لئے حاصل کر لیں اور لوگوں کی "بلا شیری" پر کچھ زیادہ ہی ہاتھ چلانے لگے۔ پھر وہ مجھے آدھ موا کر کے وہیں پھینک گئے۔ خیریت یہ گزری کہ تھانے کی یاترا سے بچ گیا۔ اس سارے واقعے

کا دلچسپ پہلو یہ تھا کہ شمع وہاں سے یوں غائب ہوئی جیسے گدھے کے سر سے سینگ۔

میں شرم سے پانی پانی اور زخموں سے چور اٹھا، ایک رکشہ کے ذریعے گرتا پڑتا گھر جا پہنچا۔ گھر والے کسی کام سے گئے تھے۔ بشیراں نے مجھے اس حال میں دیکھا تو بے قرار ہو کر اوپر چلی آئی۔ میرا سارا جسم درد سے چیخ رہا تھا اور تن بدن کا ہوش نہیں تھا ماں کے آنے تک وہ میری خدمت میں مصروف رہی۔ اس نے میرے دکھ کو اپنی جان کا روگ بنا لیا۔

میں نے اسے تو یہی بتایا تھا کہ راستے میں غنڈوں سے جھگڑا ہو گیا، لیکن بات حمیدے نائی کے بیٹے کوارٹر میں پہنچ چکی تھی اور محلے کی تین چار عورتیں بھی اس واقعہ کی تحقیق فرمانے کے لئے ہمارے گھر آ چکی تھیں۔ ان کی "عین الیقین" گواہیاں جنگل کی آگ کی طرح محلے کے گھر گھر میں پھیل گئیں اور لوگ مولوی صاحب کے نافرمان اور نالائق بیٹے کو لعن طعن کرنے لگے جبکہ چھدو محلے کا ہیرو بن گیا کیونکہ اس نے کمال دانائی سے کام لے کر محلے کی عزت بچا لی تھی۔

وہ رات بشیراں نے تمام حیا و حجاب بالائے طاق رکھ کر میرے سرہانے بسر کر دی۔ وہ شاید محلے کی واحد ہستی تھی جس نے میرے بیان کی حمایت کی تھی کہ یہ سب کچھ چھدو کی چال ہے۔ وہ مجھے بدنام کرنا چاہتا ہے۔ اس روز والد نے پہلی مرتبہ دل میں درد کی شکایت کی اور ان پر معمولی سا دورہ بھی پڑا۔ بشیراں کی دیوانہ وار چاہت اور گھر والوں کی حالت زار دیکھ کر میرے ذہن میں یہ بات مزید آئی کہ شمع آخر میرے ساتھ کیوں نہ کھڑی ہوئی وہ کیوں مجھے اکیلا چھوڑ کر بھاگ آئی؟ صبح کھڑکی کے راستے شمع کا رقعہ مل گیا لکھا تھا:

"مجھے بے وفا نہ سمجھنا۔ اگر میں وہاں رہ جاتی تو شاید ہم زندگی بھر دوبارہ نہ مل پاتے۔ میں نے اپنی ماں سے یہی کہا ہے کہ میں تمہارے ساتھ تھی ہی نہیں اور وہاں سے بھاگ کر کالج واپس آ گئی تھی۔ آخری پیریڈ میں میری" پیا کسی" اس بات کا ثبوت موجود ہے کہ میں کالج سے باہر گئی ہی نہیں تم بھی اسی بات پر قائم رہنا۔ میں تمہاری ہوں اور قیامت تک تمہاری رہوں گی۔"

Scan by PDF WAQAR

شمع کا خط پڑھ کر میں خود کو کوسنے لگا کہ کیوں میں نے اپنی معصوم محبت پر شک کیا؟ اس نے کس طرح کمال ہشیاری سے مجھے بدنامی سے بچا لیا تھا۔ اس واقعہ نے میرے دل میں اس کے لئے محبت کے ساتھ عقیدت بھی پیدا کر دی اور میرا سر اور کچھ زیادہ ہی بلند ہو گیا۔ میری توقعات کے مطابق اگلے ہر محلہ کے گھر جھانک بی۔ بزرگ نے گواہی گزاری اور بتایا کہ بچشم خود اس نے مجھے اور شمع کو ایک ساتھ دیکھا ہاتھ ڈالے گھومتے دیکھا ہے۔ پھر چھیدو اور اس کے چمچے بھگتے۔ کسی سیانے نے وہاں شمع کا ذکر چھیڑ دیا۔ گواہی مانگی۔ جب میں نے بدتمیزی کرتے ہوئے اپنی صفائی میں کچھ کہنا چاہا تو مجھے دھکے دے کر باہر نکال دیا گیا اور محلے کے معززین نے فیصلہ دیا کہ مولوی صاحب کی سابقہ شرافت کے پیش نظر اغوا کا تو وہ خاطر خواہ کوشش رہتے ہیں۔ لیکن آئندہ اگر ان کے لونڈے نے محلے کی شرافت پر کیچڑ اچھالنے کی کوشش کی تو سخت قدم اٹھائیں گے۔

والدہ صاحب سر جھکائے گھر آ گئے۔ انہوں نے قریباً روہانسے ہو کر کہا "مولا مجھے تین بچیاں تو تو نے دی ہی تھیں۔ چوتھی بھی لڑکی ہی دے دیتا تو یہ دن نہ دیکھنا پڑتا" وقتی طور پر تو ان کی آواز نے مجھے رُلا دیا۔ واقعی میں نے ان کی مٹی پلید کرنے میں کوئی کسر باقی نہیں چھوڑی تھی۔ میں نے ان سے سابقہ سلوک پر معافی مانگی تو بیچارے کسی حد تک مطمئن ہو کر بیٹھ رہے۔

قریباً دس پندرہ دن تک شمع میرے سامنے نہ آئی۔ کھڑکی کے سامنے پڑی چوبی جیسے سنگلاخ دیوار بن کر رہ گئی۔ ان کے گھر پر ایک پُراسرار سناٹا چھایا رہتا۔ یوں لگتا جیسے ابھی ابھی یہاں کوئی جنازہ اٹھا ہو۔ پھر ایک روز اس کا ٹیلی فون میرے دفتر میں آ گیا "خدا کے لئے مجھے شیراز ریسٹورنٹ میں ملو۔ ابھی۔ اسی وقت میں بڑی مشکل سے بھاگ کر آئی ہوں" فون کریڈل پر رکھتے ہی میں اس سے ملنے کے لئے بھاگ اٹھا۔

شیراز ریسٹورنٹ میں وہ میری منتظر تھی۔ ایک آہ بھی اس کے ساتھ تھی جس کے ساتھ جانے کا بہانہ کر کے وہ "ظالم سماج" کے چنگل سے بمشکل نکل کر مجھ تک پہنچی تھی۔

"وسیم میں تم سے کچھ نہیں چھپاؤں گی۔ تمہیں سب کچھ سچ سچ بتا دوں گی۔ میرے ماں باپ بہت

لالچی ہیں۔ بہت لالچی۔ اگلے ہفتے باجی کی شادی ہے۔ خدا کے لئے کسی نہ کسی طرح باجی کو دینے کے لئے رقم کا بندوبست کر لو تاکہ تم میری لالچی ماں کی بددعائیں حاصل کر سکو۔ باقی بات میں خود کر لوں گی۔ وسیم! میری نیت پر شک نہ کرنا اگر تم چاہو تو ہم بھاگ کر ابھی شادی کر لیں لیکن زمانے سے بہت زیادہ بہتر سمجھتے ہو۔ تم جس طرح کہو تمہاری شمع تیار ہے" اس نے سسکیاں بھرتے ہوئے اپنا سر اپنی ہتھیلیوں کی موجودگی سے بے نیاز ہو کر میرے بازو پر رکھ دیا۔

"حوصلہ کرو شمع کیا ہوا۔ تمہارے پیار کی خاطر یہ بھی سہی" میں نے اسے تسلی دی مشکل اس کے آنسو تھمے۔

"بھائی جان اس چھیدو کے بچے نے پہلے ہی ایک تیلی دشمن خالہ کے پاس پہنچا دیا ہے اور ساتھ ہی وہ شمع کا رشتہ بھی مانگنے والا ہے" جلتی پر تیل کا کام اس کی سہیلی نے کیا۔ میرا جی چاہا اٹھ جاؤں اور اس بدمعاش کو گولی مار دوں۔ لیکن شمع نے ہاتھ باندھ کر مجھے کوئی جذباتی قدم اٹھانے سے باز رکھا۔

"شمع ہو گی تو وسیم کی ورنہ کسی کی نہیں رہے گی" جانتے جانتے اس نے بڑے ڈرامائی انداز میں کہا۔

گھر پہنچ کر میرے ذہن پر صرف ایک ہی چیز سوار تھی کہ میں نے سات آٹھ ہزار روپے کا بندوبست کرنا ہے تاکہ اس کی لالچی ماں کے منہ میں سونے کا نوالہ دے سکوں۔ میری راتوں کی نیند اور دن کا چین حرام ہو گئے۔ میں ہر قیمت پر کامیابی چاہتا تھا۔ ابھی اتنا بے غیرت نہیں بنا تھا کہ بہن کے لئے بنانے کے زیور بیچ ڈالوں۔ صرف ایک ہی راستہ تھا اور وہ تھا "دو نمبر" کے بجائے آٹھ دس ہزار کا لمبا ہاتھ مارنے کا۔!

پھر وہ موقع بھی بدقسمتی سے ہاتھ آ گیا۔ میں نے تمام احتیاطیں بالائے طاق رکھیں اور ہاتھ دکھا دیا۔ دس ہزار کی رقم معمولی نہیں ہوتی۔ نوٹ جیب میں رکھ کر میں سیدھا اس کی ماں تک جا پہنچا۔

خراٹے عورت نے کھڑکی کی جھری میں سے دیکھا تو دونوں باہیں پھیلا کر مجھے اپنے شرافت اور انسانیت سے اٹا کھٹ سینے سے چمٹا لیا۔

Scanned with CamScanner

"میرا بیٹا! میرا بیٹا" اس کے منہ پہ ایک ہی لفظ تھا اور میں حیرانگی سے اس کی شکل دیکھے جا رہا تھا کہ اس عورت کے کہنے پر گراں کو سرکس نے کیا بھیر شمع کا جگمگاتا چہرہ دکھائی دیا تو بات سمجھ آگئی۔ میں نے سوچا آٹھ ہزار میں کسی کو گوہر مقصود مل جائے تو اور کیا لینا ہے۔ اس نے زندگی سے۔

شمع نے بتایا کہ جیسے ہی وہ بی اے پاس کرے گی میری شادی اس سے ہو جائے گی۔ اپنی ماں کو خودکشی کی دھمکی دے کر منا لیا ہے اور فی الحال مجھے مشتے کی بات کرنے سے منع کر دیا ہے کہ کسی مناسب موقع کی وہ منتظر تھی۔

اس سارے ڈرامے کو جس خوبصورتی سے ان ماں بیٹی نے بھایا وہ کچھ انہی کا کام ہے۔ میں نے بجائے فریج کے آٹھ ہزار نقد اس کی ماں کو پیش کر دیا جو اس نے بڑی متانت کر دانے کے بعد مجھ سے وصول کیا اور اس کے ساتھ ہی مجھے "منہ بولا بیٹا" بنا لیا۔

جب میں اندھا دھند اپنی حرامکاریوں میں مصروف تھا تو میرے ساتھ والے اس لئے خاموش رہتے تھے کہ میری آڑ میں وہ بھی شکار کھیل رہے تھے۔ ہم پر چیز سیکشن میں کام کرتے تھے۔ میں اگر سیلز کی بے ایمانی کرتا تو وہ کمال ہشیاری سے پانچ چھ سو یا سات سو تک پہنچا دی جاتی۔ سو دن چور کا ایک دن ساہوکار کا۔ بالآخر وہ روز بد بھی آگیا جب میرے بنائے ہوئے بوگس واؤچر پکڑے گئے اور افسر بجاز نے بغیر کسی حیل و حجت کے کیس پولیس کے سپرد کر دیا جہاں اس انکشاف نے مجھ پہ بجلی گرا دی کہ میں اب تک ڈیڑھ لاکھ روپے کا غبن کر چکا ہوں۔

گھر یہ خبر پہنچی تو کہرام مچ گیا۔ والد پر دل کا شدید دورہ پڑا۔ مشکل جانبر ہوئے۔ تھانے پولیس شمع کا والد مجھ سے ملنے آیا۔ وہ لوگ تو ان معاملات کے ماہر تھے۔ اس نے مجھے کہا کہ فی الحال میں پولیس کے کہنے کے مطابق بیان دے دوں۔ ریمانڈ ختم ہوتے ہی وہ میری ضمانت کروا لے گا اور ایک چھوٹی سی نوکری میرے لئے تیار ہے۔ صدمے اور خوف کی شدت سے میں حواس باختہ ہو رہا تھا مجھے پولیس کی کارروائیوں اور چالاکیوں کا کیا علم؟ بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ شمع کا والد پولیس کا ٹاؤٹ تھا۔

میں وہی کچھ کرتا رہا جو کچھ وہ مجھے کہتا رہا۔ ریمانڈ کے خاتمے پہ مجھے جیل بھیج دیا گیا۔ تھانے میں شمع کے والد نے والدہ سے میری ملاقات بھی کروا دی اور انہیں ہر طرح تعاون کا یقین بھی دلا دیا۔ جو وکیل ریمانڈ پر میں بیل تو آگیا لیکن ضمانت کبھی نہ ہو سکی۔ والد تو اس صدمے سے مستقل چارپائی سے لگ گئے دل کا عارضہ ان کے نحیف وجود کو کھانے لگا۔

میرا مقدمہ تین ماہ تک چلا۔ اس دوران ہر تاریخ پہ باقاعدگی سے شمع کا باپ مجھے ملنے آتا رہا۔ اسے شک تھا کہیں میں بدک نہ جاؤں اور آٹھ ہزار روپے کا ذکر نہ کر دوں۔ والد صاحب میں اتنی سکت رہ ہی نہیں گئی تھی کہ وہ مجھے ملنے آتے یا شاید اب وہ اپنے نالائق بیٹے کا منہ ہی دیکھنا نہیں چاہتے تھے۔ ماں نے وکیل بھی شمع کے باپ کی مرضی سے کیا اور میرے "نہ" کرنے کے باوجود جج پر بھی میرے مقدمے کی تذکرہ کر دی۔ ماں اس دوران ایک سستی سی نوکری جس نے مجھے فراموش نہ کیا اور وہ تھی بشیراں۔

وہ ہر تاریخ پہ زبردستی ماں کے ساتھ آتی۔ میرے لئے کھانا بنا کر لاتی اور حوصلہ قائم رکھنے کی تلقین کرتی۔ تین ماہ بعد پولیس نے مجھ سے اقبال جرم کروا لیا اور بجائے مجھے بری کروانے کے پانچ سال قید کی سزا دلوا دی۔ والد صاحب نے تو جیسے ہی یہ سنا اپنی جان جان آفریں کو سونپ کر خلاصی کروا لی۔

چار سال میں جیل کے جہنم میں جلتا رہا۔ کسی نے دوبارہ پلٹ کر خبر نہ لی۔ صرف ایک دفعہ حمیدا نائی آیا۔ "بچو ہم نہ کہتے تھے یہ ازلی چڑیاں ہیں ان کو دور ہی سے دیکھا کرو"!

"ہاں چاچا تم ٹھیک کہتے تھے" میں نے ہتھیار پھینک دیئے۔

"اب پڑ گئی ہے تو مرد بن کر جھیلو" مجھے تسلیاں دے کر وہ بھی چلا گیا۔ چار سال تک ماں نے سرف والد کی پنشن پہ اپنا اور میری بہن کے جسم و جاں کا رشتہ باقی رکھا۔ محلے والوں نے محلے کے بچوں کو ٹیوشن پڑھا کر کپڑے سی کر کسی نہ کسی طور یہ چار سال پورے کئے۔

جیل میں بہتر کارکردگی کے مظاہرے پر مجھے سال کی معافی مل گئی۔ میں پرسوں رہا ہو جاؤں گا تو دو بچوں کی ماں بن کر کراچی کی ایک ماڈرن آبادی کے فلیٹ میں گلچھرے اڑا رہی ہے۔ بشیراں

SCANNED BY CamScanner

کی شادی گوجرانوالہ میں اس کے رشتے داروں کے ہاں پچھلے سال ہو چکی ہے۔ اس نے تین سال تک میرا انتظار کیا لیکن عورت بے بس ہوتی ہے بالآخر ماں باپ کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے۔

جب والد زندہ تھے تو کبھی ان کی پروا نہ کی۔ سوچتا ہوں اب ان کی قبر پر کیا منہ لے کر جاؤں گا۔ زندگی تو میرے لئے کبھی کی شام غریباں بن چکی ہے۔ زندہ رہنے کے لئے خود سے کیا کچھ نہیں کروں اور کیسے؟ یہ سوال مجھے پچھلے چار سال سے ڈس رہا ہے۔ خنداق شکاری کتوں کی طرح میرے تعاقب میں کر رہے ہیں اور میں خوفزدہ خرگوش کی طرح بھاگ رہا ہوں۔

بے نام سی عقیدت

میں عمر کے اس حصے میں پہنچ چکا ہوں، جہاں انسان کو واقعی خدا یاد آجاتا ہے اور اس کے ساتھ ہی اپنے وہ گناہ بھی جو کبھی اس نے بڑے فخریہ انداز میں کئے تھے۔ میری عمر ستر سال کے قریب تو ہوگی جن میں سے جوانی کے کم از کم بیس سال جیلوں کی بھینٹ چڑھ چکے ہیں ایک وہ دور تھا۔ جب بڑے بڑے بدمعاش میرا نام سن کر سہم جایا کرتے تھے۔ ممکن ہے آج لوگ اس بات پر یقین نہ کریں لیکن یہ حقیقت ہے کہ میری غیر موجودگی میں پولیس کو کبھی میرے علاقے میں گھسنے کی جرأت نہیں ہوتی تھی۔

آپ کہتے ہوں گے یہ بوڑھا سٹھیا گیا ہے اور کیسی غلط باتیں کرتا ہے۔ لیکن وہ لوگ جنہوں نے انگریز کا دورِ غلامی دیکھا ہے وہ جانتے ہیں کہ اس وقت کے بدمعاش آج کی طرح نہیں ہوتے تھے۔ جس گاؤں یا شہر میں ایک بدمعاش ہوتا تھا اس گاؤں اور شہر کے لوگ رات کو لمبی تان کر سویا کرتے تھے کیونکہ وہ یہ سمجھتے تھے کہ ان کا جان و مال بالکل محفوظ ہے اور اس بدمعاش کے ہوتے کسی کی جرأت نہیں کہ ان کی طرف میلی آنکھ سے بھی دیکھ سکے۔

میں اپنا نام بتانا نہیں چاہتا کیونکہ جو کہانی سنا رہا ہوں اس کے اکثر بہت سے کردار زندہ ہیں۔ اور وہ لوگ جن کی خوشیوں کی خاطر میں نے اپنے آپ کو تباہ کر لیا ان کو میری وجہ سے معمولی سی پریشانی بھی کیوں ہو؟ اگر اپنا صحیح نام اور پتہ بتا دوں تو اس دور کے میرے علاقے

WWW.PAKSOCIETY.COM
Scan by PJF

کے ابھی بہت سے لوگ یہاں پاکستان میں موجود ہیں۔ وہ سب قسم کھا کر اس بات کی گواہی دیں گے کہ میں جھوٹ نہیں بول رہا۔

میرا نام آپ کچھ بھی سمجھ لیں۔ نام میں رکھا ہی کیا ہے۔ انسان کا کردار ہی سب کچھ ہوتا ہے۔ میں نے بڑے بڑے نام والوں کو اپنی ضرورت کے لئے معمولی معمولی سے لوگوں کے سامنے جھکتے دیکھا ہے اور بڑے گمنام سے لوگوں میں مجھے ایسا کچھ نظر آیا ہے کہ وہ مجھے دنیا کے عظیم ترین انسان لگے۔

میں نے ایک عام سے زمیندار گھرانے میں جنم لیا۔ ہمارا گاؤں ادھر سرحد کے پار پنجاب کا ایک مشہور گاؤں تھا۔ اسے آپ چھوٹا سا قصبہ ہی سمجھ لیں۔ بعض دیہات آج بھی آپ کو ایسے ملیں گے جن کی نامودی کی وجہ قتل و غارت گری یا چوری چکاری ہوتی ہے۔ بزرگ جانتے ہیں کہ کئی دیہات انہی چوروں اور ڈاکوؤں کے نام پہ آباد ہو گئے تھے۔

میرے والد ایک مذہبی اور سیدھے سادے انسان تھے۔ گاؤں کے واقعات سے الگ تھلگ وہ بڑے اطمینان سے اپنی زندگی گزار رہے تھے جبکہ ہمارے گاؤں کے ہر دوسرے گھر میں کوئی نہ کوئی جرائم پیشہ شخص رہتا تھا۔ ہمارے گاؤں میں سکھوں کے گھر مسلمانوں سے کچھ زیادہ ہی تھے۔ یہ کوئی معمولی گھٹیا قسم کے سکھ نہیں تھے بلکہ "زمیندار" سکھ تھے۔ سرکار دربار میں بھی ان لوگوں کی عزت تھی اور دولت کی بھی ان کے ہاں ریل پیل رہتی تھی۔ ان سکھوں کے مقابل جو مسلمان زمیندار تھے وہ بھی کسی طرح ان سے کم نہیں تھے۔ یہ لوگ بھی سرکار دربار میں ایک مقام رکھتے تھے اور حکومت کی چمچہ گیری میں سکھوں سے آگے نکلنے کے لئے کوشاں رہتے تھے۔ علاقے میں جو بھی نیا تھانیدار آتا وہ مسلمان ہوتا۔ سکھ ہندو یا عیسائی ہر دو فریقین اس کی دعوت بڑے وسیع پیمانے پہ ترتیب دیتے۔

پولیس کا آنا جانا یوں بھی ہمارے علاقے میں لگا رہتا تھا کیونکہ ہمارے یا اردگرد کے کسی گاؤں میں کوئی نہ کوئی واردات ہوتی ہی رہتی تھی۔ لیکن کیا مجال جو کبھی پولیس کسی کے گھر کی

طرف آئی ہو۔ ہمارے گرداگرد دیہاتوں کے چور اور بدمعاش عموماً پناہ لینے کسی سکھ یا مسلمان کے گھر جا چھپتے تھے اور پولیس جب کبھی مخبری پہ چھاپہ مارتی تو کبھی اس گھر کی طرف نہیں آتی تھی۔ ان گھروں کے باہر بنی کسی سکھ زمیندار یا مسلمان جاگیردار کی حویلی پہ پولیس آکر بیٹھ جاتی اور وہیں ملزموں کو بلایا جاتا۔ اب یہ ان لوگوں کی صوابدید پہ ہوتا کہ وہ مطلوبہ شخص کو کب اور کہاں پیش کرتے ہیں یا نہیں کرتے ہیں۔

اچھے برے لوگ دنیا کے ہر معاشرے میں موجود ہوتے ہیں لیکن آج کی طرح اس دور میں بھی پولیس کا محکمہ کچھ زیادہ ہی بدنام تھا۔ وہ لوگ جو من گھڑت اور جھوٹی کہانیاں لکھ کر انگریز کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملا دیتے ہیں دراصل ذہنی طور پہ ابھی تک انگریز کی غلامی کر رہے ہیں۔ ان پڑھے لکھے جاہلوں کو یہ علم نہیں کہ انگریز نے پولیس کو صرف اپنا اقتدار قائم رکھنے کے لئے بے تحاشا اختیارات دے رکھے تھے۔ جو لوگ انگریزوں کے منظورِ نظر تھے وہ ہر طرح اپنی من مانیاں کرتے تھے اور پولیس کو جرأت نہیں ہوتی تھی کہ ان کے نزدیک بھی پھٹک سکے۔

ہمارے گرداگرد دیہاتوں میں کئی بے چارے غریب لوگ انگریزوں کے پروردہ زمینداروں کی دشمنی کی بھینٹ چڑھ جاتے تھے۔ لیکن کسی کو ان کے قتل کا سراغ نہیں ملتا تھا۔ اگر کسی تھانیدار نے زیادہ ایمانداری کا مظاہرہ کیا تو اس بیچارے کی نوکری سے چھٹی ہو جاتی تھی۔

میں یہ باتیں اپنی نئی نسل کے نوجوانوں کو اس لئے بتا رہا ہوں کہ انہیں آزادی کی قدر و قیمت کا احساس ہو۔ آج آپ کچھ بھی کہہ لیں یہ ٹھیک ہے پولیس عوام سے بسا اوقات زیادتیاں کر جاتی ہے لیکن عدالتیں تو اپنی ہیں۔ کہیں نہ کہیں انصاف تو مل ہی جاتا ہے۔ انگریز کے دور میں انصاف صرف ان کے لئے تھا جو اس کی حکومت کے لئے کتے کی طرح وفادار رہتے تھے۔ ورنہ تو کوئی غریب اور انگریز دشمن نوجوانوں کی جوانیاں جیلوں کی بھینٹ چڑھ گئیں۔

میرا چچا اس علاقے میں "جٹا بدمعاش" کے نام سے مشہور تھا۔ والد کے بالکل برعکس وہ

اس علاقے کا مانا ہوا "تھانہ" تھا۔ لوگ اس بدمعاش کو کہا کرتے تھے جس کے پاس چھوٹے چھوٹے بدمعاش چوری چکاری کے جانور برائے فروخت یا چھپانے کے لئے لایا کرتے تھے۔ چچا والد سے عمر میں بہت چھوٹا تھا۔

میرے والد نے ہمیشہ یہی کوشش کی کہ میں چچا کے سائے سے بھی بچا رہوں لیکن ابا تو چچا نے شادی نہیں کی تھی دوسرے اس وجہ سے کہ میں اپنے والد کا پہلوٹھی کا بیٹا تھا اور وہ چچا میں میرے والد اور چچا تھے ہی دو بھائی۔ ہماری کوئی بہن بھی نہیں تھی۔ میرے چچا کو مجھ سے بہت زیادہ محبت تھی۔ میں نے مشکل آٹھ جماعتیں پاس کیں۔ وہ بھی والد کی سختی اور مسلسل نگرانی کی وجہ سے گھر پر وہ خود مجھے قرآن پاک پڑھاتے تھے اور اس بات کا خیال رکھتے کہ میں زیادہ وقت انہی کے ساتھ گزاروں۔ لیکن مجھے جب کبھی موقع ملتا اپنے چچا کے پاس بہادروں اور بدمعاشوں کی کہانیاں سننے بیٹھ جاتا۔

چچا کی محبت رنگ لائی اور ایک روز میں بھی اس کے ساتھ واردات پر چلا گیا۔

پہلی رات جب میں چچا کے ساتھ چوری کی واردات پر گیا تو میری عمر بمشکل سولہ سال تھی۔ ہم لوگ شام ڈھلے اپنے گاؤں سے روانہ ہوئے۔ چچا نے اس سے پہلے مجھے اس فن کے اسرار و رموز سے آگاہ کر دیا تھا۔ اس نے مجھے یہی سکھایا تھا کہ وہ تو مرد ہی نہیں جس نے پانچ دس چوریاں نہ کی ہوں۔ اس سے پہلے چچا مجھے مزے لے لے کر اپنے گھیرے میں آتے اور پھر ان لوگوں کو چکمہ دے کر نکل جانے کی باتیں سنایا کرتا تھا۔ جب کبھی وہ کسی بڑے نامی گرامی چور یا بدمعاش کا ذکر کرتا تو بالکل اس طرح جیسے کسی بڑی اعلیٰ ہستی کا بیان کر رہا ہو۔

تمام راستے وہ مجھے اپنے ہی واقعات سناتا آیا۔ ہم نے پیدل ہی قریباً بیس میل راستہ دو ڈھائی گھنٹے میں طے کر لیا۔ میں آپ کو یہ بات بتا دوں کہ اس زمانے میں یہ کوئی اتنا زیادہ فاصلہ نہیں تھا اور لوگ عموماً اتنا پیدل چلا کرتے تھے۔

ہم لوگ جس جگہ پہنچ کر رکے وہاں دو تین ایک گاؤں کے دھندلے دھندلے نقوش

دکھائی دیئے۔ اندھیرے میں اتنی دور تک ٹھیک سے نظر تو نہیں آ رہا تھا لیکن الاؤ کا جلنے والے دیئے یا لالٹین کی لو یہ احساس دلا رہی تھی کہ یہ کوئی گاؤں ہے۔ مجھے بعد میں علم ہوا کہ یہ سکھوں کا مشہور گاؤں ہے۔

اس گاؤں کے سردار ارد گرد کے علاقے میں ہمارے گاؤں کے سرداروں کی طرح ایک آنی اتھارٹی رکھتے تھے۔ حال ہی میں ان لوگوں نے ایک قیمتی گھوڑی خریدی تھی جس کی اطلاع میرے چچا کو اس کے مخبروں نے پہنچا دی تھی۔ میرا چچا معمولی قسم کا واردات یا تھا نہیں۔ وہ عموماً بڑے ہاتھ مارا کرتا تھا۔ اور ایسا قیمتی شکار تو اس نے کبھی چھوڑا ہی نہیں تھا۔

ہم دونوں گاؤں کے باہر کماد کے کھیتوں میں چھپے بیٹھے تھے۔ چچا مجھے یہاں بھی بڑے بڑے بدمعاشوں کی وارداتیں سناتا رہا۔ بڑے چور اور بدمعاش اپنی وارداتیں بچوں کے سامنے نہیں کیا کرتے۔ یہی وہ جلدی کسی پر اعتماد کرتے ہیں لیکن میرے چچا کی جہاندیدہ نظروں نے یا تو مجھ میں چھپے "دنبر آدمی" کو دیکھ لیا تھا یا وہ پہلی ہی واردات میں میری جھجک ختم کر دینا چاہتا تھا۔ اس کی باتیں اتنی دلچسپ ہوتی تھیں کہ ایک مرتبہ سننے بیٹھ جاؤ تو اٹھنے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ اس نے وقت گزاری کے لئے مجھے اپنے ایک "ڈاکے" کی کہانی سنانی شروع کر دی اور بتانا شروع کیا کہ کس طرح وہ اپنے ساتھیوں سمیت گاؤں والوں کے گھیرے میں آ کر نکل گیا تھا۔ ان باتوں میں ہمارے دو ڈھائی گھنٹے ضائع ہو گئے۔ لیکن کیا مجال جو مجھے وقت کا ذرا سا بھی احساس ہوا ہو۔

کہانی کے اختتام پر چچا نے کہا "بچہ تنگڑا ہو جا۔ ہم روانہ ہونے والے ہیں۔"

میں فوراً اٹھ کھڑا ہوا۔ اس دور میں ہمارے علاقے میں امام دین گوہاوا تنگی اور پیچھے چاکر کی کہانیاں لوگ گا گا کر سنایا کرتے تھے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ اس لمحے میں خود کو کسی ایسی ہی کہانی کا کردار محسوس کر رہا تھا۔

چچا نے مجھے اس حویلی کا نقشہ اچھی طرح سمجھا دیا تھا جہاں سے ہمیں گھوڑی کھولنی تھی اور یہ بھی بتا دیا تھا کہ یہ سکھ علاقے کے مانے ہوئے زمیندار ہیں۔ گھوڑی کی حفاظت کے لئے انہوں نے

Scanned By Waqar Azeem

حویلی میں پہرے دار بھی یقیناً رکھے ہوں گے۔

اس زمانے میں آتشیں اسلحہ اتنا عام نہیں ہوا تھا۔ یوں بھی اسے بزدلی سمجھا جاتا تھا کہ کسی کو چھپ کر گولی مار دی جائے۔ میں نے اپنے ہاتھ میں پکڑی ڈانگ کو جس کے ایک سرے پر لوہے کی کیلیں گاڑی گئی تھیں۔ اپنے دونوں ہاتھوں میں پکڑ کر تولا۔ چچا نے میری پیٹھ پر ہاتھ مار کر مجھے تھپکی دی اور ہم دونوں اللہ کا نام لے کر کھیتوں سے باہر نکل آئے۔

سردیوں کا آغاز تھا اور رات کے اس پہر کھلا علاقہ ہونے کی وجہ سے اچھی خاصی سردی پڑنے لگی تھی۔ لیکن مجھے اپنا سارا وجود تپتا ہوا محسوس ہو رہا تھا یوں جیسے اچانک بخار چڑھ آیا ہو۔

کھیتوں کے بیچوں بیچ ہم چلتے گئے۔ چچا آگے آگے تھا اور میں اس کے پیچھے پیچھے۔ ایک جگہ پہنچ کر وہ رک گیا۔ ہم گاؤں کی حدود میں داخل ہو چکے تھے۔ وہ اکا دکا روشنیاں جو دور سے جھلملاتی نظر آ رہی تھیں اب مدھم پڑ چکی تھیں۔ گاؤں کے دوسرے کونے سے چوکیدار کی آواز "جاگتے رہو" کبھی کبھی ضرور سنائی دے دیتی تھی لیکن چچا کو جیسے اس آواز کی پرواہ ہی نہیں تھی۔

اس نے ایک لمحے کے لئے رک کر میری طرف دیکھا۔ شاید میری حالت کا جائزہ لینا چاہتا تھا۔ میں چچا سے آنکھیں ملتے ہی مسکرا دیا اور چچا خوش ہو گیا۔ ہم دونوں اس سلسلے میں خاص احتیاط برت رہے تھے کہ ہمارے پاؤں کی چاپ بالکل سنائی نہ دے۔

اچانک میں ٹھٹھک کر رک گیا۔ چوکیدار کی آواز کہیں قریب ہی سے سنائی دے رہی تھی اور یوں محسوس ہو رہا تھا۔ جیسے وہ ہمارے بالکل نزدیک آ گیا ہو۔ چچا نے مڑ کر میری طرف دیکھا اور مجھے آگے بڑھنے کا اشارہ کیا۔ میں تیزی سے اس کے نزدیک آ گیا اور سرگوشی کرنے کے انداز میں کہا۔

"چوکیدار قریب آ گیا ہے۔"

"گھبراؤ نہیں۔ چلتے چلو۔" چچا نے مجھے تسلی دی اور میرا بازو پکڑ کر آگے بڑھا دیا۔

میں گھبرایا تو واقعی نہیں تھا لیکن کچھ پریشان ضرور ہو گیا کہ اس طرح چوکیدار کے نزدیک آنے کے باوجود آخر چچا رک کیوں نہیں جاتا۔ جلد ہی میری گھبراہٹ دور ہو گئی جب میں نے

چوکیدار کو ایک ہاتھ میں لالٹین اور دوسرے میں ڈنڈا پکڑے اپنے نزدیک آتے دیکھا۔

اس نے ہمیں دیکھ لیا تھا اور اس طرح بے جھجک ہماری طرف آ رہا تھا جیسے ہم چور نہیں۔ اس کے کوئی قریبی رشتہ دار ہیں۔ میں نے ڈانگ کو دونوں ہاتھوں میں پکڑ کر تولا اور پاؤں کی پنجوں کے بل گاڑی گئی تھیں۔ اپنے آگے پیچھے کر کے جم کر کھڑا ہو گیا۔ بالکل اس طرح جیسے کسی پر حملہ کرنے والا ہوں۔ چچا نے میری طرف دیکھا اور مسکراتے ہوئے ہاتھ کے اشارے سے مجھے منع کر دیا۔

اب تو میں واقعی چکرا کر رہ گیا۔

چوکیدار نے ہمارے قریب آ کر لالٹین سمیت اپنا ہاتھ ماتھے تک لے جا کر میرے چچا کو سلام کیا اور اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کر کے گاؤں کی ایک ویران سی سمت کو چلنے لگا۔ اس دوران وہ "جاگتے رہو" بھی کہتا جا رہا تھا۔ ہم دونوں دبے پاؤں اس کے تعاقب میں چل رہے تھے۔ میں سمجھ چکا تھا کہ یہ چوکیدار میرے چچا کا "اپنا آدمی" ہے۔

ہم دونوں اس کے تعاقب میں گاؤں کے ایک قدرے ویران گوشے میں جا کر رک گئے۔

"سناؤ چونی لال۔ کیا حالات ہیں"؟ چچا نے اس کی طرف دیکھا۔

"سرکار سب اچھا ہے۔ سب ٹھیک....."

اس نے بڑی دھیمی آواز میں چچا کو بتانا شروع کیا کہ گھوڑی کہاں بندھی ہے اور اس کے گرد کتنے محافظ ہیں۔ میں بظاہر دونوں کی گفتگو سے لاتعلق کھڑا رہا لیکن میرے کان اسی طرف لگے ہوئے تھے۔ چونی لال درمیانی عمر کا ایک گندمی رنگ اور دھرے بدن کا لیکن خاصا چالاک دکھائی دے رہا تھا۔

اس کا انداز گفتگو بتا رہا تھا کہ وہ کوئی غیر معمولی قسم کا "چوکیدار" ہے۔ مجھے علم نہیں وہ میرے چچا کا واقف کیسے بنا لیکن یہ بات مجھے اچھی طرح سمجھ آ رہی تھی کہ وہ چچا سے اپنا حصہ پہلے ہی مانگ رہا تھا۔

"چونی لال"۔ چچا کی قدرے غصیلی آواز سنائی دی۔ "تم مجھے آج سے نہیں پچھلے دس سال

WWW.PAKSOCIETY.COM
SCAN BY PDF

سے جانتے ہو۔"

"مم.... میرا یہ مطلب نہیں تھا مہاراج جی!" — چونی لال گنگنایا۔

تھوڑی دیر تک وہ آپس میں کھسر پھسر کرتے رہے۔ پھر چونی لال ہاتھ باندھتے ہوئے چلا گیا۔ وہ ہماری مخالف سمت "جاگتے رہو" کا شور مچاتا جا رہا تھا اور مجھے اس کی بے بسی پر ہنسی آ رہی تھی کہ جن کی بربادی کا سامان ان کا اپنا محافظ کر رہا تھا۔

چونی لال کی روانگی کے چند منٹ بعد ہی چچا نے مجھے "آ بچہ" کہہ کر آگے بڑھنے کا اشارہ کیا۔

میں اپنے چچا کے ساتھ ہی اس حویلی کے دروازے کے پاس پہنچ گیا جہاں ہم نے واردات کرنی تھی۔ حویلی کے مکین گہری نیند سو رہے تھے۔ دیہاتوں کی حویلیوں میں شاید ہی کوئی دروازے پر رات کو کنڈی لگاتا ہو۔

ہم دونوں ایک دوسرے کے تعاقب میں اندر داخل ہوئے۔ چونی لال نے جو میرے چچا کا مخبر تھا پہلے ہی سے یہاں کے سارے حالات بتا دیئے تھے۔ ایک بڑے کمرے کے سامنے جس کا دروازہ بند تھا چچا نے مجھے کھڑے ہونے کا اشارہ کیا۔ میں اپنی ڈیوٹی سمجھ گیا تھا۔ مجھے اس کمرے سے اچانک اٹھ کر باہر آنے والوں سے نمٹنا تھا اور چچا نے گھوڑی کھولنی تھی۔

میں دروازے سے ہٹ کر قدرے آڑ میں کھڑا ہو گیا اور چچا اس کمرے کے پچھلی طرف چلا گیا۔ اسے گئے قریباً تین چار منٹ ہو گئے تھے اور میں چچا کی لاکھ دلاسیری کے باوجود دھڑکتے دل سے دونوں ہاتھوں میں اپنی ڈانگ سنبھالے باہر کھڑا تھا۔ سردی کے باوجود یہ عالم تھا کہ میری ہتھیلیاں پسینے میں بھیگنے لگی تھیں۔

میری چھٹی حس نے اچانک ہی کسی خطرے کی نشاندہی کی اور میرے سامنے والا دروازہ کھلنے لگا۔ یہ میرے امتحان کا وقت تھا۔ یا تو میں گھبرا کر ہمت ہار دیتا اور یہ لوگ مجھے پکڑ کر

پیٹتے میرے بازو اور ٹانگیں مار مار کر توڑ ڈالتے۔ اس کے بعد پولیس کے حوالے کر دیتے — یا پھر میں چچا کی ٹریننگ کے مطابق ہمت سے کام لیتا اور حالات کو سنبھال لیتا۔

میں نے دوسرا راستہ اپنایا اور دروازہ کھول کر جیسے ہی ایک آدمی باہر نکلا اس کے سر پر میری زوردار ڈانگ کی ضرب لگی۔ وہ چکرا کر گر پڑا۔ یہ شخص شاید یونہی کسی ضرورت کے تحت باہر آیا تھا۔ ابھی تک انہیں یہ شک نہیں ہوا تھا کہ ان کے ہاں چور گھس آئے ہیں۔ اس نے گرتے گرتے دروازہ تھام کر سنبھالنا چاہا لیکن میری ضرب بڑی بھرپور اور زوردار تھی۔ وہ دروازے سے ٹکرا کر گرا تھا۔ دھڑام کی زوردار آواز پر اندر موجود لوگ بیدار ہو گئے۔ میں اب خاصا دلیر ہو چکا تھا۔ ایک آدمی نے اندر سے زوردار آواز میں مجھے للکارا لیکن یہ اس کے سامنے آنے کی حماقت نہیں کر سکتا تھا۔

میرے پیچھے آہٹ ہوئی اور مڑ کر دیکھا تو چچا گھوڑی کی لگام تھامے باہری دروازے کی طرف آ رہا تھا۔ چاند کی شفاف روشنی میں اس نے ایک آدمی کو کمرے کے دروازے کے نزدیک گرا ہوا دیکھ لیا تھا۔ اور مجھے چوکس دیکھ کر حالات کا اندازہ لگا لیا تھا۔

اندر موجود لوگوں نے پہلے اٹھ کر لالٹین جلانی تھی اور ہمارے پاس یہاں سے نکلنے کے لئے اتنا ہی وقت تھا۔ چچا نے مجھے قریب آنے کا اشارہ کیا۔ وہ گھوڑی پر بیٹھ چکا تھا۔ میں بھی چھلانگ لگا کر اس کے پیچھے بیٹھ گیا۔ دوسرے ہی لمحے اس نے گھوڑی کو ایڑ لگا دی۔

دروازے سے گزرتے ہوئے میں نے گردن موڑ کر دیکھا دو سکھ لاٹھیاں اٹھائے برآمدے میں کھڑے تھے۔ ان میں سے کسی کی زوردار آواز سنائی دی۔

"گھوڑی نکل گئی —"

اس کے ساتھ ہی ہم بھی نکل گئے۔ لیکن میں تصور کی آنکھ سے دیکھ سکتا تھا کہ ہمارے پیچھے وہاں کیا طوفان بدتمیزی برپا ہو گا۔

گھوڑی سرپٹ بھاگ رہی تھی۔ میں گھوڑی کی ننگی پیٹھ پر اپنے چچا کی کمر تھامے بیٹھا تھا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

میرا چچا تو مانا ہوا سوار تھا لیکن اس طرح میرے لئے سواری ممکن نہیں تھی۔ ہم نے گاؤں سے نکلنے کے لئے غلط راستہ افراتفری میں منتخب کر لیا۔ چچا کو بھی اس کا احساس ہو گیا تھا۔ کیونکہ ہمارے پیچھے شور بلند ہو رہا تھا۔ اور اب سارا گاؤں کسی بھی لمحے بیدار ہو سکتا تھا۔

"بچہ! تو گھبرانا نہیں۔ ابھی "وار" میرے پیچھے آئے گی۔ یہ ابھی کم عمر کی گھوڑی ہے۔ میرا دو سواروں کے ساتھ "وار" سے نکل نہ سکے۔ میں تجھے چونی لال کے سپرد کر کے جاؤں گا۔ رات وہ تجھے یہاں سے نکال کر میرے پاس پہنچا دے گا۔" چچا نے گردن موڑ کر مجھے کہا اور میرے ردِ عمل سے آگاہ ہوئے بغیر ہی گھوڑی کو ایک دوسرے راستے پر موڑ دیا۔

میں کیا جواب دیتا۔ گاؤں میں شور برپا ہو رہا تھا۔ یہ تو میں بھی سمجھتا تھا کہ چند منٹ کے بعد ہی سکھوں کے ملازم اپنے گھوڑوں پر ہمارے تعاقب میں آئیں گے۔ کیونکہ ان کے لئے یہ امر بڑی زبردست سبکی کا باعث ہو گا کہ کوئی سرداروں کی گھوڑی کھول کر لے گیا۔

میرا چچا کچی گولیاں کھیلے ہوئے نہیں تھا۔ وہ بڑا گھاگ چور تھا اور ہر کام پلاننگ سے کرتا تھا۔ اسے علم تھا کہ کہاں چوری کرنے جا رہا ہے۔ کسی بھی ناگہانی آفت کا مقابلہ کرنے کے لئے اس نے تمام ہنگامی بندوبست کر رکھے تھے۔ گاؤں کی ایک گلی کا موڑ کاٹتے ہوئے اس نے پورے زور سے گھوڑی کی لگامیں کھینچیں اور گھوڑی اچانک پچھلے پاؤں پر کھڑی ہو گئی۔

میں اس صورت حال کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار نہیں تھا۔ الٹ کر نیچے جا گرا۔ چچا نے گھوڑی کو سنبھال کر سیدھا کھڑا کیا۔ میرے زمین پر گرتے ہی جو شخص مجھے اٹھانے کے لئے لپکا وہ چونی لال تھا۔!!

یہ شیطان شاید منصوبے کے مطابق یہیں ہمارا منتظر تھا۔ چچا نے اسے مختصر ایک دو فقرے میرے متعلق کہے اور صورت حال سمجھا دی۔

"بے فکر ہو جا چوہدری۔ میرے جیتے جی کوئی بچے کی طرف میلی نظر سے بھی نہیں دیکھ سکے گا۔" چونی لال نے چچا کی تسلی کرا دی۔

"سب راکھا بچہ۔" چچا کے منہ سے نکلا اور اس نے گھوڑی بھگا دی۔

مجھے گرتے وقت تو کچھ زیادہ احساس نہ ہوا لیکن اٹھ کر کھڑا ہوا تو یوں لگا جیسے میری ٹانگ اور بازو ٹوٹ چکے ہوں۔ اچانک ہی درد کی ٹیسیں اٹھی تھی۔ چونی لال کو اس بات کا علم نہیں تھا۔ اس نے میرا ہاتھ پکڑا اور مجھے ایک طرف گھسیٹنے لگا۔

میرے لئے اس بات کا تصور ہی بڑا ہولناک تھا کہ میرا کوئی بازو یا ٹانگ کی ہڈی ٹوٹ گئی ہے۔ جان بچانے کا خوف اور پھر تازہ تازہ چوٹ اس وقت تو مجھے کوئی احساس نہ ہوا لیکن جیسے ہی گاؤں کے ایک کونے میں الگ سے بنے مکان میں مجھے داخل کر کے چونی لال نے کنڈی لگائی تو اچانک درد کی ٹیسیں میرے بدن سے اٹھنے لگیں۔

یہ مکان جس میں ہم داخل ہوئے تھے ایک کمرے ایک رسوئی اور چھوٹے سے برآمدے پر مشتمل تھا۔ چونی لال نے مجھے برآمدے میں ایک چارپائی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور خود دروازہ کھٹکھٹایا۔ اندر سے "کون"؟ کی آواز آئی۔

"میں ہوں بیٹی جلدی کر۔" چونی لال نے بڑی دھیمی لیکن قدرے گھبرائی ہوئی آواز میں کہا۔

دوسرے ہی لمحے دروازہ کھلا اور چاند کی روشنی میں میری نظر جس شکل پہ پڑی۔ اس نے مجھے مبہوت کر کے رکھ دیا۔ یہ مہندر تھی۔ چونی لال کی بیٹی۔ اس کی شکل پر نظر پڑتے ہی مجھے اپنی دادی کی وہ کہانی یاد آ گئی جو اس نے بچپن میں مجھے کئی دفعہ سنائی تھی۔ یہ کہانی کچھ اس طرح تھی کہ ایک جادوگرنی خوبصورت لڑکی کا روپ دھار کر ویران راستے پر کھڑی ہو جایا کرتی تھی۔ اس کے حسن کو جو کوئی نظر بھر کے دیکھتا پتھر کا ہو کر رہ جاتا۔

مجھے یوں لگا جیسے مہندر وہ جادوگرنی ہے اور میں اجنبی مسافر۔

چاند کی شفاف اور چمکیلی روشنی میں اس کی بڑی بڑی سیاہ رنگ کی آنکھیں جو اس کے سارے چہرے پر پھیلی ہوئی محسوس ہوتی تھیں۔ مجھے اپنے کلیجے میں دھنستی محسوس ہوئیں۔

"مہندو! یہ بچہ چوہدری ہے۔ خیال رکھنا اس کا۔" اس نے اپنی بیٹی سے مختصر سی

Scan x PDF WWW.PAKSOCIETY.COM

بات کی۔

گھبراہٹ تو مہندر کے نزدیک بھی شاید نہیں پھٹکی تھی، یوں محسوس ہوتا جیسے میری اچانک آمد یہاں معمول کی کوئی کارروائی تھی۔

"فکر نہ کر چاچا۔ تو نکل جا۔" اس نے واپس مڑتے اپنے باپ سے کہا۔

"چنگا چوہدری جی۔ گاؤں جاگ رہا ہے۔ میں ذرا ادھر کی فکر کروں۔ آپ بے فکر ہو جاؤ۔ یہاں چڑیا بھی پر نہیں مار سکتی۔"

اس دوران گاؤں میں "چور" "چور" کا شور بلند ہونے لگا تھا۔ چونی لال تیزی سے باہر کی سمت لپکا۔ مہندر اتنی ہی پھرتی سے اس کے پیچھے دوڑی۔ اس نے باہری دروازے کی کنڈی چڑھا دی۔ مجھے اب گاؤں کے لوگوں کی مختلف آوازوں کے ساتھ چونی لال کی زوردار آواز بھی سنائی دینے لگی تھی۔

"وہ۔۔۔ ادھر نکل گیا ہے۔۔۔ ابھی اس طرف گیا ہے۔" وہ زور زور سے چلا کر کسی کو بتا رہا تھا۔ شاید اچانک ہی کوئی اس سے ٹکرا گیا تھا۔

میں اس دوران ہونقوں کی طرح مہندر کے سراپے کا جائزہ لیتا رہا۔ جواب میری ہی طرف واپس آ رہی تھی۔ مجھے اپنی سانسیں رکتی محسوس ہو رہی تھیں۔ مہندر مجھ پر سحر بن کر طاری ہو گئی تھی۔ میرے نزدیک آ کر وہ ٹھہر گئی۔ بالکل ایسے جیسے اچانک کائنات کی گردش تھم جایا کرتی ہے۔

"چوہدری جی اندر آ جاؤ۔" اس نے میری طرف جھک کر سرگوشی کی۔

اس طرح اچانک جھکنے سے اس کے جسمانی خطوط کچھ ایسی بے باکی سے واضح ہوئے کہ میں سہم کر رہ گیا۔ میرا دل یکدم بڑے زور سے دھڑکا اور یوں لگا جیسے ابھی سینے کا پنجر توڑ کر من کا پنچھی پھڑک کر باہر آ گرے گا۔ اس کے ساتھ ہی وہ تن کر کھڑی ہو گئی۔

میں نے اٹھنے کا ارادہ کیا ہی تھا کہ گاؤں کی وہ گلی مختلف گھوڑوں کی ٹاپوں کی آواز سے لرزنے لگی۔ میں سمجھ گیا کہ [illegible] دار میرے چچا کے تعاقب میں اس کے پیچھے نکلی ہے۔ اس کے

[illegible] میں نے چاہا کہ اٹھ جاؤں۔ اپنی جگہ سے ذرا سا ہلا ہی تھا کہ اچانک میرے منہ سے "ہائے" نکل گئی۔ مہندر جو دروازے کی طرف مڑ رہی تھی، میری اچانک "ہائے" پر میری طرف گھوم گئی۔

"کیا ہوا چوہدری جی۔۔۔ کیا ہوا۔۔۔" اس نے گھبرائی ہوئی آواز میں مجھ سے پوچھا۔

مجھے کچھ شرم سی محسوس ہوئی کہ ایک مرد ہوتے ہوئے اس لڑکی کے سامنے [illegible] کا مظاہرہ [illegible] ہوں۔

"کچھ نہیں۔ کچھ نہیں۔۔۔" میں نے درد سے بے حال ہونے کے باوجود کسمسا سا ہو کر کہا اور اپنے زور سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

اس طرح اچانک کھڑے ہونے سے مجھے تکلیف تو بے حد ہوئی لیکن اس بات کی خوشی ضرور تھی کہ میری ہڈیاں سلامت تھیں۔ اگر خدانخواستہ کوئی ہڈی ٹوٹی ہوتی تو میں یوں اٹھ کر کھڑا نہ ہو سکتا۔

"چلو۔" میرے منہ سے نکلا۔

لیکن۔۔۔ مہندر بدستور میرے چہرے پر نظریں جمائے وہیں جم کر کھڑی رہی۔ شاید اس نے درد کی اذیت برداشت کرتے ہوئے چہرے کی قدرتی طور سے بدلتی ہوئی رنگت کو دیکھ کر میری اندرونی حالت کا اندازہ لگا لیا تھا۔ بغیر کچھ کہے وہ میرے نزدیک آ گئی۔

قدیں وہ قریباً میرے برابر ہی تھی۔ اس نے میرا بازو پکڑا اور اپنے کندھے پر رکھ دیا۔ اس طرح شاید مجھے سہارا دے کر اندر تک لے جانا چاہتی تھی۔

اس کے اچانک قریب آنے کے احساس نے میرے وجود کو پگھلا کر رکھ دیا۔ میں سحر زدہ سا قریباً لنگڑاتا ہوا اس کے ساتھ کمرے میں داخل ہوا۔ اس کے جسم سے خارج ہونے والی برقی رو اب مجھے اپنی شریانوں میں دوڑتی محسوس ہونے لگی تھی۔ میرے وجود میں انگارے تڑپ رہے تھے۔ میں نے زندگی میں پہلی مرتبہ کسی بھرپور عورت کو اتنے قریب سے اچانک، اور اتنے قریب سے دیکھا تھا۔ یہ تجربہ میرے لیے بڑا ہی جان لیوا تھا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM
Scan x PDF

کمرے میں داخل ہو کر اس نے مجھے اُسی بستر پر سہارا دے کر بٹھا دیا جہاں شاید تھوڑی دیر پہلے وہ لیٹی ہوئی تھی۔ چھت خاصی اونچی تھی۔ دیواروں میں بنے روشندانوں اور کھلے دروازے میں سے چاند کی روشنی چھن چھن کر اندر آ رہی تھی۔

اندھیرے میں جلد ہی میری آنکھیں دیکھنے کے قابل ہو گئیں۔ اس کمرے کی اندرونی دیوار میں مجھے ایک اور چھوٹا سا دروازہ لگا دکھائی دے رہا تھا جس کا مطلب تھا کہ اس میں سے ایک اور کمرے کا راستہ بھی جاتا تھا۔ مہندر نے کمرے کا دروازہ بند کر دیا۔

دیوار میں بنے ایک طاقچے میں دھری لالٹین کو اس نے نزدیک رکھی دیا سلائی سے روشن کیا اور لالٹین کی لو اتنی گھٹا دی کہ اندر کا ماحول تو دکھائی دے لیکن باہر سے لاکھ کوشش کرنے پر بھی اندر کچھ نظر نہ آ سکے۔

مجھے جسم کا درد بے حال کیئے دے رہا تھا۔ لالٹین جلا کر مہندر میری طرف آئی اور بڑی بے تکلفی سے میرے نزدیک بیٹھ گئی۔ میں اس کی دیدہ دلیری پر حیران ہی تو رہ گیا۔

"کہاں چوٹ لگی ہے" اس نے بڑی ہمدردی سے دریافت کیا۔

"کہیں نہیں۔ خیر ہے۔ خیر ہے۔۔" میرے منہ سے نکلا۔

"چوہدری کیا لڑکیوں کی طرح باتیں کر رہے ہو۔ اس میں شرمانے والی کیا بات ہے"۔ اتنا کہہ کر اس نے میرے بازو کو بڑے آرام سے دونوں ہاتھوں میں تھام کر قدرے بلند کیا۔ پھر اسے آہستہ آہستہ کبھی نیچے اور کبھی اوپر کر کے شاید اس امر کا جائزہ لینے لگی کہ ہڈی تو کہیں ٹوٹ نہیں گئی۔ مجھے اس طرح بازو کو حرکت دینے سے تکلیف تو بہت ہوئی لیکن ضبط کیئے رہا۔

مہندر نے اس کے بعد یہی عمل میری ٹانگ سے دہرایا۔ پھر اس نے خود ہی فیصلہ بھی دے دیا۔

"ہڈی پر ضرب لگی ہے اور شاید اس کی کہیں سے چھٹ گیا ہے۔ کوئی بات نہیں ابھی آرام آ جائے گا"۔ یہ کہہ کر وہ باہر نکل گئی۔ اپنے پیچھے اس نے دروازہ بھی بند کر دیا تھا۔

میری حالت اس سحر زدہ معمول کی سی تھی جو اپنے عامل کے اشاروں کا محتاج ہو کر رہ گیا ہو۔ میں یہ بات بالکل بھول چکا تھا کہ گاؤں والے مجھے ڈھونڈ رہے ہوں گے۔ بس ایک مہندر تھی جو میری تمام حسیات پر چھا گئی تھی۔

اس کی واپسی بمشکل چار پانچ منٹ بعد ہی ہو گئی۔

مہندر نے ایک ہاتھ میں دودھ کا گلاس پکڑ رکھا تھا جس میں وہ ہلدی، پھٹکری اور گھی وغیرہ ملا کر لائی تھی۔ ان دنوں دیہاتوں میں یہی بہترین طریقہ علاج ہوا کرتا تھا۔

"لے پی لے چوہدری"۔ اس نے گلاس مجھے تھما دیا۔

اس کی مسیحائی نے میرے زخم بڑی حد تک مندمل کر دیئے تھے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ اس "نسخہ" سے زیادہ اس احساس نے کہ مہندر میرے لئے دودھ لے کر آئی ہے۔ مجھے تندرست کر دیا تھا۔ دودھ مجھے تھما کر باہر چلی گئی۔ تھوڑی دیر بعد واپس آئی تو ایک لیپ سا اس نے مٹی کے کٹورے میں بنا کر رکھا ہوا تھا۔

اس نے میرے "نہ نہ" کرنے کے باوجود میرے بازو اور ٹانگ پر اس لیپ کی مالش کر دی۔ چند منٹ بعد ہی میرا درد اس طرح کافور ہو گیا جیسا کبھی چوٹ لگی ہی نہیں تھی۔ مہندر بڑی کامیاب "حکیما" تھی۔

یہ میری اور اس کی پہلی ملاقات تھی۔ اس نے مالش کے خاتمے پر مجھے لیٹ جانے کو کہا اور ایک رضائی مجھ پر ڈال دی۔

"چوہدری! اپنے جسم کو ہوا نہ لگنے دینا"۔ اس نے مجھے کہا اور خود باہر چلی گئی۔ شاید وہ ہاتھ دھونے گئی تھی۔

واپس آ کر اس نے دوبارہ اندر سے کنڈی لگا لی اور اپنی چارپائی پر بیٹھ گئی۔ میں نے محسوس کیا اب تک اس کا سلوک میرے ساتھ بالکل ایسا تھا جیسے میں اس کا کوئی قریبی رشتہ دار ہوں۔ لیکن اس مرتبہ جب وہ اندر آئی تو اس کے چہرے کے تاثرات بدلے ہوئے تھے۔

Scanned with CamScanner

چوہدری اب آرام سے سو جا۔ بے فکر ہو کر۔ یہاں کوئی تیری گرد کو بھی نہیں چھو سکتا۔" اس نے مجھے کہا اور خود بھی اپنے بستر پر لیٹ گئی۔

آپ لوگ ذرا سوچیں میں نوجوان لڑکا تھا اور وہ چڑھتی جوانی کا شاہکار۔ یہاں بالکل تنہائی تھی اور چونی لال کی حیثیت میرے نزدیک ایک پالتو یا تنخواہ دار کتے سے زیادہ کیا ہو سکتی تھی۔ یہ بھی جانتا تھا کہ صبح ہونے سے پہلے وہ یہاں نہیں آ سکتا اور آج تو اس کا صبح کے وقت آنا بھی مشکل تھا۔ کیونکہ صبح ہوتے ہی اس گاؤں کا کھوجی گھوڑی کا کھرا اٹھا لیتا اور چوکیدار کو اس کے ساتھ کھرے کے تعاقب میں جانا تھا۔ میرے والد نے ہر ممکن کوشش کی تھی کہ میں اپنے چچا کے شر سے بچا رہوں۔ لیکن چچا نے مجھے اپنے رنگ میں رنگ لیا تھا۔ میں کوئی بڑا پارسا آدمی نہیں تھا۔ ایک معمولی سا انسان تھا جو کسی بھی لمحے ٹھوکر کھا سکتا تھا۔

میرے جسم نے اس کے ہاتھوں کا لمس جذب کر لیا تھا۔ میرے بدن میں انگارے تڑپ رہے تھے۔ مجھے اپنے جسم میں لہو کے بجائے آگ دوڑتی محسوس ہو رہی تھی۔ لیکن مجھ میں اتنا حوصلہ بھی نہیں تھا کہ مہندر کو مخاطب ہی کر سکوں۔ ابھی میرے بدن میں اتنی قوت تھی کہ میں اپنے شیطانی ارادے کو پایۂ تکمیل پہنا سکوں لیکن ایک عجیب سا تقدس ایک بے نام سی عقیدت تھی کہ جس نے مجھے اس کی سمت بڑھنے سے روکے رکھا۔

ابھی تک مہندر نے لالٹین بجھائی نہیں تھی۔ لیکن بغیر مطلب یا ضرورت کے اس نے ایک بات بھی مجھے نہیں کہی تھی۔ میں ڈیڑھ دو گھنٹے تک کروٹیں بدلتا اور خود سے لڑتا رہا۔ خدا جانے مہندر کو میری اندرونی کشمکش کا احساس ہو گیا تھا یا پھر وہ بھی شاید اسی المیے سے گزر رہی تھی جس کا میں شکار ہو چکا تھا۔

مجھے اس کے لحاف کی حرکت محسوس ہوئی اور وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔

"کیا بات ہے چوہدری نیند نہیں آ رہی کیا؟" اس نے بڑی بے باکی سے کہا لیکن میں محسوس کر سکتا تھا کہ خاصی ہمت صرف کرنے کے بعد میری سمت یہ فقرہ اچھالا ہے

تب میری زبان میں بالکل لکنت نہ آئی اور بے اختیار میرے منہ سے نکل گیا۔ "ہاں! مہندر تم نے میری نیند بھگا دی ہے۔ میں اپنی چوٹ کی تکلیف محسوس نہیں کر رہا لیکن....." اس سے آگے میں کچھ نہ کہہ سکا۔

مہندر اچانک ہی اٹھ کر بیٹھ گئی۔ دوسری طرف بھی قدم کسی غیر اختیاری فعل کا محتاج ہو کر [illegible] اٹھایا تھا۔ اس نے اپنے پاؤں چارپائی سے نیچے لٹکا دیئے اور میری طرف ٹکٹکی باندھ کر گھورنے لگی۔ اس کی آنکھیں مجھے ہیروں کی طرح جگمگ جگمگ کرتی اور اپنے اندر دھنستی محسوس ہو رہی تھیں۔

"چوہدری جی!" چند لمحے کے اذیت ناک سکوت کے بعد اس نے مجھے مخاطب کیا۔ "ہم غریب لوگ ہیں آپ بڑے آدمی ہیں۔ آپ کو ایسی باتیں زیب نہیں دیتیں۔"

خدا جانے مجھے کیا ہوا یوں جیسے کسی نے اچانک ہی مجھے چارپائی سے اٹھا کر کھڑا کر دیا ہو۔ میں بیمار زدہ سا چلتا ہوا اس کے نزدیک پہنچا اور اس کا بازو تھام لیا۔ مہندر نے کوئی مزاحمت نہ کی۔

"مہندر!" کوئی میرے اندر سے بولنے لگا۔ "تم کیا ہو۔ یہ میرا دل ہی جانتا ہے۔ مجھے تو یوں لگتا ہے جیسے میں تمہارے ہی لیے اس گاؤں میں آیا تھا۔"

مہندر کے چہرے کا رنگ ایک لمحے کے لئے بدلا۔ پھر وہ نارمل ہو گئی۔ اس نے آہستگی سے میرا ہاتھ الگ کر دیا اور بولی۔ "چوہدری! اگر مرد ہو نا تو پھر اس ہاتھ پکڑنے کی لاج رکھنا۔ آج تک کسی کو جرأت نہیں ہوئی کہ میرا ہاتھ پکڑے۔ معلوم نہیں میں نے تمہیں ایسا کیوں کرنے دیا ہے۔ لیکن اب ایسا ہو ہی گیا ہے تو اس کی شرم رکھنا۔ جاؤ اب لیٹ جاؤ۔ اس طرح اچانک گرم سرد ہونا تمہارے لئے نقصان دہ بھی ثابت ہو سکتا ہے۔"

میرا جواب سنے بغیر وہ اپنی چارپائی پر میری طرف پیٹھ کر کے لیٹ گئی۔ اس لمحے مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں اچانک گھٹن سے آزاد ہو کر کھلی فضا میں سانس لے رہا ہوں۔ میرے اندر جس

Scan x PDF WWW.PAKSOCIETY.COM

طوفان نے مچل مچا رکھی تھی وہ پرسکون ہو کر ٹھہر گیا۔

میں نے دوبارہ اس کی طرف دیکھنے کی جرأت ہی نہیں کی اور چپ چاپ لیٹ گیا۔ لیٹنے کے بمشکل پانچ دس منٹ بعد مجھے نیند آگئی اور صبح تک لمبی تان کر سوتا رہا۔

گاؤں میں مجھے صبح نماز کے وقت والد صاحب اٹھا دیا کرتے تھے۔ میری یہ عادت پڑ چکی تھی کہ میں رات کو کتنی ہی دیر سے سوؤں صبح میں فجر کے وقت جاگ اٹھتا تھا۔ لیکن اس روز جب مجھے مہندر نے جگایا تو روشندان سے دھوپ اندر آ رہی تھی۔

میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔

اس نے مجھے تسلی دی کہ ایسی کوئی گھبرانے والی بات نہیں۔ میں نے اٹھ کر پہلے سے گرم کئے ہوئے پانی سے منہ ہاتھ دھویا۔ بازو میں درد کا احساس ابھی باقی تھا۔ البتہ میری ٹانگ اب بالکل درست ہو چکی تھی۔ میں نے دن کی روشنی میں جب مہندر کا چہرہ دیکھا تو ایک مرتبہ پھر مجھ پہ وہی رات والی کیفیت طاری ہونے لگی۔

مہندر نے میرے لئے دودھ گرم کیا اور انڈوں کے ساتھ زبردستی میرے حلق میں اتار دیا۔ خدا جانے یہ اس کی ادائے بے نیازی تھی یا وہ میری آتش شوق کو مزید بھڑکانا چاہتی تھی کہ اس نے صبح بالکل یوں ظاہر کیا جیسے رات کوئی بات ہوئی ہی نہیں تھی۔ وہ کچھ بولتی یا نہ بولتی میری یہ خواہش ضرور تھی کہ مہندر میری آنکھوں کے سامنے موجود رہے۔ لیکن میں یہ بھی جانتا تھا کہ شام کے بعد بہرحال مجھے یہاں سے چلے جانا ہے۔

صبح ناشتے پر تھوڑی دیر کیلئے چونی لال آیا اور ہمیں صرف اتنی اطلاع دے کر چلا گیا کہ کھوجی نے کھرا اٹھا لیا ہے اور میں اس کے ساتھ جا رہا ہوں۔ اس نے اپنی بیٹی کو میرے متعلق دوبارہ تاکید کر دی تھی۔

ایک بات تو ظاہر تھی کہ کسی چور کو چھپانے کا مہندر کے لئے یہ پہلا تجربہ ہرگز نہیں تھا۔ لیکن یہ بات میرے لئے ضرور حیران کن تھی کہ چونی لال اس پر اتنا اعتماد کیوں کرتا ہے۔ ایک مرحلہ پھر ایسا آیا کہ مجھے اپنی اس الجھن کا جواب بھی مل گیا۔

چونی لال گیا تو میں نے مہندر سے کہا۔

"مہندر! میں رات کو یہاں سے چلا جاؤں گا۔ مجھے بھول نہ جانا۔"

"چوہدری" اس نے بڑے مضبوط لہجے میں مجھے مخاطب کیا۔ مہندر نے آج تک کسی کو دچن نہیں کہا تھا۔ "جانے میرے دل پر تو نے کیسا جادو کر دیا ہے کہ میں....." وہ خاموش ہو گئی۔

"آج اتوار ہے۔ میں بدھ کی رات کو پہلے پہر تمہارا انتظار کروں گا۔" میں نے اسے گاؤں کے باہر ایک پرانے مندر کے متعلق بتاتے ہوئے کہا۔

"میں آجاؤں گی چوہدری۔ لیکن ایک بات یاد رکھنا میں چونی لال کی بیٹی ضرور ہوں لیکن چوری کا مال نہیں کہ جس کا جی چاہے مجھے اٹھا کر لے جائے۔" اس کے لہجے کی مضبوطی اس کے کردار کی عظمت کی غماز تھی۔ میں حیران رہ گیا کہ ایسا باتیں مہندر کو کس نے سکھائی ہیں۔

دوپہر تک ہم دونوں نے جی بھر کے باتیں کیں۔ اس کی رات والی باتوں میں پائی جانے والی ہچکچاہٹ ختم ہو چکی تھی اور اب وہ میرے لئے ایک معصوم لڑکی بن چکی تھی۔ اس نے احتیاطاً مجھے کمرے کے اندر موجود دوسرے کمرے میں چھپائے رکھا۔ یوں تو وہاں کسی کے آنے کا خطرہ نہیں تھا۔ لیکن یہ بھی ممکن تھا کہ کوئی عورت مہندر کو ملنے آجاتی۔

دوپہر تک چونی لال واپس آگیا۔

"بڑا چالاک کھوجی ہے چوہدری جی!" اس نے مجھے آتے ہی باخبر کیا۔ "اس نے کھیتوں کے بیچوں بیچ کھرا اٹھا کر اسے پکی سڑک تک پہنچا دیا ہے۔ چوہدری جیٹے نے اسے اچھا خاصا چکر دیا تھا۔ تمام کھیتوں میں کھرا کھیرا تھا اس میں گھوڑی کا، پھیرو اور کی گھوڑیوں کے کھرے بھی تھے۔ لیکن وہ تو بڑا استاد آدمی ہے۔ بڑے سردار کے آدمی اسے رات ہی لینے چلے گئے تھے۔ یہاں سے دس میل دور گاؤں ہے اس کا اور صبح ہونے سے پہلے لے آئے۔" پھر وہ خود ہی ہنس پڑا۔

"لیکن کیا یاد کرے گا وہ بھی میرا نام بھی چونی لال ہے۔ میں نے چوہدری جیٹے کے گاؤں کی طرف

WWW.PAKSOCIETY.COM
Scanned PDF

ان لوگوں کا دھیان ہی نہیں جانے دیا۔

کہنے کو تو چونی لال نے یہ کہہ دیا تھا۔ یہ الگ بات کہ جب شام ڈھلے وہ مجھے ہمارے گاؤں کی حدود کے باہر چھوڑ کر گیا تو وہاں زمینداروں کے ڈیرے پہ پنچایت موجود تھی۔ میرا ان طرف جانے کے بجائے چکر کاٹ کر گھر چلا گیا۔

گھر پہنچا تو والد بڑی بے چینی لیکن غصے سے میرے منتظر تھے۔

مجھے دیکھتے ہی ان کا پارہ مزید چڑھ گیا اور انہوں نے بغیر کچھ کہے سنے ایک ڈنڈا اٹھا کر مجھے پیٹنا شروع کر دیا۔ اگر ماں اس روز ہمارے درمیان نہ آجاتی تو ممکن ہے آج میں آپ کو یہ کہانی سنانے کے لئے زندہ ہی نہ بچتا۔ میرے والد کو چچا نے تو ہرگز یہ نہیں بتایا ہوگا کہ وہ مجھے واردات پر اپنے ساتھ لے گیا تھا۔ میرے والد نے میرے رات باہر گزارنے سے یہ اندازہ لگایا تھا۔

والدہ کی مار نے ایک مرتبہ پھر میرا سویا درد جگا دیا۔ یہاں کوئی مہندر میرے لئے دودھ کا پیالہ اور مالش کی دوا تو لے کر کھڑی نہیں تھی۔ ماں کو یہ علم نہیں تھا کہ میں پہلے ہی زخمی ہوں۔ اس نے یہی سوچا ہوگا کہ باپ کی ظالمانہ مار نے میرا یہ حال کر دیا ہے۔ ماں نے مجھے تسلی دی اور سمجھایا کہ چچا کی صحبت سے دور رہوں۔ لیکن وہ بیچاری یہ نہ جان سکی کہ اب معاملہ بہت آگے نکل چکا ہے۔ میں نادانستگی میں اتنی دور نکل گیا تھا کہ جہاں سے اب واپس لوٹنا میرے لئے ممکن نہیں رہا تھا۔

دوپہر کے بعد جب والد کھیتوں پہ جا چکے تھے تو چچا میری خبر گیری کے لئے آگیا۔ میرے لئے اس کے دل میں جو بے پناہ محبت تھی وہ اس کی آنکھوں اور چہرے سے ٹپکی پڑ رہی تھی۔ اسے علم ہو چکا تھا کہ مجھے چوٹ لگ گئی ہے۔ دو ڈھائی گھنٹے وہ میرے قریب بیٹھا میری تیمارداری کرتا رہا۔

چچا کی زبانی مجھے علم ہوا کہ اس گاؤں کے کھوجی نے کھرا پکی سڑک تک پہنچا دیا تھا حالانکہ اس نے گھوڑی کو سارے گاؤں میں اس طرح گھمایا اور بھگایا تھا کہ اس کے تعاقب میں آنے والوں کے ساتھ ہی اس کی گھوڑی کا کھرا بھی گم ہو جائے۔ لیکن کھوجی بڑا ہوشیار ہے۔ یہ تو خدا کا شکر ہوا کہ چونی لال نے کوئی لالچ نہیں دیا ورنہ یہ بھی ممکن تھا کہ وہ چونی لال ہی کو پھنسا دیتا۔

بہرحال قصہ مختصر اس پکی سڑک کے بعد ان لوگوں کا خیال صرف ہمارے ہی گاؤں تک جا سکتا تھا۔ اب انہوں نے یہاں پنچایت بٹھائی تھی۔

اس دور میں جیسا کہ میں نے پہلے بتایا پولیس بھی براہ راست کسی ملزم کی ماں بہن کو تنگ نہیں کرتی تھی۔ یہ سکھ بھی ہمارے علاقے کے زمینداروں کے پاس آئے تھے۔ انہیں امید تھی کہ سکھ ہونے کے ناطے ہمارے گاؤں کے سکھوں سے انہیں کوئی مدد مل جائے گی۔ لیکن ہمارے گاؤں کے سکھوں نے انہیں بتا دیا کہ وہ ان کے کہنے پر یقین نہیں کریں گے۔

انہوں نے اس گاؤں کے مشتبہ آدمیوں کو اپنے طور پہ بلا کر ان سے درخواست کی تھی کہ وہ گھوڑی واپس موڑ دیں۔ میرے چچا نے اقرار کر لیا تھا کہ گھوڑی اس نے نکالی ہے لیکن یہ کہہ دیا تھا کہ وہ "ہاں نہیں" "نہیں موڑے گا۔"

کچھ بھی ہو اب معاملہ گاؤں کی عزت کا تھا۔ ہمارے گاؤں کے سرداروں نے پہلے تو چچا کی منت سماجت کی پھر اسے کہا کہ کر دے۔

چوری اور سینہ زوری (یعنی ڈاکہ) میں دھوکہ دہی کی واردات کے اجزا شامل کر لیے جائیں تو اغوا کی واردات جنم لیتی ہے۔ یہ ایک فری اسٹائل جرم ہے جس میں کوئی شخص کسی بھی زندہ یا مردہ چیز کو اپنے باپ کا مال سمجھ کر اٹھا کر لے جاتا ہے۔ ہوائی جہاز اس معاملے میں بڑا بدقسمت ٹھہرا۔ اب تک بے شمار ہوائی جہاز اغوا ہو چکے ہیں ہو رہے ہیں اور شاید ہوتے بھی رہیں گے کیوں جہاں اغوا کو روکنے والی تنظیمیں پوری سیریس ہو کر رہی ہیں وہاں جہاز کو اغوا کرنے والے بھی نت نئے طریقوں سے وارداتوں کو کامیاب بنانے کی کوشش میں مصروف ہیں۔

جہاز کا اغوا مطالبات منوانے کا ایک کامیاب ذریعہ ہے۔ اور اگر یہ ذریعہ مزید فائدہ مند ثابت ہوا تو شاید دنیا کا ہر شخص ہائی جیکر بن جائے۔ معمولی معمولی بات کو منوانے کے لئے لوگ جہاز کا اغوا کرنا شروع کر دیں گے۔ بیوی روٹھ کر میکے جا بیٹھی ہے تو شوہر کسی ہوائی جہاز کو اغوا کر کے مسافروں کے بدلے اپنی سسرال سے بیوی کی رہائی کا مطالبہ کرے گا۔ شوہر اگر دوسری شادی

WWW.PAKSOCIETY.COM
Scanned PDF

رچا رہا ہے تو ہیوی کسی جہاز کا اغوا کر کے اس شادی کو روکنے کا مطالبہ کرے گی۔ شوہر اپنی دوسری بیوی کے حسین جلوؤں میں گم پلاسٹک کے پھیروں کا سہرا باندھے نکاح نامے پہ انگوٹھا لگانے کی تیاری کر رہا ہوگا کہ اچانک حکومت کی طرف سے نہایت فنی قسم کے احکامات صادر ہوں گے۔

"ٹھہرو! یہ شادی نہیں ہو سکتی، کیونکہ اس شادی سے چار سو بیس مسافروں کی جان اور کروڑوں روپے کا جہاز خطرے میں ہے۔"

شادی کی رسومات اچانک رک جانے سے عین ممکن ہے کہ دولہا کی سانس بھی رک جائے مگر ایسی شادی کو روکنا لازم ہے۔ کیونکہ عین ممکن ہے کہ ہوائی جہاز کی اس پرواز میں — دو وزیر — دو سفیر — دو مشیر اور دو فقیر سفر کر رہے ہوں۔ وزیر سفیر اور مشیر تو خیر بہتے ہی رہتے ہیں۔ لیکن پہنچے ہوئے فقیروں کو منزل پہ پہنچانا نہایت ضروری ہے۔

اگر ہائی جیکنگ اسی تیز رفتاری سے ہوتی رہی تو وہ وقت بھی بہت جلد آئے گا۔ جب ایک ہی پرواز پہ متعدد ہائی جیکر سوار ہو جائیں گے۔ ایک ہائی جیکر کپتان کو ہینڈز اپ کرائے گا تو دوسرا پیچھے سے آ کر پہلے ہائی جیکر کی گردن پر اسٹین گن رکھ دے گا۔ تیسرا دور کھڑا ہو کر اعلان کرے گا کہ اس کے ہاتھ میں کوئی کھلونا نہیں بلکہ اصلی گرنیڈ ہے۔ ایک ہائی جیکر جہاز کو مشرق کی طرف لے جانے کا اعلان کرے گا تو دوسرا مغرب کی طرف رخ موڑنے کا حکم دے گا اور تیسرا ہائی جیکر اٹھ کر مجبوراً اعلان کرے گا۔ "خواتین و حضرات توجہ فرمائیے۔ مسافروں سے التماس ہے کہ وہ تمام مسافر جو اس پرواز کو اغوا کرنے کی نیت سے سوار ہوئے ہیں۔ فوراً کاک پٹ میں پہنچ جائیں تاکہ باہمی مذاکرات کے بعد جہاز کے رُخ کا تعین کیا جا سکے۔"

ہوائی جہازوں کا اغوا روکنے کے لئے ہزاروں جتن کئے جا چکے ہیں مگر ہوائی جہاز ہیں کہ اغوا ہونے سے باز ہی نہیں آتے۔ مسافروں کی مکمل جانچ پڑتال کے بعد بھی بم اور گرنیڈ جہاز کے اندر پہنچ جاتے ہیں۔ اب تو جہازوں کا اغوا روکنے کے لئے صرف یہی ترکیب رہ گئی ہے کہ تمام مسافران ایک نیکر اور بنیان یا پیراکی کا لباس پہن کر جہاز میں داخل ہوں

اور ہر مسافر کو اپنے اپنے علاقے کے تھانیدار سے یہ سرٹیفکیٹ بھی پیش کرنا لازمی قرار دیا جائے کہ یہ شخص یا اس شخص کے خاندان کے کسی فرد نے پہلے کسی ہوائی جہاز کے اغوا کی واردات میں شرکت نہیں کی ہے۔ نیز یہ شخص نہ تو اپنی زندگی سے بیزار ہے اور نہ ہی دل میں کوئی ایسی آرزو رکھتا ہے جو جہاز کے اغوا کے بغیر پوری نہ ہو سکے۔ یہ شخص ایسا رزق بھی نہیں کھاتا جو کسی پرواز کے دوران گڑبڑ پیدا کرنے کے بعد حاصل ہو۔

یقین کامل ہے کہ اگر سرٹیفکیٹ اصلی ہوا اور بغیر رشوت کے حاصل کیا گیا تو جہازوں کے اغوا کے امکانات صفر فی صد رہ جائیں گے اور ہائی جیکر یہ کاروبار چھوڑ کر سڑکوں کے کنارے جوتے پالش کرنے کا دھندا اپنانے پر مجبور ہوں گے۔

وہ ان سے پیسے لے کر گھوڑی واپس موڑ دے لیکن چچا نے انہیں بتایا کہ گھوڑی اب اس کے ہاتھ سے نکل چکی ہے۔ ہمارے گاؤں کے سردار یہ سمجھتے تھے کہ چچا سچ بول رہا ہے۔

انہوں نے دوسرے گاؤں سے آنے والوں سے کہا کہ وہ ان کا نقصان پورا کرنے کے لئے تیار ہیں۔ لیکن یہ لوگ بضد تھے کہ وہ پیسے نہیں لیں گے اور واپس لیں گے۔ انہوں نے جب پنچایت ہی میں میرے چچا کو دھمکیاں دیں تو ہمارے گاؤں کا سردار بوٹا سنگھ جو سکھوں میں بڑا معزز سمجھا جاتا تھا اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے دوسرے گاؤں سے آنے والے زمینداروں کے سربراہ ایشر سنگھ کو مخاطب کر کے کہا۔ "ایشر سیہاں! میرے سامنے تمہاری یہ جرأت کیسے ہوئی کہ تم میرے گاؤں کے کسی آدمی کو دھمکی دے رہے ہو۔ چپ چاپ واپس لوٹ جاؤ۔ اب ہم نقصان بھی پورا نہیں کریں گے اور پانہیں بھی نہیں موڑیں گے۔"

زمیندار ایشر سنگھ بڑا زمانہ شناس آدمی تھا۔ اس نے ایک دنیا دیکھی تھی اور محسوس کر سکتا تھا کہ اگر اس نے اب مزید کوئی غلط بات کہہ دی تو یہ لوگ اس کی ٹھکائی بھی کریں گے۔

اس نے سردار بوٹا سنگھ سے کہا۔ "بوٹا سیہاں! میں تو سکھ بھائی سمجھ کر تمہارے پاس چلا آیا تھا۔ اگر تم نے بھی ان لوگوں کا ساتھ دینا ہے تو.... خیر میں دیکھ لوں گا۔"

WWW.PAKSOCIETY.COM
Scanned By

اتنا کہہ کر وہ اٹھ کھڑا ہوا اور اس کے ہمراہ آنے والے بھی اس کے ساتھ ہی [illegible] گئے۔ بات اب گاؤں کی عزت پہ آگئی تھی۔ بوٹا سنگھ نے میرے چچا سے کہہ دیا کہ اب [illegible] اس میں ہے کہ وہ گھوڑی واپس نہ موڑے۔

بوٹا سنگھ چچا کو یہ بات نہ بھی کہتا تو بھی گھوڑی کبھی واپس نہ جاتی۔ میں اپنے چچا کو [illegible] آج تک اس سے کوئی مائی کا لال کسی بھی قسم کی برآمدگی نہیں کر سکا تھا۔ اب تو خیر [illegible]

چچا میری تیمارداری کو آیا تھا۔ کافی دیر بعد اٹھ کر چلا گیا۔ ہم سب ایک ہی گھر میں رہتے تھے۔ میرے علاوہ تین بھائی اور ایک بہن تھی۔ بہن تو بیاہی ہوئی تھی اور یہاں سے دور ایک اور گاؤں میں رہ رہی تھی۔ دو بڑے بھائی والد کے ساتھ کھیتی باڑی میں ہاتھ بٹاتے تھے اور ایک مجھ سے چھوٹا تھا۔ والد صاحب کو ساری زندگی یہی دکھ رہا کہ وہ اپنی تمام اولاد کو اس ماحول سے محفوظ رکھنے کے باوجود مجھے نہ بچا سکے۔

رات کو وہ آئے تو مجھے پھر سمجھانا شروع کر دیا۔ لیکن وہ نہیں سمجھ سکتے تھے کہ شیطان جب انسان پر غلبہ پا لے تو پھر ایسی نصیحتیں کسی کام نہیں آیا کرتیں۔ اِلّا یہ کہ کوئی ٹھوکر ہی آدمی کو سنبھالا دے سکے۔

میں نے مہندر سے اتوار کے روز ملنے کا وعدہ کیا تھا۔ ہفتے کے دن تک میری تمام توانائیاں واپس آ چکی تھیں اور میں خود کو پھر سے تازہ دم محسوس کرنے لگا تھا۔ اس دوران مجھے یہی امید تھی کہ پولیس کسی بھی لمحے آئے گی اور چچا کو گرفتار کرنے کے لیے جائے گی۔ ایسا اکثر ہوتا رہتا تھا پولیس آتی اور چچا کو لے جاتی تھی۔ اس کے ریمانڈ لیتے۔ لیکن آج تک مال برآمد نہ ہونے کی وجہ سے میرا چچا ہمیشہ حوالاتی ہی رہا۔ اسے کبھی سزائے قید نہیں سنائی گئی تھی۔

الیشر سنگھ نے کچی گولیاں نہیں کھیلی تھیں۔ وہ جانتا تھا کہ ارد گرد کے سو پچاس دیہاتوں میں اس کا بڑا نام ہے اور اگر پولیس جٹتے سے گھوڑی برآمد نہ کروا سکی تو اس نام کو بٹہ لگے گا۔ اس نے یہ معاملہ خود ہی نمٹانے کی ٹھان لی تھی۔

اس دوران چچا نے مجھے پھر سے اگلی واردات کے لئے تیار کر لیا تھا۔ پہلی واردات [illegible] عمل اسے بڑا پسند آیا تھا اور مکمل اور بہادر چور کو بھی دیکھ لیا تھا۔ میں نے چچا سے [illegible] کی باتیں کیں لیکن اشارتاً بھی مہندر کا ذکر نہ کیا۔

[illegible] نے ابھی تک مجھے یہ نہیں بتایا تھا کہ گھوڑی اس نے کہاں پہنچا دی ہے۔ شاید اسے یہ [illegible] تھا کہ اگر پولیس مجھے بھی پکڑ کر لے گئی یا میرا ریمانڈ لے لیا گیا تو میں تشدد برداشت نہیں [illegible] کروں گا اور پولیس کو بتا دوں گا۔ یہ بات تو پنچایت ہی میں الیشر سنگھ نے بتا دی تھی کہ جٹا اکیلا نہیں تھا۔ کوئی اور بھی اس کے ساتھ تھا۔ لیکن ہمارے دیہاتوں میں بدمعاشی کے مروجہ اصولوں کے مطابق نہ تو بوٹا سنگھ نے دریافت کیا کہ وہ "کوئی اور" کون تھا؟ نہ ہی چچا نے بتایا۔

اتوار کا دن میں نے مہندر کو ملاقات کے لئے یونہی نہیں کہہ دیا تھا۔ ہمارے گاؤں میں "ماتا کا سونا" کا عرس ہفتے کے روز شروع ہو رہا تھا اور میرے پاس اس عرس میں شمولیت کی آڑ میں یہاں سے غائب ہونے کا موقع موجود تھا۔

میں اتوار کی شام ہی کو میلے میں شمولیت کے لئے گھر سے نکل گیا۔ میلہ خاصا بھرا ہوا تھا۔ گرد و نواح کے دیہاتوں سے ہزاروں کی تعداد میں لوگ یہاں آئے ہوئے تھے۔ تھیٹر وغیرہ لگے تھے۔ میں چپ چاپ وہاں سے نکل گیا۔ میں اندازے کے مطابق وقت مقررہ سے کچھ پہلے ہی وہاں پہنچ گیا لیکن خوشی سے میراں روواں روواں ناچنے لگا۔ جب میں نے مندر کے ایک کونے میں کھڑی مہندر کو دیکھا۔ شاید اس نے چھپ کر مجھے اس طرف آتے دیکھا تھا اور پیچھا نہ پہ سامنے آ گئی تھی۔ ہم دونوں مندر کی سیڑھیوں پر بیٹھ گئے۔ وہ میری اور میں اس کی خیریت دریافت کرنے لگا۔ میں ابھی تک اس سے کھل کر بات کرنے کا حوصلہ نہیں پا رہا تھا۔

رات قدرے اندھیری تھی لیکن مہندر کا وجود اپنی مکمل تپش کے ساتھ روشنی بن کر میری رگوں میں اترنے لگی تھی جو اس روز رات کے وقت ہوئی تھی۔ اس لمحے میرے اندر نجانے کیسے ایک شیطانی خیال پیدا ہونے لگا تھا۔ میرے دونوں ہاتھ بے اختیار مہندر کی طرف بڑھے۔

WWW.PAKSOCIETY.COM
Scanned PDF

لیکن وہ بڑے اطمینان سے ایک طرف بیٹھ گئی۔

"چوہدری! شاید تم نے اس رات کا وعدہ بھلا دیا ہے۔" اس نے کہا اور میں لاجواب رہ گیا۔ میرے دونوں پھیلے ہوئے ہاتھ ٹوٹی ہوئی ٹہنیوں کی طرح جھک گئے۔

"نہیں مہندر!" میں نے بڑی مضبوطی سے کہا۔ "میں مرد ہوں جو قول دیا پورا کروں گا۔ مجھے معاف کر دینا۔ میں بہکنے لگا تھا۔ تم نے مجھے سنبھال لیا۔"

"چوہدری! میرا واسطہ زندگی میں بڑے بڑے جبر دؤں سے پڑا ہے۔ جنگوان جانے میں کیوں تیری طرف کھنچتی چلی جا رہی ہوں۔ لیکن خدارا میرے اعتماد کو کبھی دھوکہ نہ دینا۔" ایک لمحے کے لئے رک کر اس نے میری آنکھوں میں جھانکا۔ "دیکھ چوہدری! میں تیرے لئے اپنا دھرم بدل لوں گی۔ لیکن یاد رکھ جب تک میرے ساتھ پھیرے نہیں لگوائے گا۔ میرا جسم تجھ پر حرام ہے۔"

"بس مہندر! خدا کے لئے اب اور کچھ نہ کہنا۔" میں نے اسے کہا۔

ہم دونوں کو ابھی بہت کچھ کہنے لکھنے نہیں تھے۔ لیکن ایک دوسرے کے جذبات بخوبی جان اور سمجھ سکتے تھے۔ مہندر نے میری پشیمانی کو محسوس کر لیا تھا۔ جو ایک بچھیا دا سا مجھے اس بے اختیار حرکت کے سبب لاحق تھا۔ اس نے مجھے اس کی اذیت سے نجات دلانے کے لئے میرا دھیان دوسری طرف لگا دیا۔

مہندر مجھ سے اپنے اور میرے گاؤں کی باتیں کرتی رہی۔ میں نے اسے ساری کہانی سنا دی۔ اس کی زبانی مجھے علم ہوا کہ میرا اندازہ صحیح تھا۔ مہندر نے مجھے بتایا کہ اس دوران اس کا باپ چونی لال میرے چچا سے مل کر اسے آگاہ کر چکا ہے کہ الیشر سنگھ اس کے خلاف کیا منصوبے بنا رہا ہے۔

چچا نے ان تمام واقعات کی مجھے خبر نہیں ہونے دی تھی۔ نہ ہی اس نے چونی لال کی ملاقات مجھ سے کروائی تھی۔ یہ تمام باتیں ہم اس لئے کر رہے تھے کہ مجھے اور کچھ سوجھتا ہی نہیں تھا ورنہ مجھے قطعاً ایسی باتوں سے دلچسپی نہیں تھی۔

میں تو چاہتا تھا کہ ہم دونوں صرف اپنے متعلق باتیں کریں۔ اپنے مستقبل سوچیں اور بس۔

قریباً آدھی رات ہماری باتوں کی نذر ہو گئی۔

تب مہندر نے مجھے وقت کا احساس دلایا۔ میں محسوس کر سکتا تھا کہ وہ بھی طوعاً کرہاً مجھ سے الگ ہو گی ورنہ تو اس کا جی نہیں چاہتا تھا۔ ہمارے اختیار میں ہوتا تو دونوں اسی طرح بیٹھے ساری زندگی باتیں کرتے رہتے۔

"چچا جی عموماً اس وقت گھر کا ایک چکر لگایا کرتا ہے۔" اس نے مجھے کہا۔ "اور مجھے نہ دیکھ کر وہ پریشان ہو جائے گا۔"

خود مجھے بھی احساس ہونے لگا تھا کہ چچا جو میرے ساتھ ہی میلے میں آیا تھا مجھے ڈھونڈ رہا ہو گا۔ میں نے اس سے پوچھا کہ اب دوبارہ ملاقات کی کیا صورت ہو گی۔ اس نے مسکرا کر میری طرف دیکھا اور اپنے دوپٹے کے پلو سے انگلی مروڑتے ہوئے بولی۔ "جب مجھے یاد کرو گے۔ جہاں بلاؤ گے آ جاؤں گی۔"

میں میلے سے اس کے لئے مٹھائی لے کر آیا تھا۔ لیکن وہ جوں کی توں رکھی تھی۔ جاتے ہوئے مہندر وہ مٹھائی ساتھ لے گئی۔ میں سمجھتا تھا کہ اسے مٹھائی بڑی چھپا کر رکھنی پڑے گی۔ مجھے پریشانی اس بات کی تھی کہ اب میرا چچا تو اس گاؤں میں آنے سے رہا کہ میں اس کے ساتھ یہاں آ کر مہندر سے مل لیا کروں گا۔ نہ ہی میرے پاس کوئی ایسا پیغامبر تھا کہ جس کے ذریعے اسے کوئی اطلاع کر سکتا۔ بہرکیف یہ مسئلہ مہندر کا نہیں میرا تھا۔

میں نے پچھلے دو دنوں میں میلے میں آ کر لوک داستانیں گانے والوں سے بہت کچھ سیکھا اور مرزا صاحباں سن لی تھی اور یہ جان لیا تھا کہ سچے عاشقوں کے لئے کوئی رکاوٹ باقی نہیں رہتی۔

پھر میری مردانہ غیرت نے مجھے جھنجھوڑ کر کہا کہ اگر مہندر ایک لڑکی ہو کر میرے ایک اشارے پر ہر جگہ آنے کے لئے تیار ہے تو میں اس پر اپنی کمزوری کیوں ظاہر کروں۔

"مہندر! میں خود تم سے ملنے آؤں گا۔" اس لمحے مجھے اپنی آواز بالکل اجنبی اور بدلی ہوئی دکھائی دے رہی تھی۔ "دنیا کی کوئی طاقت مجھے اور تمہیں ملنے سے روک نہیں سکے گی۔"

WWW.PAKSOCIETY.COM
Scanned By

اس کے منہ کہنے کے باوجود میں اسے گاؤں تک چھوڑنے گیا۔ گاؤں کے باہر کھیتوں کے سلسلے کے نزدیک ہم رُک گئے۔ تمام راستے ہم دونوں بالکل خاموش رہے تھے۔ مہندر نے میری طرف دیکھا شاید کہہ رہی تھی کہ اب ہمیں الگ ہو جانا چاہیئے۔ لیکن بیچاری کی زبان نہ کھل سکی۔

میں نے ہی ہمت کی۔ "اچھا مہندر..... اللہ بیلی"

میرے منہ سے نکلا تو وہ اچانک میری طرف گھومی اور دیوانہ وار مجھ سے لپٹ گئی۔ مجھے اس کی حرکت نے ستہ سدر ہی تو کر دیا میں محسوس کر سکتا تھا کہ مہندر کے دل پر کیا گزر رہی ہے۔ بڑی آہستگی سے میں نے اسے خود سے الگ کیا۔

اس کی خوبصورت آنکھوں میں تیرتی نمی نے مجھے تڑپا کر ہی تو رکھ دیا تھا۔

"چودھری! مجھے بھول نہ جانا" کہہ کر وہ میری طرف دیکھے بغیر واپس مڑی اور تیزی سے گاؤں کی سمت چلی گئی۔

میرے منہ سے ایک لفظ بھی نہ نکل سکا۔ میں حدِ نظر تک اسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ پھر بوجھل قدموں سے واپس لوٹ آیا۔

میلہ اپنے جوبن پر تھا۔

میں سرخ بکائن گھر پہنچا۔ گھر میں سب لوگ سو رہے تھے۔ والدہ کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے یہی سمجھا کہ میں میلے سے واپس آیا ہوں۔ چپ چاپ اپنی چارپائی پر لیٹ کر میں مہندر کے خیالوں میں کھو گیا۔ نجانے کب مجھے نیند کی دیوی نے اپنی آغوش میں سمیٹ لیا۔ صبح جب آنکھ کھلی تو باہر دھوپ صحن میں اتر آئی تھی۔ چچا تھوڑی دیر کے بعد ہی آ گیا۔ "کہاں غائب ہو گئے تھے اس نے آتے ہی سوال کیا۔

میں نے بہانہ بنا دیا کہ ایک تھیٹر دیکھنے چلا گیا تھا اور وہاں سے واپس آ کر سو گیا۔

"کمال ہے" — چچا نے کہا "یہی تھیٹر تو میں نے بھی دیکھا تھا تم کہاں تھے"

میں نے پھر ایک بہانہ کر دیا۔ والد صاحب اور بھائی کھیتوں پہ جا چکے تھے۔ چچا نے [illegible] جانا اور مجھے اگلی واردات کے لئے تیار کرنے لگا۔ اس مرتبہ چچا نے مجھے جو واردات بتائی وہ [illegible] اور ہی شکار میں ڈال گئی۔ ہم نے نہ دیکی قصبے میں سرکاری خزانہ لوٹنا تھا۔ اس کے لئے [illegible] اور لوگ بھی ہمارے ساتھ شامل ہو رہے تھے۔

[illegible] دنوں پنجاب میں فرنگی کے خلاف زیر زمین تحریکیں بھی سرگرم عمل تھیں۔ انگریز افسر [illegible] اور کبھی کبھی سرکاری خزانہ لٹنے کے واقعات سننے کو ملتے رہتے تھے۔ جس طرح کی واردات چچا مجھے بتا رہا تھا۔ وہ مجھے اسی سلسلے کی ایک کڑی محسوس ہوئی لیکن میں نے اشارتاً بھی [illegible] کا ذکر چچا سے نہ کیا۔ البتہ میرا تجسس ان لوگوں کو دیکھنے کے لئے خاصا بڑھ گیا جو اس واردات میں ہمارے ساتھی بننے والے تھے۔

"بچہ! یہ بھیڑ بکریاں تو معمولی چور بھی کھول لیتے ہیں۔ جوان آدمی بڑا ہاتھ مارتے ہیں۔ لمبا ہاتھ — تو نگڑا ہو جا" اس نے مجھے بلاشیری دلائی اور میں تگڑا ہو گیا۔

پانچویں روز رات گئے جب میں اور چچا اپنے ڈیرے پہ سو رہے تھے تین اجنبی ہم سے آ گئے۔ ایک میری عمر کا سکھ تھا اور باقی دونوں نے اپنے نام مسلمانوں والے بتائے۔ یہ [illegible] ہی بہتر جانتا تھا وہ کون تھے۔ چچا نے ان سے میرا تعارف کروایا اور انہیں میری پچھلی واردات بھی سنائی۔ یہ لوگ گھوڑیوں پر بیٹھ کر آئے تھے۔ انہوں نے چچا کو کچھ سمجھایا اور ہم نے اگلی شام کو [illegible] میں ملاقات کے لئے ایک جگہ طے کر لی۔

روانگی سے پہلے وہ ہمیں دو ریوالور اور خاصی گولیاں دے گئے۔ ہم دونوں چچا بھتیجا انہیں چھوڑنے کے لئے گاؤں سے باہر تک گئے تھے۔

"بچہ! اس کھلونے کا استعمال بھی سیکھ لے۔ ہر جگہ ڈانگ ہی کام نہیں آتی۔ یہ طمنچہ بھی کبھی کبھی بہت ضروری ہو جاتا ہے" واپسی پہ جب ہم ڈیرے پہ پہنچے تو چچا نے مجھے بتایا۔

شام ڈھلنے سے پہلے پہلے میں اس کھلونے سے اچھی طرح کھیل چکا تھا۔ مجھے ریوالور

WWW.PAKSOCIETY.COM
Scanned By

ہاتھ میں پکڑ کر یوں محسوس ہونے لگا جیسے سکندر اعظم میرا ہی نام ہے اور یہ ساری دنیا کسی بھی لمحے میرے قدموں تلے آکر روندی جانے گی۔

شام ڈھلے ہم دونوں چچا بھتیجا گھوڑیوں پر سوار اسی سمت اڑے چلے جا رہے تھے جہاں ہمارے دوست ہمارے منتظر تھے۔ ریوالور اور گولیاں ہم نے کپڑوں کے نیچے چھپا رکھی تھیں۔ ان دنوں زیادہ تر لوگ گھوڑیوں پر سفر کیا کرتے تھے۔ اس لئے کسی نے ہم پر شک نہیں کیا۔

مجھے یہ اندازہ ہوا کہ ہم نے رات کم از کم چالیس میل کا سفر تو ضرور طے کیا ہوگا۔ ہم صبح ہونے تک جس قصبے میں پہنچے وہ میرے لئے بالکل اجنبی تھا۔ قصبے کے باہر ہی ان تینوں میں سے ایک ہمارا منتظر تھا۔

وہ ہمیں قصبے کے باہر کھیتوں کے وسیع سلسلے میں بنی ایک حویلی میں لے آیا۔ میں نے اتنا لمبا سفر گھوڑی پر پہلی مرتبہ طے کیا تھا۔ اس لمبے سفر نے مجھے تھکا دیا تھا۔ یہاں ہمارے لئے آرام دہ بستروں کا بندوبست موجود تھا۔ میں تو بستر پر گر کر ہی بے سدھ ہو کر لیٹ گیا اور دنیا جہان کی کوئی خبر مجھے نہ رہی۔

صبح جب ایک شخص نے مجھے جھنجھوڑ کر جگایا تو دھوپ نکل آئی تھی۔ چچا کسی "کام" سے گیا ہوا تھا۔ مجھے بڑی بھوک محسوس ہو رہی تھی۔ نہا کر جب میں دوبارہ وہاں پہنچا تو میرے لئے بیماری ناشتہ تیار تھا۔ میں نے ڈٹ کر ناشتہ کیا اور جب فراغت ہوئی تو چچا بھی "کام" سے لوٹ آیا۔

اس کی آمد ایک اور اجنبی کے ساتھ ہوئی تھی۔ ان لوگوں کے وہاں آتے ہی سب اکٹھے ہو گئے۔ میرا چچا اور وہ اجنبی اس گاڑی کا پروگرام معلوم کرنے گئے تھے۔ اور چچا کو وہ لوگ بطور خاص موقعہ دکھانے لے گئے تھے۔ ان کی گفتگو سے مجھے اس بات کا تو پکا یقین ہو گیا کہ یہ لوگ کسی باقاعدہ گروہ کے ارکان ہیں اور میرے چچا کو اس گروہ میں امتیازی حیثیت حاصل ہے۔

"بچہ! تگڑا ہو جا، آج سہ پہر کو جانا ہے"۔ اس نے اپنے معمول کے لہجے میں مجھے مخاطب کیا۔

"ٹھیک ہے چچا! میں تیار ہوں"۔ میں نے کہا۔

دوپہر کا کھانا ہم سب نے اکٹھے کھایا۔ کھانے کے اختتام پر چچا نے وہاں موجود تین اور آدمیوں کا تعارف مجھے کرایا۔ اس کے بعد ہم سب لوگ پیدل ہی چل پڑے۔ ہماری منزل اس قصبے سے [illegible] میل دور ایک سڑک کا موڑ تھی۔

[illegible] وقت سے قریباً دس پندرہ منٹ پہلے ہی ہم وہاں پہنچے تھے۔ سڑک کے دو رویہ گھنی جھاڑیاں اُگی ہوئی تھیں جن میں چھپے ہم اس سرکاری کار کے منتظر تھے جس میں خزانہ آ رہا تھا۔

جس جگہ ہم لوگوں نے ناکہ بندی کی تھی اس کے ساتھ ہی جو موڑ گھومتا تھا اس پر میرے چچا کے ساتھیوں نے بڑے بڑے پتھر رکھ کر اسے بند کر دیا تھا۔ شاید انہیں یقین تھا کہ اس سڑک سے اور کوئی ٹریفک نہیں گزرے گی۔

میرے لئے یہ دوسری اور انتہائی خطرناک واردات تھی۔ ہم لوگ دن دیہاڑے سرکاری خزانے پر ڈاکہ مار رہے تھے جس میں یقیناً مسلح محافظ بھی موجود ہوں گے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ میں بڑا خوفزدہ تھا۔ لیکن یہاں ان لوگوں کے سامنے بزدلی کا اظہار بھی نہیں کر سکتا تھا۔

انتظار کا ایک ایک لمحہ بڑا جان لیوا اور اذیت ناک تھا۔

خدا خدا کر کے ہماری مراد بر آئی جب یہاں سے ساٹھ ستر گز دور ایک درخت پر چڑھے ہمارے ایک ساتھی نے ہوا میں زور زور سے رومال ہلا کر ہمیں اس بات کا سگنل دیا کہ کار آ رہی ہے۔

"بچہ تگڑا ہو جا" چچا نے جو میرے ساتھ ہی موجود تھا میری پیٹھ پر ہاتھ مار کر مجھے تھپکی دی۔

ہم نے اپنے ریوالور فائرنگ کے لئے بالکل تیار کر لئے اور ہوشیار ہو کر بیٹھ گئے۔ کار اب ہمیں تھوڑی تھوڑی نظر آنے لگی تھی۔ میرے دل کی دھڑکنیں بے قابو ہوتی جا رہی تھیں۔ کار درمیانی رفتار سے آ رہی تھی۔ جب وہ اچانک اس موڑ پر گھومی تو ڈرائیور نے آگے رکاوٹ دیکھ کر اتنی تیزی سے بریک لگائے کہ سب حیران ہی رہ گئے۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

ڈرائیور سے کچھ زیادہ پھرتی کا مظاہرہ ہم نے کیا اور ہوا میں فائرنگ کرتے ہوئے کار کو گھیرے میں لے لیا۔ چچا نے سب سے پہلے آگے بڑھ کر اگلا دروازہ کھولا اور اندر جھانکا ایک انگریز کی طرف ریوالور تان لیا۔ کار کی پچھلی سیٹ پر دو ہندوستانی سکھ سپاہی بیٹھے تھے۔ لیکن وہ اتنے بوکھلائے ہوئے تھے کہ اپنی رائفلیں ہی نہیں سنبھال سکے تھے۔ ڈرائیور [illegible]

ہم نے انہیں نیچے اترنے کا حکم دیا۔ چاروں ہاتھ اوپر اٹھائے باہر نکل آئے۔ انگریز [illegible] میں دکھائی دے رہا تھا۔ اس نے ہمیں انگریزی میں گالیاں بکنا شروع کر دیں۔ ابھی اس کے منہ سے بمشکل دو تین گالیاں ہی نکلی تھیں جب میرے چچا اور ہمارے ساتھ موجود سکھ کے ریوالوروں نے قریباً ایک ساتھ شعلے اگلنے شروع کر دیئے۔ میں محسوس کر رہا تھا کہ ان لوگوں کے دل میں انگریز کے خلاف زبردست نفرت موجود ہے۔ انہوں نے چار چار فائر انگریز پر کئے اور وہ زمین پر گرتے ہی دم توڑ گیا۔ دونوں ہندوستانی سپاہی بڑے خوفزدہ نظر آ رہے تھے۔

ہم نے ان کی پگڑیوں سے کس کر باندھ دیں اور انہیں جھاڑیوں میں پھینک دیا۔ انگریز کی لاش گھسیٹ کر ہم نے ان کے قریب ہی جھاڑیوں میں پھینک دی تھی۔ مجھے حیرانگی یہ ہوئی تھی کہ کسی نے ابھی تک کار کے ڈرائیور کو کچھ نہیں کہا تھا۔ پھر یہ حیرانگی بھی جلد ہی دور ہو گئی جب میں نے اسے دوسرے ساتھیوں کے ساتھ مل کر پتھر ہٹاتے دیکھا۔

یہ اس بات کا ثبوت تھا کہ وہ ہمارا ساتھی ہے!

تھوڑی دیر بعد ہم لوگ اسی کار میں سوار اڑے چلے جا رہے تھے۔ ایک جگہ پہنچ کر جو وارداتات کے مقام سے قریباً دو ڈھائی میل دور تھی ہم نے کار کھڑی کر دی۔ ڈرائیور نے ایک چابی سے پچھلی ڈگی کھول دی جہاں تین تھیلے نوٹوں کے بھرے ہوئے تھے۔

ایک چچا نے اور باقی تینوں ساتھیوں نے اٹھا لئے۔ ڈرائیور کو ایک طرف لے جا کر چچا نے کچھ سمجھایا وہ سر ہلاتا رہا۔ پھر کار جھٹکا کھا کر لے گیا۔ وہ شاید کار کو جھٹکا دینے لگانے لے جا رہا تھا۔

ہم لوگ قریبی کھیتوں کے سلسلے میں گھسے اور قریباً ایک گھنٹہ بعد اس جگہ پہنچ گئے جہاں

گھوڑے بندھے تھے۔ چچا نے وہ تھیلا کھول لیا اور نوٹوں کی درجنوں گڈیاں میرے اور اپنے کپڑوں میں ٹھونس کر باقی ان لوگوں کو تھما دیں۔ وہ چاروں آپس میں کچھ صلاح مشورہ کرتے رہے۔

پھر پندرہ منٹ بعد ہی ہم لوگ وہاں سے الگ الگ سمتوں کو چل دیئے۔ میں اور چچا تمام دن چلنے کے بعد گاؤں پہنچ گئے۔ یہ نوٹ ہم نے ڈیرے میں پہلے سے موجود خفیہ جگہوں پر چھپا دیئے۔

[illegible] سات آٹھ روز بعد ایک رات پھر سب لوگ ڈیرے پر جمع ہوئے۔ معلوم ہوا کہ پولیس نے پروئیر کے تمام بدمعاش گرفتار کر رکھے ہیں۔ لیکن ہمارے نام کسی کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھے۔ صبح تک وہ لوگ واپس چلے گئے۔ مجھے بالکل علم نہ ہو سکا کہ لٹے ہوئے خزانے کی باقی رقم کدھر گئی ہے۔

والدین مجھ پر کیا کنٹرول کرتے اب تو وہ بیچارے خود مجھے اپنی عزت کے لئے خطرہ محسوس کرنے لگے تھے۔ ڈیڑھ سال کے عرصے میں میری دھاک ہمارے ارد گرد کے سو پچاس دیہاتوں میں بیٹھ چکی تھی۔ اس دوران میں نے درجنوں پولیس ریمانڈ کاٹے تھے۔ لیکن اپنے چچا کا صحیح جانشین ہونے کا ثبوت دیا اور کبھی پولیس کو ایک پھوٹی کوڑی بھی برآمد نہ کروائی۔

اس دوران میں نے اپنی اور مہندر کی باقاعدہ ملاقاتوں اور پیغام رسانی کا ایک ذریعہ بھی تلاش کر لیا تھا اور وہ تھی حنیفاں!

حنیفاں کا سیدھا سا تعارف تو یہ ہے کہ وہ دائی تھی اور ہمارے دس پندرہ دیہاتوں میں قریباً ہر گھر اسے جانتا پہچانتا تھا۔ لیکن اس کی ایک خاص قابلیت کا علم عام لوگوں کو نہیں تھا صرف میری گینگ کے لوگ یہ جانتے تھے کہ وہ پولیس کے لئے مخبری کا کام بھی کرتی تھی اور کبھی کبھی یہ مخبری دو طرفہ ہو جایا کرتی تھی۔ وہ یوں کہ حنیفاں دونوں پارٹیوں کا وزن کرتی جس کا پلڑا بھاری ہوتا اسی طرف جھک جایا کرتی تھی۔

حنیفاں کے پاس گھروں کے اندر کی کئی کہانیاں ہوتی تھیں کسی کا پیغام کسی تک پہنچانا اس کا پیشہ تھا۔ بدمعاش لوگ اس سے عموماً یہ کام لیا کرتے تھے کسی بیچاری غریب لڑکی کو تاڑ لیتے اور حنیفاں

کا معرفت اسے بہلا پھسلا کر اس بدمعاش تک لے آتی۔ بعد میں جو کچھ ہوتا اس کو سب ہی بہتر سمجھتے ہیں۔

ایک روز جب میں ایک واردات سے واپس آیا تو حنیفاں مجھے راستے ہی میں مل گئی۔ اس کی آنکھوں میں

دنیا میں تھوڑا سا عرصہ گزارنے کے بعد میری جھجک ختم ہو چکی تھی اور میں ہر کسی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کر سکتا تھا۔

حنیفاں کو دیکھ کر مجھے خیال آیا کہ آخر کب تک یوں رات کے اندھیرے میں مہندر کے گھر جاتا رہوں گا۔ اس دوران ایشر سنگھ کے آدمی یہ جان چکے تھے کہ میں جتنے کا نہ صرف بھتیجا ہوں بلکہ اب اس کا ایک بازو بھی بن چکا ہوں۔ ہماری آپس میں دشمنی تھی۔ اگر کسی کو یہ شک بھی ہو جاتا کہ میں مہندر سے ملتا ہوں تو وہ میری جان لئے بغیر نہ ٹلتے۔ یہ بھی ممکن تھا کہ میرے بجائے مہندر بھی ان کا نشانہ بن جاتا تھی صرف یہ علم ہونے پر وہ مہندر کے ذریعے مجھے یہاں بلا کر اپنے جال میں پھانس سکتے ہیں۔ وہ مہندر کی جان کو آ جاتے اور میں جانتا تھا کہ مہندر مر جاتی لیکن کبھی ان کی بات نہ مانتی اور مجھے دھوکے سے بلانے پر رضامند نہ ہوتی۔

انکار کی صورت میں اسے جس انجام سے دوچار ہونا پڑتا اس کا تصور ہی میرے لیے بڑا اندوہناک تھا۔

یہی کچھ سوچ کر میں نے حنیفاں کو آج پہلی مرتبہ مخاطب کیا۔ میں ایسی گھٹیا عورتوں کو تو منہ لگانا بھی پسند نہیں کرتا تھا۔ اس سے پہلے خود حنیفاں کئی دفعہ مجھے کہہ چکی تھی کہ اس کے لائق کوئی خدمت ہو تو بتاؤں۔ میں اس "خدمت" کا مطلب اچھی طرح سمجھتا تھا۔ اور حنیفاں بھی یہ جانتی تھی کہ اس کے لیے مجھے اپنا احسان مند بنانا ضروری ہے۔

"مائی حنیفاں" میں نے اسے آواز دی۔

"جی سرکار" اس کی باچھیں تو اسی آواز پر کھل گئیں کہ میں نے آج پہلے اسے مخاطب کیا ہے۔

"شام کو میرے پاس آنا۔"

"جی سرکار" حنیفاں مائی ہم کسی کا حق نہیں مارتے۔ تمہیں تمہاری خدمت کا انعام ضرور دلائیں گی لیکن یہ بات یاد رکھنا کہ کبھی مہندر کو کبھی نہ ملنا۔"

"تم نے صرف میرا پیغام کبھی کبھی لے کر جانا ہے اور بس، اس کے علاوہ اس سے کبھی ملنے کی کوشش نہ کرنا۔ حنیفاں مائی

"جی سرکار" حنیفاں بڑی مکار عورت تھی۔ میرا موڈ دیکھ کر وقتی طور پر چپ ہو رہی۔ میں نے اپنی جیب سے پانچ روپے کا نوٹ نکال کر اسے تھما دیا۔ اس زمانے میں یہ بہت بڑا انعام تھا۔ حنیفاں نے پہلے تو نوٹ کی پھر نوٹ پکڑ لیا۔

میں جس زندگی میں قدم رکھ چکا تھا اس میں کسی بھی لمحے موت میرا گھیراؤ کر سکتی تھی۔ والد نے مجھ سے ایک طرح ناطہ توڑ لیا تھا اور ان کی مرضی اور اجازت کے بغیر میں مہندر سے شادی نہیں کر سکتا تھا۔ ملک کے سیاسی حالات روز بروز بدل رہے تھے۔ جتھے میں چور ڈاکو بن چکا تھا۔ لیکن مسلم لیگ کی سیاست سے میں بھی اپنے دیہات کے دوسرے لوگوں کی طرح متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔

SCAN PDL

میرے والد صاحب اپنے گاؤں میں مسلم لیگ کے سالار تھے اور ہم نے کانگرس کی دشمنی مول لے کر بھی ایک بڑا جلسہ اس علاقے میں مسلم لیگ کا کروا دیا تھا۔ حالات کچھ ایسے تھے کہ میں الجھ کر رہ گیا جبکہ دوسری طرف مہندر پچھلی دو تین ملاقاتوں سے کچھ بدلی بدلی دکھائی دینے لگی تھی۔ میں محسوس کر رہا تھا کہ اس میں وہ پہلے والی دلیری نہیں رہی۔

جوں جوں اس کی محبت میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا، وہ بزدل بنتی جا رہی تھی۔ پہلی بار جب حنیفاں کے پیغام پہنچانے پر مجھ سے ملنے آئی تو اس نے بڑی عجیب سی خواہش کا اظہار کیا:

"چوہدری مجھے آج ہی مسلمان ہونا ہے!" میں بھونچکا رہ گیا۔

میں محسوس ہی نہ کر سکا کہ جس روز سے میری اور مہندر کی ملاقات ہوئی تھی اس نے اپنے ہمسائے میں واقع مسلمان مولوی کے گھر آنا جانا شروع کر دیا تھا۔ ان مولوی صاحب کا ذکر وہ اکثر مجھ سے کیا کرتی تھی۔ لیکن مجھے یہ علم نہیں تھا کہ وہ اسلام کی حقانیت سے اتنی جلدی متاثر ہو جائے گی۔ پچھلی دو ملاقاتوں سے اس نے یہی کہنا شروع کر دیا تھا کہ اب جیسے بھی ممکن ہو میں اسے یہاں سے نکال کر لے جاؤں۔

میں حیرت سے اس کا منہ جھانکنے لگا۔ اس نے میرا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں تھام کر بڑے ملتجی لہجے میں کہا: "چوہدری میں نے تمہیں نہیں بتایا میرا باپ میری شادی کہیں طے کر رہا ہے۔ میں اسلام دھرم کو دل سے قبول کر چکی ہوں۔ میں چاہتی ہوں کہ مجھے موقع بھی آئے تو مسلمان ہو کر مروں۔"

مہندر کی اس بات نے مجھے خاصا جذباتی کر دیا۔ لیکن مجھ نہیں آ رہی تھی کہ اس کی یہ خواہش کیسے پوری کروں۔ اس نے غالباً میری دلی کیفیت کا اندازہ کر لیا تھا۔ مجھے چپ دیکھ کر بولی "چوہدری! میں نے مولوی صاحب سے کئی کہا تھا لیکن وہ ذمہ داروں کے خوف سے مجھے کلمہ نہیں پڑھا سکے اب تم بھی..."

"مہندر! خدا کے لئے... ایک لفظ بھی آگے نہ بولنا۔" میں نے اسے کہا۔

میں اب مہندر سے ملنے کے لئے گھوڑی پر بیٹھ کر جایا کرتا تھا۔ دشمن کا معاملہ تھا اور میرے لئے اب ہر طرف خطرات تھے۔ میں نے مہندر کا بازو پکڑا اور اسے گھوڑی پر بٹھا کر خود اس کے پیچھے بیٹھا اور گھوڑی کو ایڑ لگا دی۔ میرے ذہن میں ابھی کچھ واضح نہیں ہوا تھا۔ بس اتنا معلوم تھا کہ ہمارے نزدیک گاؤں کھوکھر لوپہ کی مسجد گاؤں کے [illegible] پر بنی ہوئی ہے اور وہاں کے مولوی صاحب بڑے اللہ والے تھے۔ گاؤں کے نزدیک میں گھوڑی سے اتر گیا لیکن مہندر کو اوپر بٹھائے رکھا۔ میں گھوڑی کی لگام پکڑے پیدل چلتا مسجد تک آ گیا۔ سارا گاؤں گہری نیند سو رہا تھا۔ چوکیدار کا دور دور تک نام و نشان دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

گھوڑی میں نے مسجد سے ملحق مولوی صاحب کے حجرے کے باہر کھڑی کی اور دروازے پر دستک دی۔ مولوی صاحب ابھی سوئے نہیں تھے۔ وہ پہلے سمجھے کہ ہم مسافر ہیں اور رات کو پناہ لینے آئے ہیں۔

انہوں نے ہمیں اندر آنے کو کہا۔ میرے ساتھ ہی مہندر بھی بے جھجک اندر داخل ہو گئی۔

"مولوی صاحب!" میں نے ان کے استفسار کرنے سے پہلے کہا۔ "یہ لڑکی جو میرے ساتھ آئی ہے، ہندو لڑکی ہے اور اپنی مرضی سے اسلام قبول کرنا چاہتی ہے۔ اسے مسلمان کر لیجئے۔" مولوی صاحب نے حیرانگی سے میری طرف دیکھا۔ میری بات کا انہوں نے کوئی جواب نہ دیا اور کچھ سوچ میں پڑ گئے پھر بولے "تم کون ہو؟"

میں نے انہیں اپنا تعارف کروایا۔ اب میرے چچا کے ساتھ میرا نام بھی مشہور ہونے لگا تھا۔ مولوی صاحب پہچان گئے۔

"اسلام اس نے قبول کرنا یا تم نے" انہوں نے میری آنکھوں میں آنکھیں گاڑیں۔

"اس نے" میں نے مہندر کی طرف اشارہ کیا۔

"تم باہر نکل جاؤ۔ میں اس سے تنہائی میں کچھ دریافت کرنا چاہتا ہوں۔" انہوں نے مجھے

Scanned with CamScanner

سختی سے کہا۔

"لیکن ....." میں نے کچھ کہنا چاہا تو وہ میری بات کاٹ کر بولے۔

"اگر تم باہر نہ گئے تو میں سمجھوں گا کہ تم اس لڑکی کو زبردستی اغوا کر کے لائے ہو اور اس ایک کے بعد دوسرا بڑا جرم کرنے لگے ہو۔ دیکھو چوہدری! تم بدمعاش ہو گئے، ڈاکو ہو گئے لیکن میں سوائے خدا کی ذات کے اور کسی سے ڈرنے والا نہیں۔ مجھے کوئی دھونس دھمکی نہ دینا۔ میں کسی کو زبردستی کلمہ پڑھا کر اپنے خدا کے سامنے ظالم اور گناہگار نہیں ٹھہرنا چاہتا۔"

میں ان کا مطلب سمجھ گیا تھا۔ یہ کوئی آج کل کے مولوی نہیں تھے۔ بڑے دبنگ اور اللہ والے تھے۔ انہوں نے کبھی کسی کے سامنے گردن جھکانا تو سیکھا ہی نہیں تھا۔ انہوں نے سچ کہا تھا واقعی وہ کسی غنڈے بدمعاش سے ڈرنے والے نہیں تھے۔

میں باہر نکل آیا۔ قریباً پندرہ بیس منٹ کے جان لیوا انتظار کے بعد بالآخر انہوں نے دروازہ مجھ پر کھولا۔ وہاں مہندر موجود نہیں تھی۔

"میں مطمئن ہوں۔ وہ میری بیوی کے پاس ہے۔ میری بیوی اسے غسل اور وضو کروا کر لائے گی۔" انہوں نے کچھ پوچھنے سے پہلے ہی وضاحت کر دی۔

مزید پانچ چھ منٹ گزر گئے۔ سامنے والے دروازے سے ایک بوڑھی عورت مہندر کا بازو تھامے اندر داخل ہوئی۔ یہ مولوی صاحب کی بیوی تھی۔ اس نے مہندر کو ہمارے سامنے والی چارپائی پر بٹھا دیا اور خود بھی اس کے ساتھ ہی بیٹھ گئی۔

"بیٹی! ایک مرتبہ پھر سوچ لو۔ تم پر جبر نہیں ہے۔ ہمارے دین میں کسی پر جبر نہیں کیا جاتا۔" مولوی صاحب نے اسے بڑے نرم لہجے میں کہا۔

"مولوی صاحب! میں نے سوچ سمجھ کر یہ قدم اٹھایا ہے۔ خدا کے لئے میرے صبر کو نہ آزمایئے۔" مہندر کی آواز میں جانے کیا سوز تھا کہ میں تڑپ کر رہ گیا۔

اس کے باوجود مولوی صاحب اور ان کی بیوی نے بار بار مہندر سے اقرار کروایا کہ وہ دل سے

اپنی مرضی سے کسی کے جبر کے بغیر یہ فیصلہ کر رہی ہے۔ تب انہوں نے "الحمد للہ" کہا اور قرآن پاک کی کچھ آیات پڑھ کر ان کا ترجمہ مہندر کو سمجھایا۔ ان آیات میں اسلام کے بنیادی اصول بتائے گئے تھے۔ اس کے بعد انہوں نے مزید پانچ سات منٹ مہندر کو اسلام کی حقانیت اور قوانین سمجھانے میں لگائے اور آخری مرتبہ پھر اس کی رضامندی طلب کرنے کے بعد اسے کلمہ پڑھوا کر مسلمان کر دیا۔

میرے علاوہ شاید مولوی صاحب بھی حیران ہی رہ گئے کہ اس نے کلمہ پہلے سے یاد کر رکھا تھا۔ پھر وہ دوسرا اور تیسرا کلمہ بھی خود ہی پڑھ گئی۔ یہ اس کی اسلام سے محبت کی انتہا تھی۔ اس نے مولوی صاحب کو بتایا کہ اس نے عربی کا ابتدائی قاعدہ بھی پڑھ لیا ہے۔ مولوی صاحب نے اس کا اسلامی نام مریم بی بی رکھا اور ہمیں جانے کی اجازت دے دی۔

شاید آپ لوگوں کو اس بات کا یقین نہ آئے کہ جب مہندر مریم بننے کے بعد باہر آئی تو میں نے اس کے چہرے سے نور کی شعاعیں پھوٹتی محسوس کی تھیں۔ بخدا ایسا پُرنور چہرہ میں نے زندگی میں اس کے بعد پھر کبھی نہ دیکھا۔ اس لمحے میرا دل اس کی عقیدت سے بھر چکا تھا۔ مجھے وہ کسی اور ہی دنیا کی مخلوق نظر آ رہی تھی۔ اس مرتبہ وہ میرے پیچھے بیٹھی۔ ہم نے تمام راستے کوئی بات نہ کی اور میں اسے اس کے گاؤں تک لے آیا۔

مریم نے گھوڑی سے اتر کر کہا "چوہدری! اب میں وہ ہندو لڑکی نہیں رہی۔ اگر تمہیں مجھ سے محبت ہے تو خدا کے لئے تم بھی دل سے مسلمان ہو جاؤ۔ یہ زندگی چھوڑ دو اور مجھے نکاح کر کے لے جاؤ۔ بخدا میں تمہارے ساتھ ہو کر بھی تمام زندگی تمہاری خدمت میں گزار دوں گی۔ اب میرے باپ کا گھر میرے لئے جہنم بنا رہے گا۔ وہاں بدمعاش لوگوں کا آنا جانا لگا رہتا ہے اور میں....." وہ خاموش ہو گئی۔

اس کی نظریں جھک گئیں۔ مجھے تو جیسے سکتہ ہو گیا تھا۔ پھر اس نے نظریں اٹھائیں اور میری آنکھوں میں جھانک کر بولی "تم نے میرا ہاتھ ہمیشہ اپنانے کے لئے پکڑا تھا۔ اگر مرد کے منہ سے

Scan x PDF
WWW.PAKSOCIETY.COM

تو یہ بات کبھی نہ بھولنا۔ اگلی مرتبہ جب آؤ گے تو مجھے ہمیشہ کے لیے آنا ہے۔ اچھا خدا حافظ"

یہ کہہ کر وہ تیز تیز قدموں سے اپنے گھر کی طرف چل دی اور میں مہوت سا محبت اور وفا کی اس عظیم دیوی کو جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ بخدا اس لمحے میں اپنے دل میں اس کے لئے جو جذبات محسوس کر رہا تھا آج بھی ان کا تصور میرے مردہ تن میں زندگی کی لہر دوڑا دیتا ہے۔

رات قریباً آدھی بیت چکی تھی۔ میں نے نور کے اس ہالے کو دور تک جاتے ہوئے دیکھا جب وہ اندھیرے کی چادر میں گم ہو گئی تو میں بوجھل قدموں سے واپس لوٹا اور اپنی گھوڑی پر بیٹھ کر اسے ایڑ لگا دی۔

اس روز واقعی یہ عزم کر کے لوٹا تھا کہ اگر والدین مریم سے شادی کے لئے نہ مانے تو میں اسے بیاہ کر کسی اور طرف نکل جاؤں گا۔ جلد یا بدیر آخر وہ میرے ماں باپ تھے مان ہی جاتے۔ مجھے علم تھا کہ چچا آج کل ایک بہت بڑا ہاتھ مارنے کے چکر میں ہے اور یہ کام بھی انہی لوگوں کے اشارے پر سرانجام کر رہے تھے جن کا بھید میں اپنی لاکھ کوشش کے باوجود نہیں پا سکا تھا۔

یہ لوگ بالکل اچانک چچا سے رابطہ قائم کرتے تھے۔ ان کی آمد میرے لئے اس بات کا اشارہ ہوتی تھی کہ میں یہاں سے اٹھ کر چلا جاؤں۔ ایک دو مرتبہ میں نے چچا کو کریدنے کی کوشش بھی کی لیکن اس نے میرے لاکھ مضمر ہونے کے باوجود مجھے ٹال دیا۔

"بچہ! ابھی تیرے کھیلنے کھانے کے دن ہیں تو ان چکروں میں نہ پڑا کر۔" وہ ہمیشہ ایک ہی جواب دیا کرتا۔

اس روز جب میں مریم سے مل کر واپس ڈیرے میں پہنچا تو چچا کو اچانک اپنا منتظر پایا۔ چچا پچھلے دو دنوں سے غائب تھا اور آج اچانک واپس آ گیا تھا حالانکہ اس نے ایک روز بعد واپس آنا تھا۔ اگر مجھے علم ہوتا کہ وہ یہاں ہے تو میں کبھی یہاں نہ آتا۔

"بچہ! رات تو تم کر کے آ نہیں رہے، چکر کوئی اور ہے۔ سچ سچ بتاؤ اتنی رات گئے کہاں سے آ رہے ہو۔" چچا نے بغیر کوئی لگی لپٹی رکھے مجھے سیدھا سوال پوچھ لیا۔ "دیکھو

مجھے امید ہے اس بات کا یقین ہے کہ تم اپنے باپ کے ساتھ تو جھوٹ بول سکتے ہو میرے ساتھ نہیں بولو گے۔ اس لئے تم جو بھی کہو گے میں یقین کر لوں گا۔ میرے اعتماد کو ٹھیس نہ پہنچانا۔ بعد میں اگر مجھے تمہارا جواب غلط معلوم ہوا تو تم تصور بھی نہیں کر سکتے مجھے کتنا دکھ ہو گا۔"

چچا مجھے اگر یہ سب کچھ نہ بھی کہتا تو بھی میں اسے سچ سچ بتا دیتا کیونکہ اس کے اور میرے تعلقات ایسے تھے کہ میں اس کے سامنے جھوٹ بولنے کی ہمت نہیں کر سکتا تھا۔ یوں بھی آج میرا دل اتنا بوجھل تھا کہ میں شدت سے کسی ہمراز کی ضرورت محسوس کرنے لگا تھا۔

میں نے اسے بلا کم و کاست ساری کہانی سنا دی۔ چچا کے ذہن میں تو چونی لال کی بیٹی ہی نہیں رہی تھی اور اس واقعے کو بھی اب تین سال ہو چلے تھے۔ اس نے میری کہانی پر کوئی تبصرہ نہ کیا۔ صرف اتنا کہا کہ اب جو وعدہ تم نے مریم سے کیا ہے مرد بن کر اسے پورا کرنا۔ پھر اس نے گفتگو کا رخ بدلتے ہوئے مجھے کہا کہ وہ کل میرا تعارف ان لوگوں سے کروائے گا جن سے ملنے کا مجھے ایک عرصے سے اشتیاق ہے۔ چچا نے مجھے بتایا کہ یہ لوگ وطن کی آزادی کے لئے فرنگی کے خلاف زیر زمین جنگ لڑ رہے ہیں۔ اس نے ان کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملا دیئے۔

تب میں جوان اور خاصا گرم جوش تھا۔ اتنی عقل نہیں تھی کہ ٹھنڈے دل و دماغ سے کچھ سوچ سکتا۔ اگر ذہن میں کوئی سوال پیدا بھی ہوتا اور چچا سے پوچھ ہی لیتا تو اس کا ایک ہی جواب ہوتا "تو ابھی بچہ ہے۔ یہ باتیں تیرے سمجھنے کی نہیں۔"

اگلے دن چچا کے کہنے کے مطابق وہ لوگ آ گئے۔ آج دو آدمی آئے تھے۔ ان دونوں نے میرے ساتھ خاصی بے تکلفی سے باتیں کیں اور مجھے سمجھایا کہ ان کے مقاصد بڑے عظیم ہیں۔ وہ ملک آزاد کروانے کے لئے یہ سب کچھ کر رہے ہیں۔ اس مرتبہ ہمارا ارادہ ایک ٹرین کے ذریعے جانے والی کرنسی کو لوٹنے کا تھا۔ ہمیں علی الصباح ان لوگوں کے ساتھ اس مشن پر روانہ ہونا تھا۔

انہوں نے ایک پستول اور خاصی گولیاں مجھے رات ہی کو دے دی تھیں۔ دونوں نے

WWW.PAKSOCIETY.COM
Scanned PDF

مجھے جو نام بتائے وہ یقیناً غلط ہوں گے۔ پھر بھی آپ کو بتائے دیتا ہوں۔ وہ تھے شربا اور خان۔ یعنی ان میں سے ایک ہندو تھا اور دوسرا مسلمان۔ حالانکہ میرے اندازے کے مطابق وہ دونوں مرہٹے سکھ تھے۔

ہم چاروں ٹرین کے ذریعے دوسرے ضلع میں شام گئے پہنچ چکے تھے۔ اگلی رات کو ہم نے ڈاکہ ڈالنا تھا۔ اس لئے ہم نے اس بات کا بندوبست کر لیا تھا کہ جو ٹرین ہمارا نشانہ بننے والی تھی اسے راستے میں ایک مطلوبہ مقام پر سگنل ڈاؤن کر کے روکنا ہے۔ اس سگنل کا کانٹا بدلنے والا بھی ان کا اپنا آدمی تھا۔

ہم اگلے روز شام سات بجے تک دو دو کی ٹولیوں میں مطلوبہ مقام پر پہنچ چکے تھے۔ ہم دونوں کے علاوہ وہاں چھ ساتھی اور موجود تھے۔ لیکن یہ سب میرے لئے اجنبی تھے۔ وہ دونوں خان اور شربا ان میں شامل نہیں تھے۔

ریلوے لائن سے قریباً ڈیڑھ دو فرلانگ دور ایک جگہ وہ کار ہمارے ساتھیوں نے چھپا رکھی تھی جس میں بیٹھ کر ہمیں ایک خاص مقام تک جانا تھا۔ اس کے بعد یہ کار بھی چھوڑ دینی تھی۔ اس زمانے میں اکا دکا لوگ ہی کار رکھ سکتے تھے۔ میرا دل گواہی دے رہا تھا کہ یہ کار بھی چوری کی ہوگی۔

ہمیں فراہم کردہ اطلاعات کے مطابق یہ چار پانچ ڈبوں پر مشتمل ٹرین تھی اور سرکاری خزانہ ایک جگہ سے دوسری جگہ اس پر منتقل کیا جا رہا تھا۔ مجھے بتایا تو نہیں گیا تھا لیکن اس بات کے قوی امکانات موجود تھے کہ اس ٹرین میں ان لوگوں کا کوئی آدمی بھی موجود ہو۔

خدا خدا کر کے آٹھ بجے ہمیں سگنل ڈاؤن کر کے ٹرین وقتِ مقررہ پر آ رہی ہے۔ پھر ٹرین نظر آ گئی۔ میں اور چچا اکٹھے ہی بیٹھے تھے۔ چچا نے میری پیٹھ پر ہاتھ مار کر حسبِ عادت مسکراتے ہوئے میری طرف دیکھا۔ جواب میں میں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں اسے یقین دلایا کہ میں تیار ہوں۔

ٹرین منصوبے کے مطابق روک لی گئی۔ ہم لوگوں نے گھیرا ڈال لیا۔ لیکن خلاف توقع ٹرین کے دو ڈبے غوجروں سے بھرے ہوئے تھے۔ یہ بات ہمارے علم میں نہیں تھی کہ عین وقت پر ان لوگوں کو ہمارے منصوبے کا علم ہو گیا تھا اور انہوں نے ہمیں دھوکے میں رکھ کر مارنا چاہا تھا۔

یہ سب تربیت یافتہ فوجی تھے۔ ہم نے ان پر فائرنگ شروع کر دی اور چاہا کہ اس فائرنگ کی آڑ میں نکل جائیں لیکن انہوں نے ہماری کوشش ناکام بنا دی۔ وہ ہماری فائرنگ کے دوران ہی بڑی تیزی سے ہمارے گرد گھیرا ڈال چکے تھے۔ پندرہ بیس منٹ کے معرکے میں ہمارے تین ساتھی مارے گئے۔ میرے چچا کے بازو میں گولی لگی تھی۔ میں نے بھاگنے کی کوشش کی لیکن قسمت اچھی ہوئی تھی۔ [illegible] گرفتار ہو گیا۔ ہمارا ایک ساتھی بچ کر نکل گیا تھا بعد میں وہ بھی پکڑا گیا۔

وہ لوگ چچا کو تو ہسپتال لے گئے اور مجھے سی آئی ڈی کے ایک تفتیشی مرکز میں لے آئے۔ اس سے پہلے میں درجنوں بار تھانوں میں آ جا چکا تھا لیکن شاف میں جانے کا یہ پہلا اتفاق تھا۔ مجھے چچا نے ایک بات بتائی تھی کہ بچہ تھانے میں کبھی "ہاں" نہ کرنا اور جیل میں کبھی "ناں" نہ کرنا۔"

میں اس دنیا کے اسرار و رموز سمجھنے لگا تھا اور جانتا تھا کہ اگر میری زبان سے یہ بات نکل گئی کہ میرا تعلق کسی زیرِ زمین تحریک کے ساتھ ہے تو یہ لوگ مجھے جیتے جی مار ڈالیں گے۔ اگر زندہ بچ کر جیل پہنچ ہی گیا تو بھی اول تو یہ لوگ کسی انگریز کا مُردہ مجھ پر ڈال کر پھانسی پر لٹکا دیں گے نہیں تو ۲۰ سال تو پکی سزا ہے ــــ!

تین مہینے تک وہ لوگ میرے ریمانڈ لیتے رہے۔ وہ مجھ سے یہی بات سننا چاہتے تھے کہ میرا تعلق کسی زیرِ زمین تحریک کے ساتھ ہے۔ لیکن میرا ایک ہی بیان رہا کہ میں تو معمولی سا چور اُچکا ہوں۔ زیادہ دولت کے لالچ میں آ گیا تھا۔ مجھے علم نہیں کہ میرے ساتھ لوگ کون تھے۔

تین ماہ بعد جوڈیشل ریمانڈ پر [illegible] بھیج دیا گیا۔ یہاں میری ملاقات تین ماہ بعد چچا سے ہوئی وہ بھی میرے جتنا ریمانڈ ہی کاٹ چکا تھا۔ اس دوران ہماری کوئی ملاقات نہیں ہو سکی تھی حالانکہ جس شاف میں میں ریمانڈ کاٹ رہا تھا وہیں میرا چچا بھی موجود تھا۔

ان تین مہینوں میں اگر کسی چیز نے مجھے ستایا تھا تو وہ تھی مریم کی یاد ــــ! جب کبھی رات کو میں زخموں سے بے حال اپنے سیل میں لیٹا نیند کی گود میں سماتا تو بے اختیار مریم میرے خوابوں میں چلی آتی۔ میں یہ سوچ کر ٹوٹ ٹوٹ جاتا کہ آخر وہ کیا سوچتی ہوگی؟ میری ایسی مسلسل غیر حاضری

WWW.PAKSOCIETY.COM
Scanned by CamScanner

اور وہ بھی اس کے اسلام قبول کرنے کے بعد ــــ وہ میرے متعلق خدانخواستہ کوئی غلط اندازہ قائم نہ کر لے۔

اس زمانے کی جیلیں بڑی سخت ہوتی تھیں اور عموماً امیر غریب کے لئے ایک ہی قسم کی ہوتی تھیں۔ آج کی جیلوں کی طرح نہیں کہ جو غریب ملزموں کے لئے جہنم اور امیروں کے لئے "جائے آرام" بنی ہوئی ہیں۔ کیا مجال جو چڑیا بھی اندر پر مار سکے۔ ہمارے گھر والوں کو تین ماہ تک ہماری ہوا نہ لگنے دی گئی اس کے بعد وہ لوگ جیل میں ہماری ملاقات کو آ گئے۔

میرے چچا کا بیان بھی مجھ سے مختلف نہیں تھا۔ کہیں چلنے لگا۔ اس دوران میں اور چچا ایک ہی حوالات میں بند رہے۔ جب کبھی میں اچانک کہیں کھو جاتا تو چچا میرا درد جان لیتا۔ میں نے محسوس کیا وہ مجھ سے بھی زیادہ دکھی ہو جاتا تھا۔ ایک روز اس نے مجھے اس طرح خیالوں میں گم دیکھ کر کہا۔

بچہ! کاش میں اس واردات پر تمہیں ساتھ نہ لے جاتا۔ مجھے کبھی کسی بات نے اتنا پریشان نہیں کیا جتنا تمہارے دکھ نے کیا ہے۔"

سال ڈیڑھ سال ہم تاریکیں بھگتتے رہے۔ اس دوران بمشکل دو مرتبہ چچا نے کسی ذریعے سے میرا پیغام مریم تک پہنچایا۔ اس نے جواب میں مجھے کہلا بھیجا تھا کہ وہ میری ہے اور میری ہی رہے گی۔ اس نے کہا تھا کہ زندگی کے آخری سانس تک میرا انتظار کرے گی۔ پھر مجھے کوئی بھی ایسا پیغامبر میسر نہ آ سکا جس کے ذریعے میں مریم کو اپنا پیغام بھیج سکتا۔ سرکار نے ہم پر تین چار قتل ڈال دیئے تھے اس دوران ۱۹۴۶ء آ گیا۔

۱۹۴۶ء کے قریباً تیسرے یا چوتھے مہینے ہمیں عمر قید کی سزا ملی آزادی کے دن نزدیک آنے کی وجہ سے ان دنوں قیدیوں کو رہا کے پانی نہیں بھیجتے تھے

والد صاحب نے ہمت نہ ہاری اور ہائی کورٹ میں ایک بہت بڑا وکیل کر وا دیا۔ پانچ مہینے تاریخیں پڑتی رہیں اور ہماری قید ہائی کورٹ نے کم کر کے صرف تین تین سال کر دی۔ جیل

میں میری حالت ماہی بے آب جیسی تھی۔ تین چار مہینے اور گزر گئے۔ میرا چچا اس دوران چپکا نہیں بیٹھا رہا تھا۔ اس نے فرار کے منصوبے بنائے۔ بالآخر ایک دن فرار کے لئے طے پا گیا۔ میری بدقسمتی کہ فرار سے ایک روز قبل جیل میں منتقلت کرتے ہوئے چچا کو سانپ نے ڈس لیا اور وہ دو تین گھنٹے کی اذیت ناک تکلیف کے بعد دم توڑ گیا۔

اس حادثے نے تو مجھے بوکھلا کر رکھ دیا۔ میری حالت دیوانوں کی سی ہو گئی۔ ملک آزاد ہوا تو میری باقی قید معاف ہو گئی اور رہائی بھی مل گئی۔ قافلے ہر دو اطراف آ جا رہے تھے۔ میں دیوانہ وار رات کی تاریکی میں اپنے گاؤں جا پہنچا۔ رات کا وقت گاؤں کے باہر دور دور تک کسی ذی ہوش کا نام و نشان دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ میں گاؤں کے باہر پہلے ڈیرے پر پہنچا۔

یہ سکھوں کا ڈیرہ تھا ــــ!

یہاں میری ملاقات اپنے بچپن کے دوست اقبال سنگھ سے ہو گئی۔ اقبال سنگھ پہلے تو مجھے دیکھ کر حیران رہ گیا پھر بے اختیار مجھے گلے لگا کر رونے لگا۔ اس نے بتایا کہ گاؤں تو کبھی کا اجڑ چکا اور تمام مسلمان پاکستان چلے گئے ہیں۔

اقبال سنگھ نے بتایا کہ وہ لوگ خود قافلے کو بحفاظت پاکستانی سرحد تک پہنچا کر آئے تھے جو ہمارے اس گاؤں سے چالیس پینتالیس میل دور تھی۔ اس نے مجھے کہا کہ چوہدری تو گاؤں نہ جانا وہاں پاکستان کے مہاجر سکھ آئے ہوئے ہیں۔ ان لوگوں نے ہمیں ایسی جھوٹی سچی کہانیاں سنائی ہیں کہ لوگ اب مسلمانوں سے نفرت کرنے لگے ہیں۔

میں نے کہا اقبال یہاں تو میرا بچپن کا یار ہے مجھ پہ ایک احسان کر دے۔ مجھے گھوڑی لا دے۔ میں نے اس سے وعدہ کیا کہ گھوڑی اسے واپس کر کے پھر پاکستان جاؤں گا۔ اقبال سنگھ کسی گہری سوچ میں پڑ گیا۔

"چوہدری تو بھی کیا یاد کرے گا کسی سکھ سے یاری تھی۔" اس نے تھوڑی دیر بعد سر اٹھا کر کہا "میرا انتظار کر۔"

Scan x PDF WAQAR

یہ کہہ کر وہ چلا گیا۔

مجھے اقبال سنگھ پر اعتماد تھا کہ وہ مجھے دھوکہ نہیں دے گا۔ وہ جنگلی سکھ نہیں تھا۔ آدھے گھنٹے بعد وہ گھوڑی کے علاوہ میرے لئے کپڑے اور روٹی بھی لے آیا۔ اس نے بضد ہو کر مجھے دو چار لقمے زہر مار کروائے اور آدھی رات کو میں اپنے گاؤں سے نکل آیا۔ میں نے اپنے سر پر سکھوں کی طرح پگڑی باندھ رکھی تھی۔ میری داڑھی کے بال بڑھے ہوئے تھے اور اقبال سنگھ کی کرپان میرے پاس تھی۔ کوئی بھی مجھ پر مسلمان ہونے کا شک نہیں کر سکتا تھا۔

دم رخصت اقبال سنگھ میرے گلے لگ کر رو پڑا۔ ہم دونوں پیدل ہی گاؤں کے باہر تک آئے۔ "چوہدری تجھے تیرے خدا کی قسم ہے واپس ادھر نہ آنا۔ یہ گھوڑی لے کر پاکستان چلا جا۔" اس نے آخری مرتبہ مجھ سے روہانسی آواز میں کہا۔

"اقبال سنگھ زندگی بھر تیرا یہ احسان نہیں بھولوں گا — اللہ بیلی" — کہہ کر میں نے گھوڑی کو ایڑ لگا دی۔

چوتھی لال کے گاؤں تک پہنچا تو صبح کاذب کی روشنی پھیلنے لگی تھی۔

اس گاؤں کے جلے ہوئے مسلمانوں کے مکانات مجھے دور ہی سے یہاں کے حالات بتا رہے تھے۔ لیکن مجھے مریم کے علاوہ کچھ نہیں سوجھ رہا تھا۔ میں نے گھوڑی چوتھی لال کے گھر کے باہر روکی۔ دروازہ باہر سے بند تھا۔ میں دیوار پھلانگ کر اندر داخل ہو گیا۔ پھر دروازہ کھول کر میں نے گھوڑی کو اندر کر لیا اور کنڈی لگا دی۔

اس دروازے نے مجھے کئی بھولی ہوئی کہانیاں یاد دلا دی تھیں۔

سامنے کمرے کا دروازہ کھلا تھا۔ میں بے دھڑک اندر داخل ہو گیا۔ کرپان میں نے ایک ہاتھ میں مضبوطی سے تھام رکھی تھی۔ اندر لالٹین جل رہی تھی۔ ایک چارپائی پر کوئی چادر اوڑھے لیٹا ہوا تھا۔ میں نے چادر اٹھا کر پرے پھینک دی تو وہ شخص ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ میں اسے مشکل پہچان سکا۔ وہ چوتھی لال تھا!

چوتھی لال ہڈیوں کا ڈھیر بن چکا تھا اور شکل سے برسوں کا بیمار نظر آ رہا تھا۔ اس نے شاید مجھے نہیں پہچانا تھا اور مجھے کوئی لٹیرا ہی سمجھ رہا تھا۔

"یہاں کچھ نہیں رکھا تمہارے لئے۔" اس نے کھانستے کھانستے دیوانوں کی طرح میری طرف دیکھ کر کہا۔

"چوتھی لال مہندر کہاں ہے؟" میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

جواب میں چوتھی لال نے دیوانوں کی طرح قہقہہ لگایا اور بولا "مر گئی — مر گئی —" میں حیرت سے اسے دیکھتا رہا۔ وہ پاگلوں کی طرح اونچی اونچی آواز سے انہی الفاظ کی تکرار کرتا رہا۔ مجھے ڈر تھا کہیں اس کی آواز سن کر کوئی یہاں آ نہ جائے۔ میں نے آگے بڑھ کر اس کا منہ زبردستی بند کر دیا۔ پھر اچانک ہی چھوڑ دیا۔ اس پر دوبارہ کھانسی کا دورہ پڑا تھا۔ مجھے یوں لگا جیسے وہ اسی طرح کھانستے کھانستے مر جائے گا۔

میں نے اسے اس کے حال پہ چھوڑا اور گھر کا کونہ کونہ چھان مارا لیکن گوہر مقصود ہاتھ نہ آیا۔ اس دوران چوتھی لال کھانستے کھانستے نڈھال ہو چکا تھا۔ وہ چارپائی پر گہرے لمبے لمبے سانس لے رہا تھا۔

میں باہر نکل آیا۔ سامنے سے کوئی آ رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر آنے والا ٹھٹھک کر رک گیا۔ کوئی ادھیڑ عمر کا ہندو تھا۔ میں نے اس کے کسی استفسار سے پہلے ہی کہا۔

"میں چوتھی لال کا بھانجا ہوں — ہم لوگ کل ہی پاکستان سے ہجرت کر کے آئے ہیں۔ آج ماما کی خبر لینے آیا تھا — لیکن ...."

"بیٹے پہلا تو جانے یہ ابھی تک زندہ کیوں ہے۔ اس کی بیٹی نے تو اسے جیتے جی مار ڈالا — ایک بیٹی ہی تو تھی بے چارے کی۔"

"کیا ہوا مہندر کو؟" اچانک ہی میرے منہ سے نکلا۔ میرا دل دہل گیا تھا۔

"بیٹا وہ ملیچھ ہو گئی تھی۔ تین سال ہوئے کسی ملیچھ ہی کے ساتھ بھاگ گئی — ہرے رام ہرے رام —" اس نے اپنے کانوں کو چھوا اور آگے بڑھ گیا۔ شاید مندر جا رہا تھا۔

Scan x PDF WAQAR

مجھے یوں لگا جیسے کسی نے پوری طاقت سے میرے دل پر گھونسہ مارا ہو۔ یہاں ہر لمحے مجھے جان سے جانے کا خطرہ تھا۔ کسی کو بھی میرے سکھ ہونے پر شک گزر سکتا تھا۔ خصوصاً ذیلدار دل کا تو بچہ بچہ میرے خون کا پیاسا تھا۔ پھر وہ لوگ ایسا سنہری موقع کیوں ضائع جانے دیتے۔

اگر اقبال سنگھ کی گھوڑی میرے پاس نہ ہوتی تو خدا ہی جانتا ہے میں پاکستان پہنچ بھی سکتا یا نہیں۔ میں دیوانہ وار کھیتوں کے بیچوں بیچ گھوڑی بھگاتا رہا۔ راستے میں کسی نے میرا حلیہ دیکھ کر مجھ سے باز پرس نہ کی۔ میری بھوک پیاس تو جیسے مر چکی تھی۔ گرتا پڑتا شام گئے تک میں سرحد سے چار پانچ میل دور تک پہنچ چکا تھا۔ اس دوران راستے میں دو تین جگہ رُک کر میں نے صرف پانی پیا اور کچھ نہیں کھایا۔

یہاں پہنچ کر میں نے پگڑی وغیرہ اتار دی اور اپنی اصلیت پر لوٹ آیا۔ رات ڈھل رہی تھی جب میں نے سرحد پار کی۔ سرحد کے پار رضاکاروں نے کیمپ قائم کر رکھا تھا۔ ان لوگوں نے مجھے مستعد رسیدہ سمجھ کر میری ہر ممکن دلجوئی کی۔ یہاں سے مجھے یہ بھی علم ہو گیا کہ ہمارے دیہاتوں کے لوگ کس کیمپ میں ہو سکتے ہیں۔ اقبال سنگھ کی گھوڑی سے علیحدہ ہونے کو جی نہیں چاہتا تھا لیکن میں نے بادلِ نخواستہ یہ گھوڑی سرحدی علاقے کے ایک زمیندار کے پاس اونے پونے داموں فروخت کر دی۔

میں بڑا بددل اور مایوس ہو کر والدین اور عزیز و اقارب کو ڈھونڈنے نے ایک کیمپ کی طرف چلا گیا۔ کیمپ کیا تھا؟ انسانی تباہی و بربادی کا منہ بولتا ثبوت۔ مجھے یہاں کچھ شناسا چہرے بھی دکھائی دیئے۔ لیکن میرے والدین ان میں شامل نہیں تھے۔ یہاں سے دوسرے کیمپ کی طرف چل دیا۔ کیمپ کے باہر ہی ایک کونے میں مجھے ایک عورت سر جھکائے اپنی طرف بیٹھے دکھائی دی۔ اسے دیکھتے ہی میرے خون میں جیسے یک لخت بجلی سی دوڑ گئی۔ میں دیوانہ وار اس کی طرف بڑھا۔

وہ مریم تھی ــــ!

"مریم!" میں نے لرزتی ہوئی آواز میں اس کے نزدیک پہنچ کر اسے مخاطب کیا۔

مریم نے سر اوپر اٹھایا اور میری طرف اس طرح بے یقینی کے عالم میں دیکھا جیسے کوئی انہونی بات ہو گئی ہو۔

"تم ــ تم زندہ تھے ــ" اس کے منہ سے بمشکل اتنا ہی نکل پایا اور وہ لڑکھڑا گئی۔

میں نے اسے سنبھالا دیا اور پانی کا گھونٹ نزدیک ہی دھرے پانی کے گھڑے میں سے لے کر اس کے منہ میں ٹپکایا۔ مریم بیہوش تو نہیں ہوئی تھی لیکن ابھی اس کے اوسان بھی بحال نہیں ہوئے تھے۔ اس کا چہرہ ڈھل کر سفید ہو رہا تھا اور شکل سے برسوں کی بیمار دکھائی دے رہی تھی۔

میں نے اسے حوصلہ دے کر بٹھایا اور تھوڑی دیر بعد وہ اپنی کہانی سنا رہی تھی تو مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا۔ جیسے کسی نے میرے کلیجے میں خنجر گھونپ دیا ہو۔ اس کی زبانی مجھے علم ہوا کہ ہمارے نزدیک دیہاتوں میں یہ افواہ بڑے منظم طریقے سے پھیلا دی گئی تھی کہ مجھے سزائے موت ہو گئی ہے اور دوسرے دہشت پسندوں کے ساتھ پھانسی بھی لگا دی گئی ہے۔

میں جان سکتا تھا کہ ایسی افواہ پھیلانے والے کون لوگ ہو سکتے تھے۔ مریم نے بتایا کہ اس کے باپ نے ایک جگہ زبردستی اس کی نسبت طے کر دی تھی۔ اس نے جب اپنے باپ کو بتایا کہ وہ تو کبھی اسلام قبول کر چکی ہے تو چونی لال نے یہی سمجھا کہ لڑکی کا دماغ خراب ہو گیا ہے۔

لیکن ــ وہ نہیں سمجھ سکتا تھا کہ اس کی بیٹی کا دماغ خراب نہیں ہوا بلکہ ٹھیک ہو گیا ہے اس نے سچائی کو پا لیا تھا اور اب اسے کھونا نہیں چاہتی تھی۔ ہمارے نزدیکی دیہات کا مسلمان لڑکا جگو ان دنوں بڑا نام پیدا کر رہا تھا۔ اور ایسے لوگوں کا چونی لال کے ہاں آنا جانا لگا رہتا تھا۔ جب مریم کو اپنی نسبت کہیں زبردستی طے پائے جانے کا علم ہوا تو اس نے جگو کو ہی اپنا بہترین سہارا سمجھا۔

اس نے ایک روز جگو کو اعتماد میں لے کر ساری کہانی سنا دی۔ جگو اس کے کردار کی عظمت سے بہت متاثر ہوا۔ اس کو بھی یہی اطلاع تھی کہ میں پھانسی پا چکا ہوں۔ وہ مریم کو سہارا دینے پر تیار ہو گیا اور ایک روز مریم اس کے ساتھ نکل گئی۔

یہ لوگ دوسرے ضلع میں جا کر رہنے لگے۔ تقسیم کے وقت جب ان کے قافلے پر حملہ ہوا تو جس

WWW.PAKSOCIETY.COM
Scan x PJE

کا جدھر منہ اٹھا وہ بھاگ گیا۔ مریم بھی افراتفری میں کسی اور طرف نکل گئی۔ وہ بے چاری دو روز تک بھوکی پیاسی ایک کھیت میں چھپی رہی۔ اس امید پر کہ شاید اس کا خاوند وہاں آ جائے لیکن اس کا خاوند نہ آیا۔

گرتی پڑتی وہ پاکستان پہنچ گئی اور اب یہاں کیمپوں میں اپنے خاوند کو تلاش کرتی پھر رہی تھی۔ مجھے امید تھی کہ اب مریم مجھ سے یہی کہے گی کہ جگو چونکہ مر چکا ہے اس لیے وہ میرے ساتھ شادی کے لئے تیار ہے۔ لیکن اس نے کہا "چوہدری عورت زندگی میں ایک ہی مرتبہ شادی کرتی ہے۔ میرا دل گواہی دیتا ہے چوہدری کہ میرا خاوند مرا نہیں۔ خدانخواستہ اگر ایسا ہوا بھی تو باقی زندگی اس کی یاد میں گزار دوں گی۔"

مریم کی اس بات نے میرے دل میں اس کی عقیدت کئی گنا بڑھا دی تھی۔ یہ ہندو لڑکی اسلام قبول کرنے سے پہلے بھی اتنی ہی عظیم تھی۔ میں نے مریم کی اس بات سے آگے اس سے کوئی بات نہ کی۔ میں محسوس کر سکتا تھا کہ اس نے اپنے دل سے میری محبت نہیں نکالی۔ جس طرح میں اسے بھول نہیں سکا تھا اس نے بھی مجھے بھلایا نہیں تھا۔

میں اس وفا اور عقیدت کی دیوی کے سامنے سے اٹھ کر آ گیا۔ ایک اور کیمپ سے بالآخر اپنے گھر والوں کا سراغ بھی مل گیا۔ وہ لوگ ایک گاؤں میں بس گئے تھے۔ میں اپنے والدین سے ملا تو جیسے پچھلے تمام زخم ہرے ہو گئے۔ زندگی میں پہلی مرتبہ بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رو دیا۔

میری زندگی میں اب کوئی مقصد، کوئی لگن رہ ہی نہیں گئی تھی۔ ڈیڑھ دو سال میں نے اس گاؤں میں اپنے گھر والوں کے ساتھ گزار دیئے۔ اس دوران مجھے اپنے پرانے ساتھی بھی آہستہ آہستہ ملنے لگے تھے۔ آہستہ آہستہ انہوں نے مجھے اپنے ڈھب پہ لگا لیا۔ میری زندگی میں اب سوائے جرائم کے اور رہ ہی کیا گیا تھا۔

والدین بضد رہے کہ میں شادی کر لوں لیکن یہاں کس کو میرے دل کا حال معلوم تھا۔ میں نے شادی سے انکار کر دیا۔ کوئی وجہ بھی نہ بتائی۔ میرا دل گواہی دیتا تھا کہ میں جب کسی سے بھی شادی کروں گا اسے کبھی سکھ نہیں دے سکوں گا اور میں نہیں چاہتا تھا کہ کسی کو دکھی رکھوں۔ اپنی طرح!

میں نے ایک دوسرے علاقے میں اپنی رہائش اپنے ایک دوست کے گھر میں رکھی ہوئی تھی۔ میں کبھی کبھی والدین سے ملنے آ جایا کرتا تھا۔ ان دنوں سمگلنگ کا کاروبار اپنے عروج پر تھا۔ ہم لوگ بڑے سمگلروں کے کارندے بنے ہوئے تھے۔ مجھے کسی کے لئے کام کرنا پسند نہیں تھا لیکن مجبوری تھی۔ اس دوران میرے پاس اتنی دولت جمع ہو چکی تھی کہ میں خود اپنا گروپ بنا سکتا تھا۔

ایک روز میں نے اپنے طور پہ مال سرحد کے دوسری طرف پہنچانا چاہا۔ کسی نے مخبری کر دی اور میرے ساتھی مال سمیت پکڑے گئے۔ اس حادثے نے مجھے سیخ پا کر دیا۔ آج تک کسی کو میرے خلاف شکایت کی جرأت نہیں ہوئی تھی۔ یہ کون مائی کا لال تھا جس نے میرا سارا مال ہی پکڑوا دیا۔

میرے شب و روز اب اسی چکر میں گزرنے لگے تھے کہ اس مخبر کو سزا دوں۔ پندرہ بیس دن میں مفرور رہا کیونکہ پولیس ہر جگہ میری تلاش میں چھاپے مار رہی تھی۔ ان پندرہ بیس دنوں میں اس نامعلوم مخبر کے خلاف میرے دل میں نفرت اور انتقام کی آگ مزید بڑھتی رہی۔ بالآخر میری کوششیں رنگ لائیں اور مجھے علم ہو گیا کہ جس گاؤں کی مخبری میں میرا مال پکڑا گیا تھا یہ اسی گاؤں یعنی رنگیل پور کے نمبردار ملک شریف کا کارنامہ ہے۔

اگلے روز رات کے دوسرے پہر میں پستول سمیت اس نمبردار کے گھر میں داخل ہو چکا تھا۔ میرے لئے یہ کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ میں بہرحال ایک تربیت یافتہ چور بھی رہا تھا اور کسی کی آنکھوں میں دھول جھونک کر اس کے گھر میں داخل ہو جانا میرے لئے بچوں کے کھیل سے بھی زیادہ آسان تھا۔

نمبردار اپنے کمرے میں گہری نیند سو رہا تھا۔ دوسری چارپائی پہ ایک عورت اور بچہ سو رہے تھے۔ میں نے اپنا منہ سر کپڑے میں لپیٹ رکھا تھا۔ صرف آنکھیں ہی دکھائی دے سکتی تھیں۔ میں نے نفرت اور غصہ سے کھولتے ہوئے اس کی چارپائی کو ٹھوکر ماری تو نہ صرف وہ بلکہ اس کی بیوی بھی ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھے۔

ان لوگوں کی شکل پہ نظر پڑتے ہی میرے تو ہاتھ سے پستول گرتے گرتے رہ گیا۔ یہ جگو اور

WWW.PAKSOCIETY.COM
Scan by PDF

مریم تھے۔ ان کا بچہ اس سارے ہنگامے سے بے خبر میٹھی نیند سو رہا تھا۔

"کو کو کون ہو تم ۔ کیا چاہتے ہو" جگو نے گھبرائی ہوئی آواز میں پوچھا۔ اس دوران مریم اس کے سامنے آن کھڑی ہوئی تھی۔ غالباً اس نے میرے ہاتھ میں پکڑے پستول پر نظر رکھی تھی۔ وہ شاید اس ارادے سے آگے آئی تھی کہ اگر میں گولی چلا دوں تو اس کے خاوند کے بجائے اسے لگے۔

"خدا کے لئے تم جو چاہتے ہو لوٹ کر لے جاؤ، لیکن میرے خاوند کو کچھ نہ کہو" مریم کے لہجے میں التجا سے زیادہ دھمکی کا تاثر نمایاں تھا۔

خدا جانے میرے بائیں ہاتھ میں کیسے حرکت پیدا ہوئی اور میں نے منہ سے نقاب ہٹا دیا۔ میری شکل پر نظر پڑتے ہی دونوں چونک پڑے۔

"تم ....." دونوں کے منہ سے بیک وقت نکلا۔

"ہاں جگو! مجھے علم نہیں تھا کہ ملک شریف تم ہی ہو ۔۔۔ وہ جو مال تم نے پکڑوایا میرا تھا ۔۔۔" اس سے آگے میں کچھ نہ کہہ سکا اور واپس جانے کے لئے مڑ گیا۔

"چوہدری! مجھے مریم کی آواز سنائی دی ۔۔ کم از کم آج کی رات تو ہمارے مہمان رہو۔"

میں مریم کی آواز پر رکا ضرور تھا لیکن مڑ کر اس کی طرف دیکھا نہیں۔ مجھ میں اب اس کی طرف دیکھنے کی ہمت ہی باقی نہیں رہی تھی۔ وہ میرے قدم تو ہرگز نہیں تھے۔ جن پر چل کر میں باہر آیا تھا۔

لمبی کہانی ہے ۔۔ اس کے بعد کیا ہوا۔ میں نے گرفتاری دے دی۔ عدالت نے مجھے دو سال قید بامشقت کا حکم دیا۔ اس قید کے دوران مریم اور جگو کئی مرتبہ میری ملاقات کو آئے۔ میں نے ان سے درخواست کی تھی کہ میری اطلاع کسی کو نہ دیں۔ انہوں نے میری بات بادلِ نخواستہ مان لی۔

اس دوران مریم مجھے یہی سمجھاتی رہی کہ میں اس زندگی کو چھوڑ دوں اور اپنا گھر بسا لوں۔

میں نے مریم سے کہا کہ میں اس کی دو باتیں نہیں مان سکتا۔ جیل سے رہائی پر میں نے وہ زندگی تو چھوڑ دی لیکن گھر نہیں بسایا۔ میں وہ صوبہ ہی چھوڑ گیا جہاں والدین اور مریم وغیرہ

وقت گزرتے پتہ نہیں چلتا۔ میں اپنے گھر صرف والدین کی وفات پر گیا۔ بہن بھائیوں کو میں نے کیا سکھ دیا تھا کہ مجھے یاد رکھتے۔ انہوں نے مجھ سے منہ موڑ لیا۔ میں بھی ان سے نہیں ملا۔ کسی طرح کوئی کسی کی یاد میں زندگی نہیں تج دیا کرتا۔ لیکن مجھے مریم سے جو بے نام سی عقیدت ہو گئی تھی اس نے پھر میرا گھر نہ بسنے دیا۔ اللہ نے مجھے سب کچھ دیا ہے۔ آج بھی دولت مند لوگوں میں شمار ہوتا ہوں۔ یہ کہانی آپ کو کبھی نہ سناتا لیکن پچھلے مہینے مریم کا انتقال ہو گیا۔ جگو تین چار سال پہلے ہی ایک بیماری سے مر گیا تھا۔

میں اس کا افسوس کرنے بھی گیا تھا۔ تب میں نے عظمت و وفا کی اس دیوی کو شاید آٹھ دس سال بعد دیکھا تھا۔ اس کے دل میں یقیناً یہ خواہش جاگ رہی تھی کہ آج جب وہ اکیلی رہ گئی ہے کوئی اسے سہارا دے۔ یہ ٹھیک ہے جگو کے تین جوان بیٹے تھے ۔۔ مگر اس کا کوئی رشتہ دار فساد میں زندہ نہیں بچا تھا اور مریم کا تو کوئی تھا ہی نہیں۔

لیکن ۔۔ میں مریم سے مرتے دم تک دوبارہ نہ ملا۔ مبادا کہیں عقیدت کے اس رشتے پر جو میرے اور اس کے درمیان استوار تھا بال برابر میل بھی نہ آ جائے۔

مریم کی موت کے بعد میں اس کے بچوں سے ملتا ہوں۔ وہ مجھے چچا کہتے اور میری بہت عزت کرتے ہیں۔

Scan x PDF

WAQAR
Scan PDF

ہزار پانیوں کی کڑواہٹ

دونوں سات سال بعد اچانک ہی ہمرائی اڈے کے لاؤنج میں ملے تھے۔ راشد وہاں کسی کام سے آیا تھا اور وہ امیگریشن سے واپس آ رہی تھی۔ جس دروازے سے سارہ باہر نکل رہی تھی اسی سے وہ اندر داخل ہو رہا تھا۔ دونوں کی نظریں اچانک ملیں تو ایک درد آنکھوں کے راستے ان کے اندر دھوپ کی طرح پھیل گیا۔ چند لمحوں کے لئے تو دونوں ہی سکتے میں آ گئے۔ پھر پہل سارہ نے ہی کی۔ مغربی ممالک میں لمبے قیام نے اس میں کم از کم مرد سے بات کرنے کا حوصلہ بڑھا دیا تھا۔

"کیسے ہو؟" اسے اپنا لہجہ نہ جانے کیوں اجنبی سا لگا۔

"ٹھیک ہوں تم کہو۔ کب واپس آئیں"؟ راشد نے ایک ہی سانس میں سب کچھ پوچھ لیا۔

"ابھی۔ اسی فلائٹ سے۔" وہ خاموش ہو گئی۔

سامان کلیئرنس کا منتظر تھا۔ اس کے ہاتھ میں چھوٹا سا اٹیچی کیس اور بازو میں بڑا سا پرس جھول رہا تھا۔ راشد کو دیکھتے ہی اس نے اٹیچی کیس زمین پر رکھ دیا تھا۔

"ٹھہرو گی ذرا ..." راشد نے کچھ ایسے ملتجی لہجے میں کہا کہ وہ کہتے کہتے رہ گئی۔

جواب میں اس نے صرف نظر بھر کر اسے دیکھا اور ہتھیار ڈال دیئے۔ اس کی ساری خود سری خود اعتمادی دھری کی دھری رہ گئی۔ راشد اٹیچی کیس اٹھا کر آگے بڑھ گیا اور وہ سحر زدہ سی اس کے تعاقب میں چلتے لگی۔ سات سال میں راشد کی چال میں سوائے اس کے اور کوئی فرق نہیں آیا تھا کہ اس

کے کندھے آگے کی طرف جھک گئے تھے۔ وہ قدرے فربہ بھی تو ہو گیا تھا اور بالوں میں بھی کچھ چاندی چمکنے لگی تھی۔ مسکراہٹ البتہ ویسی ہی طنز آمیز تھی۔ آواز بھی اسی طرح پاٹ دار اور آنکھوں کا تجسس تو پہلے سے دوچند ہو گیا تھا۔

کینٹین میں بیٹھے وہ کافی سامنے رکھے صرف یہی سوچتے رہے کہ انہیں بچھڑے ہوئے کتنی "سات سال ہو گئے ہیں"۔ میں آنچی سے تمہارے متعلق پوچھتا رہتا تھا۔ مجھے علم تھا تم واپس آ رہی ہو" نہ جانے راشد نے کیوں اس سے یہ بات کہہ دی۔

"اچھا تو ہار مان لی ہے اس نے۔ بڑا مرد بنا پھرتا تھا اونہہ"۔ سارہ نے سوچا وہ کہنا تو کچھ اور چاہتی تھی۔ لیکن اس کی طرح نہ چاہتے ہوئے بھی کہہ گئی۔ "ہاں تھک گئی ہوں نا"۔

"تم یوں لگا جیسے اس نے کافی کے بجائے کھولتے ہوئے تیزاب کا گھونٹ بھر لیا ہو۔ "تم تھک بھی سکتی ہو ناممکن۔ تم جیسی خود سر لڑکیاں کبھی نہیں تھکا کرتیں۔ وہ تو اپنے ہم سفروں کو بھگا بھگا کر مار ڈالتی ہیں۔ نو سارہ... نو"۔ اس نے سوچا اب وہ کیا کہے سارہ سے۔ کوئی ایسا ذو معنی سا فقرہ جو اس کی الجھن، اس کی خلش کا مداوا کر دے۔ لیکن کیا؟ حرفوں کی جھولیاں تو خالی ہو رہی تھیں۔ "مسٹر راشد تم نے آج تک پروفیسری نہیں کی جھک ماری ہے جھک۔ ہاں! اور کیا؟ کہاں گئی تمہاری لفاظی۔ کاٹ دار فقرے۔ بس"! بالآخر وہ اتنا ہی کہہ سکا "ملک ملک گھومی ہو گی۔" اور کیا کہتا۔

"اور کیا کرتی؟ کڑ کڑ کے مرجاتی۔ تمہارے سامنے ہتھیار ڈال کر خودکشی کر لیتی۔ تم نے تو یہی سوچا ہو گا۔ تم سارے مرد اسی طرح سوچتے ہو۔ سب ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے ہو۔ دیکھو دیکھو مجھے میں اسی طمطراق سے زندہ ہوں۔ ویسی ہی ہوں۔ تمہاری طرح میرے کندھے نہیں جھکے میرے بالوں میں اب بھی سمندر کے رنگ جھلمل جھلمل کرتے ہیں۔ میں ہاری نہیں ہیں ہار ماننے کے لئے پیدا ہی نہیں ہوئی"۔ سارہ کا جی تو چاہتا تھا چیخ چیخ کر راشد سے سب کچھ کہہ دے۔ لیکن اس نے کچھ نہ کہا۔ کسی نادیدہ طاقت نے اس کی قوتِ گویائی سلب کر لی تھی۔

"بس کچھ زیادہ نہیں تم کہو"۔ اس نے نیچی پلیٹ کے کونے پر بجاتے ہوئے کہا۔

"ہاں۔ میں تو وہی پڑھا رہا ہوں۔ میرے پاس اتنے وسائل نہیں تھے کہ تمہاری طرح [illegible] کر سکتا"۔

"ہاں ہاں! اور کہو ایسی باتیں۔ اپنی بے بسی کا اسی طرح اظہار کرتے رہو۔ خود کو دنیا کی مظلوم ترین مخلوق ثابت کرو۔ کہہ دو امیر باپ کی بیٹی نے مجھ پر ظلم کیا۔ مجھے بے یار و مددگار چھوڑ کر بھاگ گئی"۔ سارہ نے سوچا مگر اس کے لبوں پر الفاظ اترے۔ "مجھے اب چلنا چاہیئے"۔ پھر اس نے گھڑی پر نظریں دوڑائیں۔ وہ اگر چند منٹ بھی اور وہاں رہتی تو دم گھٹنے سے مر جاتی۔

بیرا انہیں اٹھتے دیکھ کر قریب آ گیا۔ سارہ کا ہاتھ بے اختیار پرس کی طرف بڑھا۔ لیکن اس سے پہلے کہ راشد کی آنکھوں میں کیا نظر آیا کہ اس کا ہاتھ وہیں رک گیا۔ بل راشد نے دیا۔ دونوں اکٹھے ہی باہر آئے تھے۔ ٹیکسی تک وہ اسے چھوڑنے آیا۔ راستے میں انہوں نے ایک لفظ بھی ایک دوسرے سے نہیں کہا تھا۔ بس دونوں ہی مسمریزم کے کسی "معمول" کی طرح ٹیکسی اسٹینڈ تک چلے آئے تھے۔!!

"ہم آئندہ مل سکیں گے یا"۔ یہ فقرہ سو فیصد غیر اختیاری طور پر سارہ کے منہ سے نکلا تھا۔ اس کا جی چاہا اپنا منہ آپ ہی نوچ لے۔

"کل سالوس" میں دوپہر کو چلی آنا۔ کھانا وہیں کھائیں گے"۔ راشد نے کسی مشینی عمل کی طرح جواب میں کہا۔

ٹیکسی سارہ کو لے کر آگے بڑھی تو دونوں کی آنکھیں یوں چھلکیں جیسے پانی کا تیز دھار چاقو کسی سینے سے اچانک آ ٹکرایا ہو۔

ساحل کے اس چھوٹے سے ریستوران میں وہ سات سال بعد آیا تھا۔ پہلی دفعہ بھی سارہ کے ساتھ آخری مرتبہ بھی اس کے ہمراہ اور آج پھر ایک کونے میں کسی میز پر کہنیاں ٹکائے سر ہاتھوں کے پیالے میں رکھے وہ سوچ رہا تھا کہ یہاں کیوں آیا ہے؟ جبھی وہ اس کی میز کے کنارے آ کر ٹھہر گئی۔

Scan x PDF

"ہیلو!"

"سارہ!"

اور دونوں ایک دوسرے کے سامنے مجرموں کی طرح سر جھکا کر بیٹھ گئے۔ بیرے نے ٹی پاٹ اور مچھلی ان کے سامنے رکھ دی تھی۔ یہ واحد چیز تھی جس پہ دونوں نے پچھلی زندگی میں اتفاق کیا تھا۔ جب سارہ کو مچھلی منگوانے پہ کبھی افسوس سا ہوا۔ وہ چاہتی تھی راشد کوئی اپنی پسند کی چیز منگوائے۔ لیکن مچھلی کو چھیڑتے ہوئے وہ کبھی کبھی غور سے راشد کے سر میں چمکتی چاندی کو دیکھنے لگتی۔ اس کے ذہن میں ماضی کی یادیں ہلکورے لینے لگی تھیں۔ ایک مدت کے فراموش کیے دریچے دوبارہ کھل اٹھے تھے۔

حسین اضطراب، دھڑکتا دل، جھنجھناتا بدن پہاڑیوں پہ گہرے سرخ رنگ کے گلاب اولین بارش سے دھوپ کی ماری بھیگی زمین کی سوندھی خوشبو، کمپنی باغ کی سڑک پہ دو رویہ لگے یوکلپٹس کے سایہ دار درختوں تلے ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے ان کی پہلی قدمی، پام کے بلند درختوں کے درمیان سرسراتی ہوائیں، سمندر کا کنارہ، ریت اور ادھ ننگے جسم۔ آگ اگلتا سورج، آتش بداماں پتے بدن اور دہکتی روحیں۔

پھر۔۔۔!!!

شادی۔ رنگین تصویریں اور سلائڈز، سرخ رنگ کا بھاری عروسی جوڑا، نیلوفر سے لدی چھندی دلہن، شہنائیوں کی آوازیں، سہیلیوں کی چہلیں، قہقہے، مبارکبادیاں، فیملی فوٹو، کیمرے نے مسکراہٹوں اور وقت کو منجمد ہی تو کر دیا تھا۔ خضاب لگی داڑھی اور سر سے بھری آنکھوں والے ایک مولوی صاحب دو گواہوں کے ساتھ اس کے کمرے میں اس کی سہیلیوں کے درمیان چلے آئے اور اس کے سر ہلانے پہ اس کی محبت نے ایک ضابطے کی شکل اختیار کر لی۔ کاغذوں کے ایک پلندے پہ مختلف جگہ پہ دستخط کر کے ایک عہد میں بندھ گئی۔ بڑی گرم جوشی سے اپنے عہد پہ قائم رہی۔

"تم بالکل نہیں بدلیں سارہ" راشد سناٹے سے اکتا گیا اور میرے بارے میں کیا خیال ہے؟"

سارہ نے سوچا۔ یہ وہ راشد تو نہیں تھا جو اس کے ماضی کی تہوں سے بار بار سر اٹھا کر اس کی آنکھوں میں جھانک رہا تھا۔ اس کے عقب میں سمندر کی جھاگ اڑاتی متلاطم لہریں تھیں۔ جو ان کی زندگی کے سات سال تھے وہ ایک اور ہی دنیا تھی۔ کوئی دوسری دنیا کا دوسرا دور۔ وہ سات سال ایک عہد کی طرح تھے۔ "پروفیسر صاحب! انسان، اسکول اور کالج ہی سے نہیں حالات سے بھی بہت کچھ سیکھتا ہے۔" وہ مسکرادی لیکن اس کی مسکراہٹ میں بھی سراسیمگی کی ایک کیفیت تھی۔ "تم اس مرد سے کیا بات کرو گی۔ سارہ بی بی جس کے ساتھ تم نے زندگی کے دو بھرپور سال گزارے ہیں اور جو آج سات سال بعد پھر اچانک ایک موڑ پہ پہلے کی طرح تم سے ٹکرا گیا ہے۔ یہ شخص تو حادثے جنم دینے آیا ہے۔ کچھ کہنے کے لئے اب رہا ہی کیا ہے۔"

دونوں اب کھلی آنکھوں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھ رہے تھے۔ پوری آگہی کے ساتھ لیکن سارہ کی سوئی محبت نے کروٹ نہ بدلی۔ جو درد اس کے اندر جاگ رہا تھا وہ محبت تو نہیں تھی شاید۔ یادوں کا طوفان اس کی قوتِ فیصلہ پہ اثر انداز نہ ہوا۔ وہ حیران سی گزرے وقت کے دریچوں سے اس کی کھوئی کھوئی آنکھوں میں جھانکتی رہی۔ اسے اپنی اولین محبت کا سپنا یاد آگیا۔ وہ معصومیت، وہ سادہ لوحی، وہ انارکی پن، یوکلپٹس کا جھنڈ اور چیختی چلاتی ہواؤں کی سرسراہٹ اس کے اندر جاگنے لگی۔ کیا میں اسے بتا دوں کہ میری حقیقی زندگی تو طلاق کے بعد سے شروع ہوئی تھی اور تم ہی کہا کرتے تھے راشد۔ تم جو ادب کے طالب علم بھی ہو اور استاد بھی کہ انیسویں صدی کے ناولوں کا اختتام شادی پہ ہوتا تھا اور بیسویں صدی کے ناولوں کی ابتدا طلاق سے ہوتی ہے۔ اس کی زندگی دو حصوں میں منقسم تھی ایک طلاق سے پہلے کا دور۔ دوسری جنگِ عظیم نے جو کچھ دنیا کو دیا تھا وہی کچھ اس کی شادی کے انفساخ نے اسے دیا۔ اس نے اسے توڑ پھوڑ جس توڑا تھا اس کے بخیے ادھڑ گئے تھے۔ وہ پامال اور شکستہ کھنڈروں جیسی روح کے ساتھ زندگی کے موہنجو داڑو میں اندھی بگاڑوں کی طرح بھٹکتی پھری تھی۔ زخموں سے چور اس کے اندر کی ہر چیز مر گئی تھی۔ اسے اپنی ذات کی تخلیق کا عمل بالکل نئے سرے سے شروع کرنا پڑا

Scanned with CamScanner

تھا۔ اس نے اپنے پیکر میں خود سے دوبارہ جنم لیا تھا۔

دونوں سمندر کی شوریدہ سر موجوں پر نظریں جمائے بیٹھے تھے۔ ان کے تصور میں ماضی یادوں کے سائے گڈمڈ مردوں کی طرح سر اٹھا رہے تھے۔ یادیں ذہنوں کے ترازو میں تلنے لگیں۔ مثبت و منفی۔ دکھ سکھ۔ زحمت رحمت۔ ان کے عقب میں تاحدِ نظر پھیلا نیلگوں پانی ماضی کی گم شدہ بھٹکی ہوئی یادوں کا زادِ راہ بن رہا تھا۔ اس کا گیت ابدی تھا۔

عالمِ تصور میں وہ دونوں، ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے سامنے والی پہاڑی پر دوڑتے ہوئے چڑھنے اترنے لگے۔ پھر عالمِ وحشت میں ایک دوسرے سے لپٹ کر ہمیشہ ایک ہی ڈوری میں بندھے رہنے کا اقرار کرنے لگے۔ اس کے سابقہ خاوند نے اپنے سانولے ہاتھ سے اس کے لئے کافی بنائی۔ وہی ہاتھ جو اچانک سات سال بعد دستِ سکندری کی طرح نمودار ہو کر اس کے سامنے آیا تھا۔ اس کے نیم مردہ ہاتھ کو دبانے لگا۔ سارہ کی دہکتی آنکھوں میں ایک شعلہ سا روشن ہو گیا۔ وہ سوچنے لگی کیا یہ کھیل اب پھر نئے سرے سے شروع ہونے والا ہے؟ اف میرے خدا!

وہ سب کچھ بھی تو اسی طرح اچانک شروع ہو کر اچانک ختم ہو گیا تھا وہ رات کتنے کرب کے ساتھ لائی تھی۔

آدھی رات کے بعد جب وہ گھر آیا تو آرام دہ صوفے میں دھنس کر اس کے گرد سگریٹ کے مرغولے اڑانے لگا تھا۔ وہ اس سے بہت کچھ کہنا سننا چاہتی تھی لیکن راشد تو پھر بنا صوفے میں دھنسا رہا وہ روہانسی ہو کر جانے کیا کیا بول گئی تھی۔ آنسو تھے کہ تھمنے کا نام ہی نہ لیتے تھے پھر اچانک اس کی ہچکیوں کو بریک لگ گیا۔

"میں طلاق چاہتا ہوں۔ مجھے کسی اور شے سے محبت ہو گئی ہے۔ مجھے شادی کی پہلی رات ہی احساس ہو گیا تھا کہ ہم نے زبردست غلطی کی ہے۔" پتھر کی چٹان زہر اگلتی رہی۔

سارہ کے دماغ میں زوردار دھماکہ ہوا۔ سوائے سننے کی حس کے باقی تمام حیات کو موت آ گئی۔ راشد کی آواز کسی کنویں سے آتی سنائی دے رہی تھی۔ وہ سامان تقسیم کر رہا تھا۔ جانے کیا کیا

[illegible] اور سارہ گرداب میں پھنسی زور زور سے چیخ کر کاٹتی رہی۔ پھر وہ اس بھنور میں ڈوبتی چلی گئی۔

وہ چھوٹا سا فلیٹ جس پہ کبھی دونوں فخر کیا کرتے تھے، سارہ کے لئے قبرستان بن گیا تھا۔ [illegible] ہر شے اپنی قدر و قیمت اپنا حسن کھو چکی تھی۔ جب وہ زور سے دروازہ بند کر کے [illegible] پر گرتا نیچے چلا گیا تو گویا سارا ماحول سرد ہو کر رہ گیا۔ کمرے کا شاندار فرنیچر لکڑی کا بے جان [illegible] اپنی قسمت پر ماتم کر رہا تھا۔

وہ شادی کے اس پلندے کو جس پر نہ جانے کتنی جگہ مولوی صاحب نے دستخط کرائے [illegible] ردی بنا کر چلا گیا۔ اس کا سرمایہ اسے چھوڑ گیا۔ بھلے کچھ بھی تھا وہ تھی تو ایک کمزور عورت۔ [illegible] دولت اور آزاد ہونے سے وہ ڈرتی تھی۔ آزادی۔ اس نے تو کبھی اس کا تصور بھی نہیں کیا تھا۔ [illegible] کی شدت سے اندھی ہو کر وہ اپنی روح کے صحرا میں رینگتی اور باہر نکلنے کا راستہ تلاش کرتی رہی۔

بیرا ان دونوں کے بیچ ایک مشروب کا جگ رکھ گیا تھا۔ آخری پہر کی ٹھنڈی ہوا کے جھونکے [illegible] دن بھر کی گرمی کو اپنے اندر سمیٹ کر آگے کی ہمت جگا رہے تھے۔ سارہ کے وجود میں دو عورتیں جنگ آزما تھیں۔ ایک وہ عورت جو وہ تھی اور ایک وہ جو وہ ہونا چاہتی تھی۔ راشد نے مشروب گلاس میں انڈیلا کہ اس کے آگے سرکا دیا۔ سمندر کے کنارے سر سرانے والی ہوا غیر متوقع طور پہ تھم گئی تو جانے سارہ کو کیوں ایک گمبھیر سے سکون کا احساس ہوا۔ وہ ایک شیریں سی نقاہت محسوس کرنے لگی۔ کیا میں [illegible] پر پہنچ گئی ہوں؟ اس نے خود سے سوال کیا۔ کوئی ملک؟ کوئی خود مختار ریاست؟ ہاں، ہاں، یہ [illegible] کی اپنی ریاست ہی تو تھی۔ لیکن کوری دھرتی تھی یہ۔ اسے سب کچھ ابتدا سے تعمیر کرنا تھا۔ اس کی [illegible] خود طے کرنی تھیں۔ اس کی زبان، اس کا آئین۔ ایسا قانون جو سراسر اس کا اپنا ہوا سے اپنے اوپر خود "لن کمانڈمنٹ" کا نزول کرنا تھا۔ اپنا جغرافیہ خود ہی متعین کرنا تھا۔

ریستوران آہستہ آہستہ خالی ہونے لگا تھا۔ وہ دونوں ایک دوسرے سے معذرت خواہانہ انداز میں باتیں کر رہے تھے۔ کبھی کبھی جب کہنے کو کچھ نہ ہوتا تو وہ خالی خالی نگاہوں سے اس [illegible] آنے والی سڑک کو گھورنے لگتے۔ ان کی نگاہوں میں ناکامی کی پرچھائیاں بلکورے لے رہی تھیں۔

ان! وہ ایک دوسرے کے لئے ناکام ہی تو رہے تھے۔ محبت کے عہد پہ قائم نہ رہ سکے تھے۔

"میں اس کھیل میں کبھی کامیاب نہیں رہا سارہ!" وہ الجھے الجھے لہجے میں سارہ سے کہہ رہا تھا۔ سارہ کو لگا جب وہ شادی شدہ تھے تو اپنے مسائل زندگی کے متعلق ایک لفظ زبان پہ لانے کی جرأت نہ پاتے تھے۔ مگر اب وہ بالکل غیر متوقع طور پہ اپنی ناکامی کی باتیں کر رہا تھا۔ اپنی آپ بیتی کا رونا رو رہا تھا اسے اپنی ناکامی پہ واقعی دکھ تھا کہ وہ سارہ اور خود کو کیوں خوش نہ رکھ سکا۔ اس کی اور اپنی محبت کے اپنے ہاتھوں تعمیر کردہ تاج محل کو خود ہی مسمار کر کے کیوں چل دیا؟ اور یہ احساس وقت گزرنے کے ساتھ بڑھتا ہی تو جا رہا تھا۔

سارہ چپ چاپ اس کی باتیں سنتی رہی۔ اسے یوں لگا جیسے راشد اب پہلے سے بھی کچھ زیادہ بڑا ہو گیا ہے۔ لیکن اسے اب الجھن بھی ہونے لگی تھی کہ آخر وہ اس کا لگتا کیا ہے؟ وہ اس کے متعلق کیوں سوچ رہی ہے؟ اس کی نظریں راشد کے چہرے سے پھسل کر اس کے کھلے گریبان میں جھانکنے لگیں جہاں سفید بالوں کے کئی گچھے نمایاں تھے۔ اس کا جی چاہا کہ وہ اپنے ماضی کو چیلنج کرے اپنے سابقہ شوہر اور محبوب سے ناکام روابط کو فتح مندی اور کامیابی کی منزل سے ہمکنار کر دے۔ لیکن کیوں؟ وہ ایسا کیوں کرے؟ آخر یہ ادھیڑ عمر پروفیسر اب اس کا کیا لگتا ہے۔ اسے اخلاق و مذہب کی کون سی شق نے ایسا سوچنے کا حق دیا ہے؟

ان کے عقب میں اب آسمان اور سمندر دونوں کا رنگ نیلا ہونے لگا تھا۔ دونوں گھبرا کر وہاں سے اٹھ آئے اور آہستہ آہستہ ساحل بحر کی طرف بڑھنے لگے تب سارہ نے محسوس کیا جیسے وہ روانہ ہونے والے بحری جہاز کے عرشے پہ غروب ہوتے ہوئے سورج کے آتشیں پس منظر میں تنہا کھڑی ہے۔ وہ ہاتھ .... ہلا ہلا کر اپنے پیاروں، اپنے دیس اور اپنے پیا ہوتے ہوئے ماضی کو الوداع کہہ رہی ہے تب اس نے وہیں عرشے پہ کھڑے کھڑے عہد کیا تھا کہ وہ اپنے خوابوں کے قد کاٹھ کے مطابق زندگی بسر کرے گی۔ ایک سفری تھیلے اور سلیپنگ بیگ کے ساتھ وہ اپنے سفر پہ چل پڑی تھی۔

سارن، پیرس، ڈبلن، اسٹاک ہالم، اوسلو، کوپن ہیگن، ایمسٹرڈیم، برلن، نیویارک اور نہ جانے کہاں کہاں بس، ٹرین، ہوائی جہاز، کشتی ہر ذریعہ سفر اس نے اپنایا۔ فاصلے اس کے لئے بے معنی ہو گئے۔ دنیا سکڑ کر ایک گاؤں کی شکل اختیار کر لی۔ سرحدیں، زبانیں، ثقافتیں سب اس کے لئے معدوم ہو گئیں۔ سڑکیں اس طرح گھومتی اور سفر کرتی تھیں جیسے اس کے پاؤں تلے بچھ گئی ہوں اور ان میں گردش کرتا خون جیسے آسمان پہ سورج کا سفر۔

پھر وہ ایک ایسی نوجوان عورت تھی جس کی ہر حرکت وقت کی حرکت سے ہم آہنگ تھی۔ وہ ساری قیود سے آزاد تھی۔ مختصر نوٹس پہ کسی بھی لمحے ہجرت کرنے کو تیار۔ چھوٹے موٹے کام کرتے ہوئے اس نے اپنی آزادی کا سودا کبھی نہ کیا۔ اس نے انتہائی حیرت سے نظارہ کیا۔ کہ خود زندگی نے اسے متحرک کر رکھا ہے۔ اس پانی کی طرح جو تیز اک کو سنبھالے رکھتا ہے اور اس کو ڈبو دیتا ہے۔

اس نے ابھی تک خود کو کسی معاہدے کا پابند کرنے سے گریز کیا تھا لیکن وہ اپنی فطرت سے بغاوت نہ کر سکی اور ایک مرتبہ پھر زندگی نے اسے جکڑ لیا۔ اس مرتبہ جس آدمی سے اس کا واسطہ پڑا تھا اس کا نام راشد نہیں تھا لیکن اسے تین ماہ بعد ہی علم ہو گیا کہ سب مرد راشد ہوتے ہیں۔ اس مرتبہ اس نے دوسرے راشد کو پہل نہ کرنے دی اور خود بڑھ کر نجات پا لی۔

پھر وہ اپنی لمبی یاترا سے اچانک لوٹ آئی اس کا کینیڈا کا ویزا مکمل ہو گیا تھا۔

"سارہ ہم دونوں ایک دوسرے کے بغیر نامکمل تھے، ہیں اور رہیں گے۔ زندگی نے ہم سے بہت کچھ لے کر ہمیں کچھ دیا بھی ہے۔ ہمیں شعور اور پہچان دے دی ہے۔ آؤ ہم پھر اپنے ماضی کو حال میں ڈھال لیں۔ ہمیں اب بخوبی علم ہو گیا ہے کہ ہم نے ٹھوکر کہاں کھائی تھی۔ کہاں پھسل کر چلنا ہو گا۔ آؤ سارہ تم کس سوچ میں پڑ گئیں۔ صبح کے بھولے شام کو لوٹ آتے ہیں سارہ!"

سارہ کا دل ایک لمحے کو پگھلا اور وہ خود کردہ ارض پہ محبت کی وینس سمجھنے لگی۔ اس نے سوچا وہ محبت کی ایسی دیوی ہے جو زمین میں دور تک جڑیں چھوڑتی ہے "تاکہ بانجھ اور بنجر

Scan PDF

زمین زرخیز اور سرسبز شاداب ہو سکے۔ دھرتی، سورج، پتھر، چٹانیں سب اسے اپنے وجود کا حصہ محسوس ہونے لگے۔ اس کی ذات میں ساری کائنات سما گئی۔

لیکن وہ لمحہ تیزی سے گزر گیا۔ بالکل اسی طرح جس طرح آیا تھا۔

تب اس نے بڑے پر وقار انداز میں اپنا جھکا ہوا سر اٹھایا اور بولی: "نہیں بزرگو! لوگ شام ڈھلنے کے بعد گھروں کو لوٹتے ہیں ان کی پہچان کھو جاتی ہے۔ وہ بے نام ہو جاتے ہیں۔ تمہاری اور میری طرح۔ ہمارا ماضی اب کبھی حال نہیں بن سکتا۔"

راشد کو یوں محسوس ہوا جیسے کھلے سمندر کے لہردار پانیوں کی ساری کڑواہٹ اس کے اندر اتر گئی ہے۔ وہ نڈھال سا لوہے کے جنگلے کا سہارا لے کر کھڑا ہو گیا اور سادہ ریت پر اپنے پیروں کے نشان کھودتی اس سمت بڑھ گئی جہاں دو لڑکیں ایک دوسرے کو کاٹتے ہوئے گزر رہی تھیں۔

صدا بہار گن

گوہر جان! حوالدار نے چلتے چلتے پلٹ کر دیکھا، چاچا علم دین اور صغراں خاصے پیچھے رہ گئے تھے وہ رک کر ان کا منتظر ہو رہا۔

"بیٹی بشیر کو مجھے پکڑا دے تو تھک جائے گی ——" وہ اپنی بہو سے مخاطب ہوا۔

نہیں چاچا! میں اسے وہاں تک خود لے کر جاؤں گی۔" اس کا لہجہ گمبھیر اور پرسکون تھا۔ ایسا لگا جیسا خاموش پانیوں کے نیچے چکرائے طوفانوں کا لہجہ۔

چاچا خاموش ہو گیا۔ اس نے کچھ کہنا چاہا لیکن آواز جیسے اس کے حلق میں پھنس کر رہ گئی۔ بڑی عجیب سی خواہش تھی صغراں کی بچھڑنے سے اسٹیشن پر اتر کر تانگے پر بیٹھ کر وہ یہاں تک آئے تھے۔ کہ سے آگے راستہ کچا تھا اور انہیں پیدل چل کر جانا تھا۔ چاچا علم دین اور گوہر جان حوالدار دونوں نے بشیر کو گود میں اٹھانے کی خواہش ظاہر کی۔ انہیں علم تھا کہ صغراں پچھلے ایک ہفتے سے بیمار ہے لیکن گھر سے یہاں تک اس نے ایک لمحہ کے لیے بھی بشیر کو خود سے جدا نہ کیا۔

"پاگل ہے" چاچا علم دین نے اپنے گلے میں پھنسے کرب کا گلا گھونٹتے ہوئے دل ہی دل میں کہا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ صغراں یا گوہر جان کے سامنے کسی بزدلی کا مظاہرہ کرے۔ پچھلے دو تین برسوں سے وہ گاؤں والوں سے چھپ چھپ کر بیت رو چکا تھا اور اب تو اسے یقین ہو چکا تھا کہ آنسوؤں کے سوتے خشک ہو چکے ہوں گے۔ لیکن اب جو اچانک یہ کرب اس کے اندر سے پھوٹا

تو اسے یہی گمان گزرا کہ اس کے وجود میں خون کی بجائے آنسوؤں کا سمندر لہریں مار رہا ہے۔

اُن کے قریب آنے پر گوہر جان نے قدم آگے بڑھانا چاہا تو جیسے چاچا ٹھٹھک کر رہ گیا۔

"کیا نام بتایا تھا تو نے بچہ اس جگہ کا؟"

"جامکے۔ چاچا! جامکے۔" گوہر جان نے اس کی طرف مڑے بغیر جواب دیا۔

"جامکے" کا نام سنتے ہی چاچا علم دین کو جیسے ایک دم سے ساری کہانی یاد آ گئی۔ وہ کہانی جسے بھلانے کے لیے اس نے بیس سال کا سنیاس بھگتا تھا۔ بیس سال تک اس نے جس درد کو اندر ہی اندر دبائے رکھا تھا، وہ زہر باد بن کر اس کی شریانوں میں پھوٹ پڑا۔ گاؤں کا نام جان کر علم دین کو یوں لگا جیسے وہ اپنے اندر ہونے والے زوردار دھماکے سے پھٹ کر فضا میں بکھر گیا ہو۔

سرحد یہاں سے بمشکل تین چار میل دور رہی ہوگی۔ اس کے لاشعور سے زینب زندہ پیر کی طرح انگڑائی لے کر جاگ اٹھی۔ بٹالے سے وہ اپنے دو بیل، ایک گدڑا، غلام محمد اور زینب کو لے کے بمشکل ہی قافلے میں شامل ہو پایا تھا۔ باقی سارا اثاثہ تو پہلے ہی لٹ چکا تھا۔ پھر اس کا زینب اور غلام محمد کے سوا اور تھا بھی کیا۔ ساری برادری کی مخالفت مول لے کر اس نے زینب کو اپنایا تھا۔ کس کس نے اسے منع نہیں کیا تھا۔ علم دین میں کیا کمی تھی؟ گھر بار، ڈھور ڈنگر، اپنی زمین کیا نہیں تھا اس کے پاس؟ پھر سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ "برادری" والا تھا۔ ارد گرد کے دس پندرہ دیہاتوں میں تو اس کی برادری کے لوگوں کی چودھراہٹ تھی لیکن تھا راجپوت کا بچہ۔ بس ایک مرتبہ جب زینب سے کھڑی مالی کہہ دیا کہ وہ شادی کرے گا تو زینب سے ورنہ ساری عمر یونہی گزار دے گا تو پھر ڈر کاہے کا۔

اور ایک روز ہرچوال کے راجپوت جیسے زمین میں گڑ گئے۔ جب ان کے لڑکے نے ماچھیوں کی لڑکی سے نکاح کر لیا۔ چوہدری اللہ دسایا نے پہلے تو طیش میں آ کر بھری پنچایت میں اسے عاق کر دیا۔ لیکن ٹوٹی ہانہیں گلے کو ہی آتی ہیں جب اسے علم ہوا کہ اس کا گھبرو پتر سر پر ٹوکری رکھ کر منڈی میں پلے داری کرنے لگا ہے تو جیسے وہ تڑخ کر رہ گیا۔ راجپوتی

آن بان کی خاک بوس عمارت دھڑام سے زمین پر آ رہی اور ہرچوال کے باسی انگشت بدنداں رہ گئے جب انھوں نے ایک روز اپنے منبردار چوہدری اللہ دسایا کو ماچھیوں کے گھروں میں جاتے دیکھا۔ [illegible] چوہدری اللہ دسایا اپنے گھر چل"۔ اس نے زینب کے سر پر شفقت سے ہاتھ رکھ دیا۔ غلام محمد تب [illegible] چار ماہ کا ہوا تھا۔

"میرے ایسے بھاگ کہاں تھے۔ یہ تو بس میرے غلام محمد کی وجہ سے مجھے یہ مان ملا۔" اس نے چوہدری اللہ دسایا کے گھر پہنچتے ہی خوشی سے بے قابو ہو کر علم دین سے کہا۔

"بڑے نصیبوں والا ہے میرا لال۔" علم دین نے بڑھ کر غلام محمد کو گود میں بھر لیا۔

کرنے کو تو چوہدری اللہ دسایا اپنی سی کر گزرا۔ لیکن برادری نے اس کے فیصلے کو بادل نخواستہ ہی قبول کیا تھا۔

بٹوارہ ہوا تو غلام محمد بمشکل ڈیڑھ دو برس کا ہوگا۔ ان کے گاؤں پر جیسے سارے بٹالے کے مسلمانوں نے مل کر حملہ کر دیا تھا۔ کیونکہ ارد گرد کے دیہاتوں سے بھاگ بھاگ کر مسلمان انہی کے ہاں پناہ لے رہے تھے۔ راجپوت بھی کسی مائی کے جنے تھے۔ لڑائی تب ان کے گھروں تک پہنچ پائی جب ایک ایک کر کے سارے کٹ گئے۔ جو بچے وہ نہتے تھے یا زخمی۔ کیا مجال جو جیتے جی انہوں نے کسی کو اپنے گاؤں کی "جوہ" (حدود) میں پھٹکنے دیا ہو۔

کیا کیا عذاب نہیں بھگتا تھا علم دین اور دوسرے قافلے والوں نے یہاں تک پہنچنے کے لیے۔ ابھی وہ سرحد سے بمشکل دس بارہ میل دور تھے جب اچانک ایک منظم بلوائیوں کا گروہ ان پر آن پڑا۔ علم دین نے بیلوں کو بھگانا چاہا لیکن بھوکے پیاسے جانور کہاں تک حقِ نمک ادا کرتے۔ ایک کرپان سے مسلح بلوائی اس کے گدڑے پر بھی چڑھ آیا اس نے کرپان لہرا کر پہلا وار ہی زینب کی آغوش میں دبکے غلام محمد پر کیا تھا۔ زینب نے تڑپ کر بچے کو اپنے نیچے دبا لیا بالکل اسی طرح جیسے کوئی مرغی کسی گدھ کو دیکھ کر اپنے بچوں کو پروں کے نیچے پناہ دیتی

سے لیکن کرپان اپنا کام کر چکی تھی زینب کی گردن ایک طرف سے کٹ کر دوسرے کندھے سے آن لگی۔ علم دین جو بدستور بیلوں کو بھگانے میں مصروف تھا تب چونکا جب وہ لٹ پٹکا تھا۔ زینب کی چیخ نے اس کے تنِ مردہ میں بجلیاں دوڑا دیں اس نے اپنے دائیں ہاتھ رکھی کلہاڑی اٹھائی اور چیتے کی مانند بلوائی پر پل پڑا اور اسے کاٹ کر پھینک دیا۔ پھر وہ دیوانہ وار زینب کی طرف لپکا۔

"زینبے! زینبے!" اس نے زینب کی گردن اپنے زانو پر رکھ کر اسے جھنجھوڑا۔ غلام محمد کو تو جیسے سکتہ ہو گیا تھا۔ علم دین کو یہ خوف لاحق ہوا کہ کہیں دہشت سے اس کا بچہ مر ہی نہ جائے اس نے دوسرے ہاتھ سے اسے اپنے ساتھ چمٹا لیا۔ بیل اپنے مالک کا حقِ نمک ادا کرنے پر تل گئے تھے وہ جان توڑ کر بھاگ رہے تھے۔

"علمے بارب راکھا ..... میرے ..... بچے کا خیال ..... رکھنا ..... میرے کرموں میں اپنا ..... ملک دیکھنا نہیں لکھا ....." زینبے نے آخری ہچکیاں لیں۔

"ہوش کر زینبے! ہوش کر! پاکستان آنے والا ہے! زینبے نہیں! نہیں!"

اوہ میرے مولا۔ علم دین نے زینب کی ڈھلکی گردن دیکھ کر سسکاری بھری۔

اس نے غلام محمد پر لڑکی زینب کی آنکھوں کے پپوٹے بند کر دیے اور اسی طرح نڈھال سا بیٹھا رہا۔ اسے نہ غلام محمد کے رونے کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں نہ ہی قافلے والوں کی چیخ دھاڑ۔ وہاں تو بس وہ تھا اور اس کی زینبے۔ پاکستان کب آیا؟ اور مسلم لیگی ورکروں نے کب اسے زینبے سے الگ کیا اسے کچھ ہوش نہیں تھا۔ وہ تو جیسے خواب میں چل رہا تھا۔

مہاجر کیمپ میں غلام محمد اس کے سینے سے چمٹا رہتا اور وہ ایک کونے میں بیٹھا چپ چاپ فضاؤں میں بکھری اپنی زینب کی یادیں سمیٹتا رہتا۔ کارکنوں نے ہی اس کی تدفین کی تھی۔ پھر وہ وقت بھی آ گیا جب علم دین کو ایک دوسرے ضلع میں تھوڑی سی زمین اور مکان الاٹ کر دیا گیا۔

پانچ سال کا عرصہ کوئی معمولی نہیں ہوتا۔ ہر سال دبے پاؤں آتا اور اس کے نگار خانے پر اپنا قدم رکھتا آگے کو سرک جاتا۔ علم دین باقاعدگی سے ہر سال "جایا کرنا" یہی تو تھا وہ جا کے

جہاں اس کی زینبے دفن تھی۔

بڑا سیلاب آیا تو قبرستان بھی بہہ گیا اور یہ سہارا بھی ختم ہو گیا۔ سارے خاندان نے اس اثنا میں اسے مجبور کیا کہ وہ دوسرا بیاہ کر لے لیکن وہ بھی ایک راجپوتنی کا جنا تھا کہ زینب کو دیا قول کبھی نہ بھلایا تھا جو اس نے زینب سے کہا تھا "اگر اس کی شادی ہو گی تو زینب سے ورنہ نہیں"۔!!

کہہ کہہ کر خاندان والے بھی تھک ہار کر بیٹھ گئے۔ علم دین نے زینب کی امانت میں خیانت نہ کی غلام محمد پر بھی جوانی امڈ امڈ کر آئی۔ جس راہ سے گزرتا گاؤں بھر کی کنواریاں آنکھیں بچھائیں۔

ایک روز سننے والوں نے سنا کہ غلام محمد بھرتی کرنے والوں کی ٹیم کو انٹرویو دینے جا رہا ہے۔ اس وقت علم دین کو یوں لگا جیسے کسی نے ہاتھ بھر کر اس کا کلیجہ باہر نکال لیا ہو۔ کون تھا اس کا؟ تب زینب نے اس کے دل کے نیڑوں پر دستک دی اور اسے مبارک باد دی کہ اس نے زینبے کی امانت کی لاج نبھائی ہے جس روز غلام محمد پہلی بار گاؤں چھٹی آیا اور علم دین کے سینے سے لگا تو اس کی آنکھیں چھلک پڑیں۔ غلام محمد نے آج پہلی مرتبہ باپ کو روتے دیکھا تھا لیکن اسے کون بتاتا کہ علم دین کب کب نہیں رویا تھا۔ یہ الگ بات کہ سب سے الگ تھلگ اس نے اپنے غم کو غم خوار کی بنیا باسپ سے اپنا روگ چھپا رکھا تھا۔!

"آباجی" اس نے حیرانگی سے اپنے باپ کی طرف دیکھا۔

"کچھ نہیں پُتر آج تجھے وردی میں دیکھا تو خوشی سے آنسو نکل آئے۔ تیری ماں جیوندی ہوتی تو کتنی خوش ہوتی۔"

سال بعد ہی اس نے غلام محمد کو بیاہ دیا اور جب اس روز وہ بیٹے کی پیدائش کے چھ سات ماہ بعد چھٹی آیا تو علم دین کے گھر دیگیں چڑھیں۔ اس نے اپنے پوتے بشیر کی خوشی اپنے پتر کی آمد پر لٹتی چھٹیوں کے جھگل پانچ روز بعد ہی ناپیک غلام محمد کو بلاوا آ گیا بھارت نے پاکستان پر حملہ کر دیا تھا اسے ایمرجنسی واپس بلا لیا گیا۔

گاؤں کے اسٹیشن تک وہ سب اکٹھے ہی آئے تھے پھر علم دین اسے کندھے پر ہاتھ رکھ کر الگ

ایک کونے میں لے گیا۔ اس کا سینہ دھونکنی کی طرح چل رہا تھا۔

"پتر میں اس دن کا پچھلے اٹھارہ سال سے انتظار کر رہا ہوں۔ پتر ان لوگوں نے تیری ماں کو مجھ سے چھین لیا تھا۔ تب میں اکیلا تھا اور نہتا بھی۔ میرا انتقام لینا بچہ! اپنی ماں کا بدلہ ضرور لینا۔ تو اکیلا نہیں! نہتا بھی نہیں ہوگا تو۔ بچہ یہ سب بلوائی ہیں۔ بڑے خونخوار لوگ ہیں یہ۔ انہیں بتا دینا پتر کہ اب غلام محمد جوان ہو گیا ہے وہ اپنے ماں کے دودھ کی لاج پال سکتا ہے۔"

دور سے گاڑی کے وسل کی آواز سنائی دی تو علم دین نے ہٹ جانا ہی مناسب سمجھا۔ بھوکو کی کو ابھی کچھ کہنا سننا تھا۔

"چنگا بچہ اللہ بیلی۔ جیوندیاں دے میلے۔"

نائیک غلام محمد صغراں کے قریب پہنچا تو بشیر ہمک کر اس کی باہنوں میں آ رہا۔ صغراں دست بڑا کم ہے۔ میں جینے کی خواہش لے کر نہیں جا رہا۔ دعا کرنا اللہ سرخروئی عطا کرے۔ قسمت پھر کچھ کہنے سننے کا موقع دے نہ دے۔ میری امانت کی رکھی کرنا جس طرح میرے باپ نے میری ماں کی امانت کو سنبھالا تھا۔" وہ نجانے کیا کہتا رہا۔۔۔ صغراں بے بسی سے آنسو بہاتی رہی۔ اس کے سینے میں غلام محمد کی جاٹ ذلاد کا دل تو تھا نہیں۔

گاڑی میں غلام محمد بیٹھا تو صغراں نے روتے روتے اس کے ہاتھ میں سرخ کڑھائی والا رومال تھما دیا۔ غلام محمد نے چند ثانیے ٹکٹکی باندھ کر اسے دیکھا پھر اپنی اگلی جیب میں رکھ لیا۔ گھی والے پراٹھے اور اچار ایک دوسرے دسترخوان میں بندھے اس کے قریب رکھے تھے اکرنے کھڑکی سے سر باہر نکال کر اپنے بیٹے کے گال پر بوسہ دیا اور گاڑی رینگنے لگی۔ علم دین ان دونوں سے ذرا پرے کیچے پر مل رکھے کھڑا تھا۔ گاڑی رینگی تو وہ بے اختیار آگے بڑھا اور چلتی گاڑی سے باہر نکلے غلام محمد کے سر کو چوم لیا۔ گاؤں کے لوگ اس وقت تک گاڑی کے ساتھ ساتھ بھاگتے رہے جب تک ان کا غازی مرد ان کی نگاہوں سے اوجھل نہ ہو گیا۔ علم دین البتہ وہیں کھڑا رہا۔ سسکیاں بھرتی صغراں اس کے سینے سے آن لگی تھی۔

جس روز غلام محمد سرخرو ہو کر لوٹا چاچا علم دین کا جلال دیدنی تھا۔ لاش فوجی ٹرک میں آئی تھی۔ اس کی یونٹ کے جوانوں نے تابوت کو پھولوں سے بھر دیا تھا۔ غلام محمد گلاب کے پھولوں میں کھیلا پڑا تھا۔

"خبردار کوئی نہ رونا۔ میرے بچے نے میرا مان بڑھایا ہے۔ زینبے زینبے! دیکھ رہی ہے اپنے لال کو۔ تیرے پاس آ گیا ہے زینبے مجھے اکیلا چھوڑ کر۔۔۔" حوالدار گوہر جان نے چاچا علم دین کو بازو پکڑ کر وہاں سے ہٹا دیا۔

ارد گرد کے سارے گاؤں اس کے لال کی "بارات" پر امڈ پڑے تھے۔ فلک نے ایسا جنازہ نہ کبھی دیکھا نہ ہی اس گاؤں سے پھر کوئی اس دھج سے اٹھا۔ عدت کے ایام پورے ہوئے تو صغراں کے والدین اسے لینے آئے۔

"کونسا گھر۔ میرا گھر تو یہی ہے۔" اس نے جانے سے انکار کر دیا۔

چاچا علم دین دہل اٹھا۔ "خدایا! تاریخ کیا خود کو دہرائے گی۔" اس نے ایک سال تک سارے ہی حربے آزما لیے لیکن صغراں نے کبھی خود کو بیوہ نہ جانا۔ وہ نائیک غلام محمد کے چوکھٹ سے یوں لگی کہ پھر کبھی نہ اٹھی۔ دو سال تک چاچا علم دین کی خواہش رہی کہ وہ خود اپنے بچے کی شہادت گاہ دیکھے۔ وہ ان راہوں کی دھول کو اپنی آنکھوں سے چھونا چاہتا تھا جہاں اس کے جیالے شہید نے اپنے قدم رکھے تھے۔ تین سال بعد ایک روز حوالدار گوہر جان اپنا وعدہ پورا کرنے آ گیا۔

اس روز سارا گاؤں حیران رہ گیا جب صغراں نے اپنا سہاگ کا جوڑا پہنا۔ وہ دلہن بنی بیٹھی تھی۔ گاؤں والے رخصت کرنے اسٹیشن تک گئے اور وہ لوگ "جائے" پہنچ چکے تھے۔ علم دین کے گبھرو نے اسی مقام پر اپنی ماں کا قرض چکایا تھا جہاں وہ دفن تھی۔

کھیتوں کے سلسلے کے نزدیک ایک جگہ پہنچ کر گوہر جان رک گیا۔ گاؤں کے لوگوں نے یہاں ایک چھوٹی سی خانقاہ بنا رکھی تھی۔ جہاں طاقچوں میں بچے ہوئے دیئے رکھے تھے انہوں

SCANNED BY CamScanner

جشنِ علی

میرا جنم ایسے گھرانے میں ہوا جہاں صبح کی کھا کر شام کی فکر دامنگیر ہوا کرتی ہے۔ اپنی سفید پوشی کا بھرم رکھنے کے لئے میرے والد کو کیا کیا پاپڑ بیلنے پڑتے تھے۔ اس کا اندازہ کچھ میں ہی لگا سکتی ہوں۔ اکاؤنٹنٹ تھے بیچارے، صبح سے شام تک دفتر میں فائلوں سے مغز ماری کرتے، شام کے بعد کسی فرم میں پارٹ ٹائم کرنے چلے جاتے۔ رات کو جب وہ سائیکل پر تھیلا لٹکائے جس میں اکثر ان کے کام سے متعلق کاغذات ہوا کرتے تھے، گھر میں داخل ہوتے تو میں کٹ کر رہ جاتی۔

گھر میں سب سے بڑی اولاد میں تھی۔ میرے بعد دو بہنیں اور ایک بھائی شاید یہی وجہ تھی کہ میں ان کے دکھ کو سب سے زیادہ شدت سے محسوس کرتی۔ میرے ابو بلاشبہ مردانہ وجاہت کا مکمل نمونہ اور باوقار شخصیت کے حامل تھے۔ انہوں نے بڑی محنت سے انٹر کیا تھا۔ انٹر کے بعد شادی کر لی۔ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے زندگی نے انہیں کبھی پل بھر سستانے کا موقع نہیں دیا۔ ہم چاروں بھائی بہن بمشکل ڈیڑھ دو سال کے وقفے سے وارد ہوئے تھے۔ میری ماں نے انہیں صرف بچے دیئے تھے سکھ کی چھایا کبھی ان پر نہ پڑنے دی۔ وہ ہمیشہ ایک ہی بات کہا کرتی تھیں۔

"میری تو قسمت پھوٹ گئی۔ جانے کس منحوس گھڑی میرے والدین نے ہاں کر دی تھی۔ کیسے کیسے رشتے آئے تھے میرے لئے، بجائے انہیں کیا نظر آ گیا تھا۔ اس موئے کلرک کے بچے میں۔" میرے والد سر جھکائے ان کی باتیں سنتے اور صرف مسکرا کر رہ جاتے۔ باتیں کرتے کرتے وہ اپنا زاویہ نگاہ

نے کئی مرتبہ یہاں سے روشنی پھوٹتے دیکھی تھی اور اب اس جگہ کو عقیدت گاہ بنا لیا تھا۔

"یہ ہے وہ جگہ چاچا جہاں نائیک غلام محمد مورچہ بند تھا۔" اس نے ہاتھ کے اشارے سے اس جگہ کی نشاندہی کی۔

"اور یہاں وہ گن دشمن نے چھپا رکھی تھی۔" اس نے خانقاہ کی طرف اشارہ کیا۔ "جہاں سے رینگتا رینگتا غلام محمد یہاں پہنچا۔ اس جگہ اس کے سینے میں برسٹ لگا۔ یہاں سے اگر بچ نکلتا تو دوسرے نگائی اور گن پر گرنیڈ پھینک دیا۔" اس سے آگے گوہر جان کچھ نہ کہہ سکا اس کا گلا رندھ گیا۔

صغراں نے سب سے پہلے آگے بڑھ کر اس مٹی کو بوسہ دیا۔ پھر چاچا علم دین سحر زدہ سا آگے بڑھا اور اس کی دیکھا دیکھی گاؤں کے ان لوگوں نے بھی جو وہاں اکٹھے ہو گئے تھے دعا کو ہاتھ اٹھا دیئے۔ آنسوؤں سے دھندلائی آنکھوں سے پلٹ کر اس نے ننھے بشیر کی طرف دیکھا جو اپنی ماں کے قریب ہاتھ اٹھائے کھڑا تھا۔ پھر بشیر میں سے غلام محمد کی ارزتی شبیہہ ابھری اور چاچا علم دین نے اپنی پگڑی کے پلو سے آنکھیں پونچھ کر اسے بے اختیار سینے سے چمٹا لیا۔ شام کے سائے لمبے ہونے لگے تھے اور سورج کا آتشیں گولا ریلوے لائن کے پار درختوں کے وسیع سلسلے میں ڈوب رہا تھا۔ گاؤں کے لوگ عقیدت سے آنکھیں جھکائے سدا سہاگن کے گرد دائرہ باندھے کھڑے تھے۔

Scan by PJF

بدنیتیں اور ہم سے مخاطب ہو جاتیں۔ "سارے خاندان کی ناک کٹتی ہیں۔ کیسی کیسی بدصورت لڑکیاں لگیھرے اڑا رہی ہیں اور میں.... ہائے ری قسمت !"

ابو چپ چاپ کھڑے رہتے۔ جب امی کا غصہ عروج پر پہنچ جاتا تو دوسرے کمرے میں جا کر دفتر کی فائلوں میں گم ہو جاتے۔

بیوی اچھی مل جائے تو زندگی کے آدھے دکھ اپنی موت خود ہی مر جاتے ہیں لیکن میری ماں جیسی بیویاں خاوندوں کی زندگیوں ہی کو گھن نہیں لگاتیں۔ اولاد کی زندگیوں میں بھی زہر گھول دیتی ہیں۔ میرے لاشعور میں انہوں نے کم از کم یہ بات ضرور بٹھا دی تھی کہ غریب خاوند کے گھر جانے سے لڑکی کا مر جانا بہتر ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ میری والدہ خاندان بھر میں چندے آفتاب چندے ماہتاب تھیں، لیکن میرے والد میں کیا کمی تھی؟ وہ خوبصورت تھے۔ تعلیمیافتہ تھے۔ اگر زندگی نے انہیں آگے بڑھنے کا موقع نہیں دیا تو اس کی وجہ ان کی نالائقی نہیں بلکہ بستی شرافت تھی جس نے انہیں ساری زندگی مکروہ ہتھکنڈے اپنانے سے باز رکھا۔

میرے والد کا جنم مذہبی گھرانے میں ہوا اور وہ والدہ کے دُور پار کے رشتہ دار بھی تھے۔ ان کی خاندانی شرافت کے پیش نظر ہی میرے نانا نے ان کا انتخاب کیا تھا۔ حالات نے ان کی کمر خمیدہ کر دی تھی لیکن ان کی آنکھوں کی چمک کبھی ماند نہ پڑی۔

میٹرک پاس کرنے تک میرے ذہن میں یہ بات اچھی طرح سما چکی تھی کہ میں اپنے سکول کی سب سے زیادہ حسین لڑکی ہوں اور میرا خاوند کوئی لکھ پتی گلفام ہی بن سکتا ہے۔ یہ بات میرے لاشعور میں راسخ بس گئی تھی کہ میرے پاس آسمان کی بلندیوں کو چھونے کے لئے صرف ایک ہی سیڑھی ہے میرا حسین سراپا! اگر میں نے اس سے فائدہ نہ اٹھایا تو ساری زندگی ماں کی طرح چولہا جھونکنے اور بچے جننے میں بیت جائے گی۔

میری طرح میری ماں کی سوچ بھی یہی تھی۔ شاید اس لئے وہ مجھے بناسنوار کر رکھا کرتی تھی۔ کسی بھی تقریب میں نگاہوں کا مرکز صرف میری ذات بنتی تھی۔ میٹرک پاس کرتے ہی میرے لئے رشتے

آنے شروع ہو گئے، لیکن میری ماں نے کسی کو در خود اعتنا نہ جانا۔ وہ تو کسی کروڑ پتی کے ہاتھوں میں میرا ہاتھ دینا چاہتی تھی۔ خدا جانے یہ ابو کی بے پناہ مصروفیت یا ان کی لاعلمی کہ وہ ان باتوں سے لاتعلق رہتے۔ میری والدہ خود ہی آنے والوں سے باتیں کرتیں۔ دو تین دفعہ تو میں ان کے ہاں میرے بہن بھائیوں کے سامنے اڑاتیں اور بعد میں ٹکا سا جواب انہیں مل جاتا۔ ابو کے متعلق استفسار کرنے پہ انہیں ایک ہی جواب ملتا۔

"انہوں نے اس معاملے میں مجھے مکمل اختیار دے رکھا ہے۔"

اس دوران میں میں نے ایف۔ اے میں داخلہ لیا۔ لیکن ہمارے خاندان میں لڑکی کی شادی تھوڑی عمر میں ہی طے کر دی جاتی تھی۔ اس لئے میرے ایف۔ اے کرنے کی امید کم ہی نظر آتی تھی۔ پھر میرا خیال تعلیم کی طرف تھا ہی کہاں۔ مجھے تو بس اٹھتے بیٹھتے، سوتے، جاگتے مستقبل کے سنہری سپنے ہی دکھائی دیتے تھے۔ ان خوابوں نے مجھے تخیل پرست بنا دیا اور مزید دماغ روز روز رشتے لانے والوں نے خراب کر دیا۔ اب میں واقعی اپنے آپ کو ایسا جاننے لگی۔

ایک روز ہمارے ایک دُور کے رشتے کی خالہ نے میری والدہ سے اپنے بیٹے کے لئے میرا رشتہ مانگا۔ ان کا بیٹا ایف۔ اے کر کے حال ہی میں ایک دفتر میں ملازم ہوا تھا۔ لڑکے کا نام خالد تھا۔ اتفاق سے خالد میرے ابو کے دفتر ہی میں کام کرتا تھا اور عام نوجوانوں سے بالکل الگ تھلگ۔ ابو سے اس کی ملاقات دفتر کی مسجد ہی میں ہوا کرتی تھی۔ ابھی اسے اس بات کا علم نہیں تھا کہ میں ان کی بیٹی ہوں یا ابو ان کے دور کے رشتہ دار ہیں۔ یہ لوگ حال ہی میں ایک دوسرے شہر سے یہاں منتقل ہوئے تھے اور اپنے کچھ رشتہ داروں کا دم غنیمت جان کر ہمارے خاندان میں آنے جانے لگے۔ میری ایک کزن کی شادی پہ خالد اور اس کی ماں نے مجھے دیکھا اور اپنے بیٹے کی خواہش پر ہی وہ بیچاری میرا رشتہ مانگنے چلی آئی تھی۔ جب امی کو علم ہوا کہ خالد ابو کے دفتر میں ہی کام کرتا ہے تو ان کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ بجائے شائستہ طریقے سے جواب دینے کے انہوں نے بیچاری خالہ کو بے نقط سنائیں اور ان سے الجھنے لگیں کہ آخر خالہ نے کس منہ سے ان کی میرے جیسی لڑکی کا رشتہ مانگا ہے۔

خالہ بیوہ عورت تھیں۔ خاوند جوانی ہی میں فوت ہو گیا۔ لے دے کر ایک بیٹا ہی ان کا سرمایۂ حیات

SCANNED BY CamScanner

تھا۔ بیچاری نے خود کو تج کر بیٹے کو پالا پوسا اور اس قابل کیا تھا۔ ایک تو ان کی اپنی مرضی اوپر سے بیٹے کی خواہش، جانے کتنے ارمانوں سے آئی تھیں وہ۔ اب جو امی نے ان سے ایسا سلوک کیا تو بے بسی سے ان کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ میں حسبِ سابق دوسرے کمرے کے کواڑوں سے لگی سارا تماشہ دیکھ رہی تھی، نجانے کیوں مجھے خالہ پر رحم آنے لگا اور ایک نرم گوشہ میرے دل میں ان کے لئے آپ ہی آپ خالی ہوگیا۔

کسی طرح میرے والد صاحب کو اس بات کا علم ہوگیا۔ انہیں سخت صدمہ پہنچا۔ خالد کا کردار ان کے سامنے تھا اور اپنی مالی حیثیت کا احساس بھی انہیں خوب تھا۔ اس طرح تو میری ماں مجھے گھر بیٹھا کر سودا بازی میں لگی رہتی اور ایک دن وہ بھی آجاتا جب کوئی میری طرف دیکھنا گوارہ بھی نہ کرتا۔ شاید اسی روزِ بد سے بچنے کے لئے میرے ابو نے براہِ راست معاملہ اپنے ہاتھ میں لینے کا فیصلہ کرلیا۔

اس روز وہ گھر واپس آئے تو امی مجھے بنا سنوار کر ایک رشتے دار کے ہاں کسی تقریب پہ لے جا رہی تھیں۔

"بشریٰ میری بات سنتی جانا بیٹی۔" ابو نے ان کے لہجے میں ایسی کیا بات چھپی تھی کہ میں ٹھٹک کر رہ گئی۔

"کیا بات ہے؟ کیا مصیبت آگئی؟" میری بجائے امی نے چلاتے ہوئے کہا۔

"خاموش رہو۔ مجھے اپنی بیٹی سے کچھ کہنا ہے۔" والد صاحب کی آواز آج قدرے اونچی تھی۔ اور انہوں نے یہ فقرہ بھی براہِ راست امی کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے ادا کیا۔

"سبحان اللہ ساری زندگی تو خبر نہ لی آج بیٹی یاد آگئی۔ کیا کیا ہے تم نے بیٹی کے لئے؟ کون سے سونے کے ہنس پہنا دیئے ہیں اسے"؟ امی کا پارہ چڑھنے لگا۔

"شریا خاموش رہو۔" ابو کے لہجے میں چھپے قہر کو میں نے محسوس کرلیا تھا۔

امی پہلے تو حیرت سے ان کی طرف دیکھتی رہیں، شاید وہ ابو کے اس روپ کو پہچاننے کی کوشش کر رہی تھیں۔ پھر غصے سے پیر پٹختی باہر نکل گئیں اور دوسرے کمرے میں جا کر رونے لگیں۔

"تم ادھر آؤ بیٹی" ابو نے مجھے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔

میں سحر زدہ سی ان کے پیچھے پیچھے دوسرے کمرے میں چلی آئی۔ وہ میرے قریب بیٹھ گئے اور بڑی شفقت سے میرے سر پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے بولے۔

"بیٹی تم سمجھدار ہو اور حالات بھی تمہارے سامنے ہیں۔ جس راستے پہ تمہاری ماں تمہیں لے جا رہی ہے وہاں سوائے ذلالت کے اور کچھ نہیں۔ میں نے تمہیں ایک ہی سبق سکھایا ہے کہ ہر حال میں قناعت کرو اور خدا کے شکر گزار رہو۔ میں اپنے ضمیر کے سامنے اس لئے بھی مطمئن ہوں کہ میں نے تمہاری فلاح کے لئے کبھی کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی۔ بیٹی! ہر ماں باپ کی خواہش ہوتی ہے کہ ان کی بیٹی جس گھر میں جائے راج کرے اور زندگی کی تمام خوشیاں اس کی جھولی میں ڈال دیں، لیکن اپنی چادر سے باہر پاؤں پھیلانے والوں کا انجام کبھی اچھا نہیں ہوا۔ ایک باپ ہونے کے ناطے مجھے تمہارے ساتھ ایسی گفتگو کرنا کچھ عیب سا لگتا ہے، لیکن تمہاری ماں میری آنکھوں کے سامنے تمہیں جہنم میں جھونک دے یہ میری برداشت سے باہر ہے۔

خالد جیسا شوہر کسی لڑکی کو خوش قسمتی سے ملتا ہے۔ کس بات کی کمی ہے اس میں شرافت، محنت کیا نہیں ہے اس کے پاس؟ دولت تو بیٹی ڈھلتی چھایا ہے۔ یہ کسی کے آنگن میں کب بسیرا کرے۔ کوئی نہیں جانتا۔ میری خواہش ہے کہ تمہاری نسبت خالد سے طے ہو۔ یہ بات اپنا حق جان کر ہی کہہ رہا ہوں اور اپنی نیک بیٹی سے مجھے یہ امید ہے کہ وہ اپنے باپ کے جذبات کا احترام کرے گی"۔

انہوں نے یہ ساری باتیں بڑے ملائم اور محبت بھرے لہجے میں میرے ذہن میں اتاریں، میری آنکھیں چھلک پڑیں۔ ابو نے اپنی زندگی ہمارے نام کردی اور کسی سے کبھی کچھ نہ مانگا۔ آج وہ اپنی بیٹی سے اپنا حق مانگ رہے تھے۔ میں سسک پڑی اور ان کے سینے سے لپٹ گئی۔ میرے منہ سے بمشکل "ابو" نکل سکا۔ اور پھپک پھپک کر رونے لگی۔

اُسی روز ابو خود خالہ کے گھر گئے اور امی کے سابقہ رویئے پہ معذرت کرتے ہوئے انہوں نے خالہ کو گھر آنے کی دعوت دی۔ خالہ پھپھی کے روز ایک بزرگ کے ساتھ آئیں اور والد صاحب نے اپنی رضامندی کا اظہار کردیا۔ آنے والے بزرگ نے امی کے رویئے پر تشویش ظاہر کی، لیکن ابو نے

WAQAR SCANNER

انہیں مطمئن کر دیا۔ جب امی کو پتہ چلا کہ ابو نے بات پکی کر لی ہے تو انہوں نے رو رو کر اور ابو کو بد دعائیں دے دے کر آسمان سر پہ اٹھا لیا۔ ابو ان تمام باتوں سے لاتعلق اپنے کمرے میں بیٹھے رہے اور میں چھپر کا بُت بنی اپنے نصیبوں پہ آنسو بہاتی رہی۔

میں نے ہاں تو کر دی، لیکن اپنا مستقبل مجھے صاف نظر آ رہا تھا۔ ایک کلرک مجھے کیا دے سکتا تھا؛ میرے سارے سپنے ریت کے گھروندوں کی طرح بکھر گئے۔ سارے ارمان دل ہی دل میں گھٹ کر رہ گئے۔ تشنہ خواہشات کے ساتھ زندگی کیسے بسر ہو گی؛ یہ سوچ کر میں دل مسوس کر رہ جاتی۔ گھر میں امی ابو کی چخ چخ اب روزانہ کا معمول بن کر رہ گئی۔ ابو کے رویے میں بھی اب ایک درشتگی سی آ گئی تھی۔ وہ اکثر الجھے الجھے خود سے دست و گریباں سے دکھائی دینے لگے تھے۔

ایک سال اسی ذہنی عذاب میں گزر گیا۔ میں تو حالات سے اتنی بد دل ہو چکی تھی کہ پڑھائی چھوڑ کر گھر بیٹھ رہی۔ پھر ایک روز سادہ سی تقریب میں میرا اور خالد کا نکاح بھی نپٹا گیا۔ خالد تو اسی روز مجھے دلہن بنا کر لے جانے پہ مُصر تھا لیکن ابو نے بجانے یہ کیوں گوارا نہ کیا۔ امی نے اس تقریب میں شرکت نہ کی اور ناراض ہو کر سیکے چلی گئیں۔ انہوں نے میری رخصتی کی تقریب میں شرکت بھی بادلِ نخواستہ ہی کی تھی۔ اس دوران میں ان کی صرف ایک ہی خواہش رہی کہ کسی نہ کسی طرح میرا رشتہ ٹوٹ جائے۔ میری رخصتی پر وہ میرے گلے لگ کر روئیں تو بھی ایک ہی فقرہ ان کی زبان سے بار بار ادا ہو رہا تھا۔

"لے گئے میری بیٹی کو جہنم میں جھونک دیا۔"

جن نامساعد حالات میں میری رخصتی ہوئی مجھے یقین تھا اب سسرال والے گن گن کر بدلے چکائیں گے کیونکہ میری ماں نے ان کی بے عزتی میں بھی کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی تھی۔ لیکن پہلے ہی روز نتیجہ میری توقعات کے برعکس نکلا۔ سسرال میں میرا استقبال بہو کی نہیں بیٹی کی حیثیت سے کیا گیا۔ پہلی ہی رات میرے خاوند نے میرے تمام شکوک رفع کر دیئے۔ انہوں نے مجھے یقین دلایا کہ میری ماں کی کسی بات کا انہوں نے کبھی برا نہیں منایا اور یہ کہ انہوں نے "جہنگا سودا" نہیں کیا۔

دو سال کا عرصہ پلک جھپکتے گزر گیا۔ میرے خاوند نے حتی المقدور مجھے دنیا کی ہر آسائش مہیا کی۔

ساس نے ماں سے بڑھ کر پیار دیا۔ دو سال بعد ننھا عارف جب دنیا میں آیا تو گویا میں اپنے گھر کی سلطنت کی بے تاج ملکہ بن گئی۔ میری تمام جائز ضروریات پوری ہو جاتی تھیں۔ ساس نے کبھی مجھے کسی بات کا حکم نہ دیا۔ مجھے کبھی زیادہ تر وہ خود ہی سنبھالتیں۔ اس دوران میں جب کبھی میں امی کے ہاں گئی یا وہ ہمارے ہاں آئیں انہوں نے مجھے کرید کرید کر سسرال کے خلاف باتیں پوچھنا چاہیں، لیکن کوئی گلہ مجھے ان سے نہیں ہوتا تھا میں کہتی۔

"ضرور توڑتی ہے بیٹی! میرا دل نہیں مانتا اس نصیبوں جلی بیوہ نے تجھے سکھی رکھا ہو۔" میری طرف سے حسبِ توقع جواب نہ ملنے پہ وہ خود بخود بولنا شروع ہو جاتیں۔ خود سے کوئی نظریہ قائم کر کے اس پہ خواہ مخواہ میری ساس سے لڑنا جھگڑنا شروع کر دیتیں، جو بیچاری بیٹے اور بہو کی خوشنودی کے لئے ان کی کسی بات کا جواب نہ دیتیں اور سر جھکائے ان کے طعنے سنتی رہتیں۔

شادی کو تین سال گزر گئے، لیکن حالات جوں کے توں رہے۔ ہمارے معمولات میں کوئی تبدیلی نہ آئی۔ خالد صبح دفتر چلے جاتے، شام کے بعد ان کی واپسی ہوتی۔ مہینے کے بعد پوری تنخواہ لا کر میرے ہاتھ پر رکھ دیتے۔ مجھے مطمئن رکھنے کے لئے انہوں نے سو سو جتن کئے۔ میری ماں کی کڑوی کسیلی باتوں کو سہم کیا، لیکن وہ زہر جو کم عمری سے امی نے میرے لاشعور میں گھول دیا تھا؛ کی تلخیوں سے میں کبھی چھٹکارا نہ پا سکی۔ ایک خلش سی اندر ہی اندر مجھے بے چین کئے دیتی۔ جب کسی پارک میں سیر کرتے ہوئے کسی سینما ہال میں فلم دیکھتے ہوئے میں اپنے سے کئی گنا کمتر لڑکیوں کو قیمتی کپڑوں میں ملبوس کاروں میں سوار خوشحالی اور فارغ البالی سے قہقہے لگاتے دیکھتی تو ایک بے نام سی خواہش میرے اندر ابھرنے لگتی۔ کاش میں بھی کسی ایسے ہی گھر میں بیاہی جاتی۔

کسی نہ کسی طور سے اس خواہش کو میں نے اپنے اندر ہی دبائے رکھا۔ لیکن تین سال بعد اس خاموش گرداب میں پہلا کنکر خالد کے ایک دوست پرویز نے پھینکا۔ اداس ہیں ایسے ایسے جھکور اٹھے کہ میں جن میں ڈوب ڈوب کر ابھری اور ابھر ابھر کر ڈوبی۔ پہلی مرتبہ کسی نے مجھے میری اہمیت کا احساس دلایا تھا۔ پرویز، خالد کے دفتر ہی میں کام کرتا تھا۔ اس کی تنخواہ تو خالد سے کم تھی۔ لیکن بڑے بڑے افسر اس کا پانی

SCAN BY PAKSOCIETY.COM

بھرتے تھے۔ وہ چند سو روپے تنخواہ وصول کرنے والا لکھ پتی کلرک تھا۔ شہر میں تین تو اس کی ذاتی کمپنیاں چل رہی تھیں جن کا علم سارے دفتر کو تھا اور حصہ داری میں جو کام اس نے سنبھال رکھے وہ اس کے علاوہ تھے۔ خالد جیسے شریف الطبع نوجوان سے اس کی دوستی کیوں تھی اس کا علم مجھے کافی دیر بعد ہوا۔ پرویز بڑا گھاگ نوجوان تھا۔ وہ تجربہ کار شکاریوں کی طرح اپنے شکار کو بھگا بھگا کر اتنا تھکا دیا کرتا تھا کہ وہ خود ہی اس کی جھولی میں آگرے۔

ہم سے ملاقات کے دوسرے ہی روز اس نے خالد کو اپنے ساتھ پکنک منانے کی دعوت دے ڈالی اور پہلی ہی دعوت میں دو معنی فقروں میں اس نے اپنا مدعا بیان کر دیا پھر تو ہر دوسرے ہفتے ہمارا یہ معمول بن گیا۔ پرویز ضد کر کے مجھے شاپنگ کے لئے لے جاتا اور میرے نہ نہ کرنے کے باوجود ہر دوسرے تیسرے ہفتے زبردستی ایک دو پیکٹ میری طرف سرکا دیتا۔ وہ دھیرے دھیرے میرے حواس پہ چھاتا گیا اور میں اس کی چکنی چپڑی باتوں میں آتی گئی۔ آہستہ آہستہ وہ دور بھی آیا جب میں نے اس کے ساتھ جانے کے لئے خالد سے اجازت لینا بھی چھوڑ دی۔ خود اس نے بھی تو کبھی اس بات کا نوٹس نہیں لیا تھا۔ جب اسے احساس ہوا تو معاملہ اس کے بس سے باہر نکل گیا۔ ایک دو مرتبہ اس نے مجھے اشاروں کنایوں میں تصویر کا صحیح رخ دکھانے کی کوشش کی لیکن میں نے اس کی بات پر کان نہ دھرے۔

"تمہیں شک ہے مجھ پہ؟" میں جھنجھلا کر اس سے کہتی۔

"بشریٰ خدا کے لئے عقل کے ناخن لو۔ تم بات کو سمجھنے کی کوشش کیوں نہیں کرتیں۔ وہ میرا دوست ہے اور تم میری بیوی ہو اور زمانہ ....." وہ معذرتی لہجہ اختیار کرتا۔

"جہنم میں جائے زمانہ۔ جب ہمارے دل صاف ہیں تو کوئی ہم پہ شک کیوں کرنے لگا۔" میں اس کی بات کاٹ دیتی۔

"او میری جان تمہارے دل کا الیکسرے کوئی نہیں دیکھے گا۔ دنیا کو ہمارے ظاہر سے مطلب ہے باطن سے نہیں۔" وہ ناصحانہ انداز میں کہتا۔

"تمہاری بات میرے پلے نہیں پڑتی۔" میں بالآخر زچ ہو کر جواب دیتی اور وہ چپ چاپ

عارف کو گود میں اٹھائے باہر نکل جاتا۔

میری امی کو جب پرویز کی اور میری ملاقات کا علم ہوا تو گویا بلی کے بھاگوں چھینکا ٹوٹا۔ وہ مجھے کسی نہ کسی بہانے گھر بلا لیتیں پھر پرویز آن ٹپکتا اور میں گھنٹوں اس کی باتوں میں کھوئی رہتی۔ پرویز کی آبائی گاؤں میں اس کے والدین کے پاس رہتی تھی۔ شہر میں اس نے عالیشان مکان بنا رکھا تھا۔ جہاں وہ اکیلا رہا کرتا تھا۔

اس روز جب میں کسی کام سے بازار گئی تو راستے میں وہ مجھے مل گیا۔ ہم دونوں ایک ریستوران میں چلے آئے۔ عام حالت میں ایسے کسی ریستوران کے قریب پھٹکنے کی جرأت بھی نہ کر سکتی۔

"اچھا ہوا آپ آج راستے ہی میں مل گئیں۔" اس نے بیرے کو مشروبات کا آرڈر دے کر بات کے لئے تمہید باندھی۔

"ورنہ کیا ہوتا....." میں نے جانے کیوں اس سے کہہ دیا۔

"میں آپ کو اغوا کر کے لے جاتا۔" اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"اتنی ہمت ہے آپ میں؟" میں بھی بازی ہوئی جا رہی تھی۔

"ارے ہمت شہزادی! وہ مجھے اسی نام سے مخاطب کیا کرتا تھا) ایک بار آزما کر تو دیکھو۔" اس کے لہجے میں چھپے اعتماد نے اس روز میرا ایمان بھی ڈگمگا دیا۔

مشروبات آنے تک ہم اسی طرح فقروں کا تبادلہ کرتے رہے۔ پھر وہ اصل مدعا کی طرف آگیا۔ بڑی خوبصورتی سے اس نے بات امی اور میرے سسرال کے درمیان اختلافات سے شروع کی تھی۔

"ذہنی طور پر خالہ نے آپ کی شادی کو قبول نہیں کیا۔ آپ اتنی ظالم نظر تو نہیں آتیں کہ اس ماں کو جس نے آپ کو شہزادی بنانے کے خواب دیکھے تھے اس طرح دھتکار دیں کہ ان کا دل ٹوٹ جائے۔"

"میں مجبور تھی پرویز صاحب۔" بے اختیار میرے منہ سے نکل گیا۔ مجھے بعد میں اپنی غلطی کا احساس بھی ہوا۔

موجودہ زندگی کے تلخ حقائق کا احساس اور مستقبل کے سنہرے سپنے دکھا کر آہستہ آہستہ اس نے

WAQAR
Scan & PDF

میرا ذہن ماؤف کر دیا۔

"مجھ سے یہ سب کچھ برداشت نہیں ہوتا۔ شہزادی تم محلوں میں راج کرنے والی ہو۔ سڑکوں پر دھکے کھانا تمہیں زیب نہیں دیتا۔" اس نے میری دکھتی رگ چھیڑ دی۔ میں سحر زدہ سی اس کی باتوں سے پگھلتی چلی گئی۔ اس نے کچھ اس انداز سے مجھے اپنی بے بسی کا احساس دلایا کہ میری آنکھیں چھلک پڑیں اور مجھے خواہ مخواہ خود پر ترس آنے لگا پھر لوہا گرم دیکھ کر وہ فوراً چوٹ کر گیا۔

"شہزادی ہر شخص کی زندگی میں کوئی نہ کوئی روگ ضرور لگا ہوتا ہے۔ میری خواہش تھی تمہاری جیسی کسی اپسرا کو اپنے دل کی ملکہ بناؤں لیکن تمہاری طرح ماں باپ نے ایک جاہل عورت کے پلے باندھ دیا۔ ہم دونوں چاہیں تو مل کر ایک دوسرے کا دکھ بانٹ سکتے ہیں۔ اگر تم چاؤ تو میں شہر والا مکان بھی تمہارے نام کرنے کے لئے تیار ہوں۔" اس نے اپنے فقرے کا ردِعمل میرے چہرے پر تلاش کرنے کے لئے میری آنکھوں میں جھانکا۔

میرے دل کی دھڑکنیں بے قابو ہوتی جاتی تھیں۔ عقل پر تو جیسے پردہ پڑ گیا تھا۔ بچپن سے جوانی تک جو سہانے سپنے دیکھے تھے جب ان کی تعبیر نظر آئی تو دل نے چاہا بے اختیار بڑھ کر اسے تھام لوں۔ بے قابو ہوتے جذبات کی ضابطوں کھینچنے کے لئے خیالات کے جن قوی شکنجوں کی ضرورت ہوتی ہے وہ میرے پاس کہاں تھے۔ یہاں تو بے لگام جذبات تھے اور منہ زور خواہشوں کے کف اڑاتے گھوڑے جو ضمیر کی باگھ کھینچتی پر چڑھتے چلے آ رہے تھے۔ کتنے ہی شوریدہ سر جذبے جو خالد کی مخلصانہ محبت کی چٹان تلے دبے جانے کب سے سسکیاں بھر رہے تھے۔ اب گڑے مردوں کی طرح سر اٹھانے لگے۔ من ساگر سے اٹھنے والی ہر لہر پکار رہی تھی "بڑھ کر زندگی سے اپنے حصے کی خوشیاں وصول کر لے۔"

امی نے میرے لاشعور میں گلمیر لالچ کا جو زہر گھولا تھا اس کی شدت سے میری نسیں پھٹنے لگیں۔ خالہ کا بے لوث انس، خاوند کی دیوانہ وار چاہت، لختِ جگر کی محبت کچھ بھی تو خواہشوں کے خفریت کے پاؤں کی بیڑی نہ بن سکا۔

"پروین کہیں تمہارا دل تو مجھ سے نہیں بھر جائے گا۔" زخمی ضمیر پہ پھاہا رکھ کر میں نے اتمامِ حجت کے لئے کہہ دیا۔

"کیسی باتیں کرتی ہو بشریٰ۔ میرا یہ فیصلہ جذباتی ضرور ہے لیکن میں نے حقائق کو ہمیشہ مدِنظر رکھا ہے شاید یہی میری کامیابی کا راز بھی ہے ورنہ میں بھی آج خالد کی طرح ٹائپ رائٹر سے سر پھوڑ رہا ہوتا یا پھر تمہارے والد کی طرح فائلوں کی گرد میں کھویا ہوتا۔" اس نے بے چینی سے پہلو بدلتے ہوئے کہا۔

وہ بولتا رہا میں جذبات کے تیز دھاروں میں ڈوبتی ابھرتی رہی۔ بالآخر میں نے ہتھیار ڈال دیئے۔ میرے اندر کی سرکش بشریٰ جسے ابھی تک میں نے کسی نہ کسی طور دبائے رکھا تھا مجھ پر غالب آ گئی اور میں نے ہاں کہہ دی۔

اس روز شام کو جب خالد دفتر سے واپس آیا تو میں نے اسے اپنے فیصلے سے آگاہ کر دیا۔ پہلے تو وہ ہکا بکا میرے چہرے کی طرف دیکھتا رہا۔ شاید اسے اپنے کانوں پہ یقین نہیں آ رہا تھا۔ بات تھی بھی ایسی۔

"مذاق کر رہی ہو بشریٰ"۔ اس نے پُر امید نظروں سے میری سمت دیکھا۔

"ایسے سنجیدہ فیصلے مذاق نہیں ہوتے۔" میں نے نظریں جھکائے مختصر سا جواب دیا۔ خالد سن ہو کر رہ گیا۔ اس نے ایک لفظ نہ بولا اور چپ چاپ عارف کو لے کر باہر چلا گیا۔ قریباً ایک گھنٹے بعد اس کی واپسی ہوئی۔ اس بیچارے نے یہی سوچا ہو گا کہ میرا جذباتی فیصلہ ہے جب مستقبل پر غور کروں گی تو بدل جاؤں گی۔

"دیکھو بشریٰ میں تمہارے ساتھ بحث نہیں کرنا چاہتا۔ بہرحال بہتر یہی ہے کہ تم کم از کم ایک ہفتہ سوچو۔ اپنے ابو، امی سے مشورہ لو ممکن ہے اس طرح ...."

"مسٹر خالد اپنے بُرے بھلے کی ذمہ دار میں خود ہوں۔ میں کوئی دودھ پیتی بچی نہیں جو ہر بات کے لئے منہ اٹھا کر امی ابو کی طرف دیکھتی رہوں۔"

SCAN PDF WAQAR

تھوڑی سی ردّ و قد کے بعد جب اس نے دیکھا کہ میرا فیصلہ اٹل ہے تو اس نے اپنے ترکش کا آخری تیر بھی پھینک دیا۔

"ٹھیک ہے اگر تمہارا یہ فیصلہ اٹل ہے تو عارف میرے پاس رہے گا۔ دنیا کی کوئی طاقت اسے مجھ سے نہیں چھین سکتی۔" اس کے لہجے میں چھپے عزم نے اس کی بات کی تصدیق کر دی تھی۔

جب ہوس دامنگیر ہو جائے تو خون کی چاہ، محبتوں کے رشتے سبھی کچھ تو ریت کے ذرات کی طرح بکھر جاتے ہیں۔ سنہرے مستقبل کے سپنوں کی پٹی میری آنکھوں پر اس سادن کے اندھے کی طرح بندھ گئی جسے ہرا ہی ہرا سوجھتا ہے۔ میں نے گلیمر اور گلوری لالچ کے لئے سبھی کچھ داؤ پہ لگا دیا۔ آج سوچتی ہوں تو حیرانگی ہوتی ہے کہ جب اس گھر سے رخصت ہوتے وقت ننھا عارف میرا قدموں سے لپٹ رہا تھا تو میرا کلیجہ کیوں نہ پھٹا۔ شاید میری وہ آتما ہی مر چکی تھی جسے ممتا کہتے ہیں اور جو کسی عورت کو تخلیق کی قوت دے کر اسے خدائی صفت سے موصوف کیا کرتی ہے۔

خالد کی بے بسی کے آنسو، ننھے عارف کی التجائیں سبھی کچھ میرے خواہشات کے دیو کے سامنے یوں بہا جیسے تیز ہوا راکھ کو اڑا لے جاتی ہے۔ خالہ کو خالد نے کسی بہانے سے دوسرے شہر اپنے کسی عزیز کے ہاں بھیج دیا تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس المناک منظر کو وہ بیچاری بوڑھی عورت بھی اپنی آنکھوں سے دیکھے۔

میں نے عارف کو بازو سے پکڑ کر الگ کر دیا۔ یہ کسی ماں کی سنگدلی کی انتہا تھی۔ لیکن میں نے کہا نا کہ اس لمحے مجھ سے خدا نے وہ صفت ہی چھین لی تھی۔ میں ماں کی بجائے ایک عورت تھی اور بس!

میری اس سنگدلی پر خالد تڑپ اٹھا۔ اس نے چیختے چلاتے عارف کو گود میں بھرا اور باہر چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد میں نے بھی اس گھر کو ہمیشہ کے لئے خیرباد کہہ دیا۔ گھر سے کچھ فاصلے پہ پرویز کار سمیت میرا منتظر تھا۔ وہ مجھے لے کر اپنے گھر آ گیا جہاں اگلے روز خالد کا خلاق نامہ بھی پہنچ گیا۔

ایام عدت کے بعد ہم دونوں ازدواجی رشتے میں منسلک ہو گئے۔ میری ماں نے اس شادی میں بھرپور طریقے سے شرکت کی۔ ابو نہ آئے اور قول کے سچے ابو نے مجھے صدق سے اپنی بات نبھائی۔ مرتے وقت بھی کہہ گئے کہ بشریٰ میرے جنازے کو ہاتھ نہ لگائے۔

پانچ سال کا عرصہ یوں گزرا کہ پل کی خبر نہ ہوئی صرف ایک ابو کی موت کا حادثہ ضرور تھا جس نے کبھی کبھی مجھے سوگوار کر دیا ورنہ تو میرے پاس سوچنے کے لئے وقت ہی نہیں تھا۔ پرویز نے جو وعدہ کیا تھا وہ پورا کر دکھایا۔ اس نے مجھے فرش سے عرش پر بٹھا دیا۔ ایک عرصے کے بعد جب خواہشوں نے حقیقت کا روپ دھارا تو میں ندیدے بچوں کی طرح آلائشوں سے چمٹ گئی اور دونوں ہاتھوں سے نوچ کھسوٹ شروع کر دی۔

اس دوران میری خواہش رہی کہ میں پھر سے ماں کا روپ دھاروں تاکہ عارف کی جدائی کی اذیت سے جو کبھی کبھی ایک انجانی خلش کی طرح مجھے کچوکے لگانے لگتی تھی نجات پا سکوں، لیکن پرویز نے دانستہ ایسا نہیں ہونے دیا۔ اصل میں وہ بڑا شریف قسم کا عیاش تھا۔ اس کا ہمیشہ ایک ہی جواب ہوتا کہ وہ نہیں چاہتا کہ میں اپنی محبت اس کے اور اولاد کے درمیان بانٹ دوں۔ پھر اسے میرے سراپے سے محبت تھی جس میں ذرا سی تبدیلی بھی اسے گوارا نہیں تھی۔

پانچ سال تک ننھے عارف کی محبت کا زہر باد میرے اندر ہی اندر ایک ناسور کی طرح پکتا رہا۔ بالآخر پھٹ گیا۔ تب ان کربناک گھڑیوں کا آغاز ہوا کہ جن کے متعلق میں ابھی تک خوش فہمیوں کا شکار رہی تھی۔ پانچ سال کی عیاشانہ زندگی کا قرض میں نے اس ایک لمحے میں چکا دیا جو لمحہ میرے لخت جگر کی اذیت ناک یادوں کی نذر ہوا۔ تب میں نے سوچا الٰہی یہ کیا غضب ہو گیا۔ بھلا کوئی خود اپنے ہاتھوں اپنا گلا گھونٹا کرتا ہے۔ میں نے تو جیتے جی خود کو زندہ درگور کر لیا تھا۔

پرویز نے میرے کرب کو محسوس کیا اور یہ بھی چاہا کہ اس درد لادوا کا مداوا کر سکے۔ لیکن ایسا چارہ گر تھا کون اس جہاں میں؟ ایک روز اسے بتائے بغیر میں خالد تک جا پہنچی۔ میں نے اسے

WAQAR SCANNED PDF

دفتر کے باہر جالیا۔ اف میرا خدایا کیسا روگ لگایا تھا۔ میں نے اس کو تیس پینتیس کے خالد کے بجائے میرے سامنے بالوں میں چاندی لئے آنکھوں پہ موٹے شیشوں کی عینک اور چہرے پہ ملال کا حزن و ملال بجائے ایک حرماں نصیب کھڑا تھا۔ اپنی بہن کے ذریعے مجھے اس بات کا علم ہو گیا تھا کہ اس نے دوسری شادی نہیں کی۔ اس کی ایک دور کی رشتے کی بہن بیوہ ہو کر اپنے چار بچوں سمیت اس کے در پہ آن پڑی تھی۔ جس نے ننھے عارف کو اپنے سگے بچوں کی طرح پالا اور اسے کبھی ماں کی کمی کا احساس نہ ہونے دیا۔ خالہ نے آپا کی موت کے بمشکل پندرہ بیس روز بعد زندگی کا قرض چکا دیا۔ اپنے آخری سانسوں تک اس کی ایک ہی تمنا رہی کہ اس کا خالد دلہن لے آئے۔ لیکن ایثار و وفا اور شرافت و انسانیت کے اس زندہ مجسمے نے تو جیسے اپنی زندگی اپنے بیٹے کے لئے تج دینے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

وہ سائیکل ہاتھ میں پکڑے سڑک کے کنارے کنارے پیدل چلا جا رہا تھا۔ مجھے اچانک وہاں دیکھ کر چونکنا پڑا۔

"تم؟" اس کے ہونٹوں سے کراہ نکلی۔

"کیسے ہو؟ عارف کیسا ہے"؟ میں نے ہونکا بھرا۔

"فرصت مل گئی اپنے بچے کو یاد کرنے کی"۔ وہ تڑپ اٹھا۔

میں کٹ کر رہ گئی۔ سسکیوں نے اندر ہی اندر دم توڑ دیا۔ رندھے ہوئے گلے سے میں نے بمشکل کہا۔

"میں تم سب کی گنہگار ہوں! خدا کے لئے اور کچھ نہ کہنا۔ مجھے میرے بچے سے ملا دو" میں نے اس کے سامنے ہاتھ جوڑ دیئے۔ مجھے اردگرد کے ماحول کی کوئی پرواہ نہیں تھی۔ آنسو میرے ضبط کے سارے بندھن توڑ کر میرے گالوں پہ پھسل گئے اور نیکی و شرافت کا وہ مجسمہ پگھل گیا۔

"حوصلہ رکھو! مجھ میں انسانیت کے جراثیم ابھی مرے نہیں تم اپنے بیٹے سے ضرور ملو گی۔ کل مجھے ملنا" کہہ کر اس نے میری طرف دیکھے بغیر سائیکل پہ پاؤں رکھا اور ہجرت کر گیا۔

میں سسکتی تڑپتی واپس آئی۔ وہ رات روز حساب کی طرح طویل ہو گئی۔ صبح میں نے بے چینی سے ... دفتر فون کر کے ملنے کا پوچھا۔

"دیکھو بشریٰ اسے میری کم ظرفی نہ سمجھنا۔ عارف کو میں نے کبھی نہیں بتایا کہ اس کی ماں کوئی اور ہے وہ میری بہن کو ہی اپنی ماں جانتا ہے۔ تم اس سے ملو لیکن اسے یہ علم نہ ہونے پائے کہ تم اس کی ماں ہو" ... بننے لگی لپٹی رکھے بغیر سیدھی سادی بات کہہ دی۔

"خالد خدا کے لئے میرے گناہوں کی اتنی کڑی سزا نہ دو! میں پہلے ہی کون سی سکھی ہوں"۔ میں فون پر سسک اٹھی

"ایک بات کہوں بشریٰ"؟ اس نے میرے رونے کو نظر انداز کرتے ہوئے بڑے پُر اعتماد لہجے میں کہا۔

"ہوں" بمشکل میرے منہ سے نکلا۔

"تم نے زندگی کو جذبات سے باہر نکل کر سمجھنے کی کبھی کوشش ہی نہیں کی اور یہی تمہاری سب سے بڑی غلطی ہے۔ اب جب تمہیں اپنی بھول کا احساس ہوا ہے تو جس طرح جذباتی بن کر تم نے اتنا بڑا اقدام اٹھایا تھا اسی طرح آج تم مجھ سے یہ خواہش کر رہی ہو کہ میں اپنے بچے کا مستقبل بھی تباہ کر دوں ... یہ کبھی نہیں ہو گا بشریٰ! میں نے اپنی جوانی اپنے بچے کے لئے وقف کی ہے۔ اب میری محنتوں کو پھل لگنے لگا ہے تو تم اس میں کیڑے ڈالنے چلی آئی ہو"

وہ ٹھیک کہہ رہا تھا۔ میں نے ایک دو لمحوں کے لئے سوچا اور دل پر جبر رکھ کر کہہ دیا۔

"ٹھیک ہے مجھے تمہارا فیصلہ منظور ہے"۔

"آج شام کو حسب جی چاہے چلی آنا۔ لیکن پردہ نہ کے ساتھ نہیں۔ میں بہرحال انسان ہوں" سلسلہ کٹ گیا۔

"تم فرشتے ہو خالد! فرشتے"۔ میں نے زیر لب کہا اور فون کریڈل پر رکھ دیا۔

شام کو میں اس کے گھر جا پہنچی۔ میرا لختِ جگر باپ کے پاس بیٹھا سکول کا کام کر رہا تھا۔ اس

Scan by PDF WALA

نے غیر مانوس نظروں سے میری طرف دیکھا۔

"سلام علیکم آنٹی"۔ بڑے مؤدب لہجے میں اٹھ کر اس نے مجھے تعظیم دی۔

ہو بہو خالد کی شکل پہ گیا تھا۔ کتنی جلدی جوان ہو گیا میرا لال۔ خون نے جوش مارا تڑپ اٹھا۔ بے بندھن ٹوٹ گئے۔ میں نے تمام احتیاطیں بالائے طاق رکھیں اور اسے سینے سے لگا لیا۔ میرا آنچل ہٹ ہٹ کر میری آنکھوں میں جھانکتا رہا۔ شاید اپنی کھوئی ہوئی ماں کو کھوج رہا تھا۔ میرا کلیجہ اس کے ہاتھوں کی روئیے سے ضرور بجھا۔ ہوک سی اٹھی اور جی چاہا کہ اسے سینے سے بھینچ کر چلا چلا کر کہوں کہ مجھے پہچانو میں ہی وہ بدقسمت عورت ہوں جس نے تمہیں جنم دے کر بھول جانا چاہا فطرت کے مضبوط بندھن کبھی کوئی توڑ بھی پایا ہے۔ سب کچھ چاہتے ہوئے میں اسے کچھ نہ کہہ سکی۔ وہ شریفانہ عہد جو میں نے ایک عظیم انسان سے کیا تھا آڑے آ گیا۔ پھر قانون قدرت بھی کوئی چیز ہے۔ مجھے اپنے کیے کی سزا تو بہرطور بھگتنی تھی۔

خالد نے اسے شاید پہلے سے میری آمد سے آگاہ کر رکھا تھا اور اسے بتایا ہوا تھا کہ آنے والی نہاں اس کی خالہ ہے۔ وہ ہم دونوں سے بظاہر لاتعلق سا بنا خلاؤں میں اپنی جنت گم گشتہ کو ڈھونڈتا رہا۔

"آنٹی کے لئے چائے لاؤ بیٹا"۔ اس نے عارف سے کہا۔

"جی اچھا ابو" کہہ کر وہ "اپنی امی" سے میرے لئے چائے لانے کو کہنے لگا جو سر پر سوتی دوپٹہ اوڑھے اس کمرے میں آ رہی تھی۔ میں نے اس عظیم عورت کو زندگی میں پہلی مرتبہ دیکھا تھا۔ لیکن اسے دیکھتے ہی جس تقدس اور طمانیت کا احساس ہوا اس سے کوئی بھی اس کی شخصیت کا اندازہ بخوبی کر سکتا تھا۔

اپنی بہن حمیدہ کو خالد نے تمام حالات سے آگاہ کر رکھا تھا۔ وہ بھی میری طرح ماں تھی اور اولاد کی جدائی کے کرب کو محسوس کر سکتی تھی۔ میں نے دکھ اور ہمدردی کی ملی جلی پرچھائیاں اس کی پرسکون آنکھوں میں لہراتی دیکھ لی تھیں۔ میرے لئے یہی کافی تھا۔ رات گئے تک میں اپنے بیٹے سے باتیں کرتی رہی جس کے لئے بے شمار تحائف لے کر گئی تھی، لیکن اس نے تحائف وصول کرتے ہوئے کسی قسم کی سرگرمی نہ دکھائی یہ اس کی نسبتی غیرت تھی جس نے میری گردن کو فخر سے بلند کر دیا۔

رات گئے میں واپس آ گئی۔ پرویز کو علم تھا کہ میں اپنے بیٹے سے ملنے گئی ہوں اور اپنے گناہ کا احساس بھی۔ اس کا ضمیر اس کی توقعات کے برعکس ابھی تک زندہ تھا اور دوستی کے روپ میں اس نے جو گھناؤنا کھیل کھیلا تھا۔ اس پر وہ پچھتاوے کا شکار بھی رہنے لگا۔ لیکن آج تک اس نے کسی بین السطور میں بھی اپنی شکست کا اعتراف نہیں کیا تھا۔ اس نے شاید ہارنا سیکھا ہی نہیں تھا۔ اپنے پچھتاوے کی تلافی کے لئے اس نے مجھے عارف سے ملنے کی کھلی چھٹی دے رکھی تھی اور خود بھی میرا حوصلہ قائم رکھتا۔

پھر تو جیسے عارف میرے وجود کا ایک حصہ بن کر رہ گیا۔ سکول، گھر، سیر و تفریح ہر جگہ ہم اکٹھے جاتے گھومتے، جی بھر کے باتیں کرتے۔ میں نے کبھی خالد کے اختیار کو مشکوک نہ ہونے دیا۔ پہلے ہی میں اس کی گنہگار تھی۔ اس کے خلوص کو سلام کہ اس کے باوجود اس نے کبھی میرے اور عارف کے ملنے پر اعتراض نہ کیا بلکہ یہ تک نہ کہا کہ اس طرح اس کا تعلیمی حرج ہوگا۔ میں اسے بیٹا کہہ کر ضرور مخاطب کرتی تھی لیکن یہ خیال ہمیشہ مجھے کچوکے دیتا رہا کہ اس کی "ماں" کوئی اور ہے۔

وقت کا پنچھی یوں پر لگا کر اڑا اور مہینے سالوں میں اس طرح بدلے کہ پندرہ سال گزرنے پہ پتہ ہی نہ چلا۔ میں نے پندرہ سال تک یہ روگ اپنے اندر پالا۔ پندرہ سال میں ہزاروں دفعہ جی چاہا اسے بتا دوں کہ تمہاری ماں میں ہوں کسی اور کو اپنی ماں بننے کا حق نہ دو لیکن ہر دفعہ میں نے اس خواہش کو اندر ہی اندر مار لیا۔ قدرت نے بھی جیسے مجھے عتاب کے لئے چن لیا تھا۔ اس کے بعد میری گود کبھی نہ بھری۔ پرویز نے چاہا کسی طرح میرے دکھ کا مداوا ہو اور اولاد کے حصول کے لئے ملک بھر کے ماہرین سے رجوع کیا۔ لیکن تخلیق کی قوت پانے کے بعد میں نے اس منصب سے جو سلوک کیا تھا۔ یہ اس کی سزا تھی کہ پھر آرزوؤں کی کھیتی کبھی ہری نہ ہوئی۔ تمناؤں کے سارے پھول چن چن کر گر پڑے۔ کبھی کبھی میں سوچتی الٰہی دنیا میں لاکھوں انسان روزانہ حادثوں کی نذر ہو جاتے ہیں۔ کتنے ان میں ایسے بھی ہوں گے جو زندگی کے روگ سے چھٹکارہ پا جاتے ہوں گے۔ کیا میرے لئے ابھی در توبہ وا نہیں ہوا کہ

سانسوں کا یہ سلسلہ جو عذاب کی مالا بن کر میرے وجود سے لپٹا ہے ٹوٹ جائے اور میں نجات پا جاؤں۔ لیکن زندگی جیسے انمول عطیے کو میں نے جس طور سے تضحیک کا نشانہ بنایا تھا شاید اسی کا ثمر تھا کہ دعائیں بھی مستجاب نہ ہوئیں۔

ایک روز جب عارف میرے پاس آیا تو اس نے خوشخبری سنائی کہ اس نے کمیشن حاصل کر لیا ہے اور ساتھ ہی یہ بتایا کہ ابو نے بطور "انعام" اس کی خواہش پر اس کی اور ثمینہ کی منگنی کا فیصلہ کر لیا ہے۔

اس روز میں پہلی مرتبہ اندر سے مکمل طور پر ٹوٹی۔ اتنے اہم فیصلے کے لئے کسی نے میرا مشورہ لینا بھی گوارا نہ کیا۔ ثمینہ میری کزن محمودہ کی لڑکی تھی جس کے ساتھ میری کبھی نہ بھی بچپن ہی سے ہم دونوں ایک دوسرے سے کچھ کھچے کھچے رہے۔ ہم دونوں ہی نے کبھی ایک دوسرے کو منہ لگانا پسند نہ کیا جب مجھے علم ہوا کہ میرے بیٹی کی منگنی محمودہ کی بیٹی سے طے پا رہی ہے تو میرے اندر کی بشریٰ ایک مرتبہ پھر جاگ اٹھی۔

"اوہ خالد کتنا گہرا انتقام لیا تم نے"۔ ایک چیخ میرے اندر سے اٹھی۔ پہلے تو میں نے یہی سوچا کہ خالد سے اس مسئلے پہ بات کروں، لیکن پھر انا نیت آڑے آئی اور میں نے براہِ راست عارف سے بات کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

میں سیدھی اس کے گھر جا پہنچی۔ خالد شاید کسی کتاب کی ورق گردانی کر رہا تھا۔

"ہیلو آنٹی آپ!" اس نے شاید اچانک مجھے دیکھ کر حیرانی کا اظہار کیا تھا۔ کیونکہ میں اس کے گھر اول تو جاتی ہی نہیں تھی، اگر جانا بھی ہوتا تو پروگرام بنا کر جایا کرتی تھی۔

"ہاں بیٹے تم سے کچھ خاص بات کرنی تھی"۔ میرے لہجے کی سنجیدگی کو اس نے محسوس کر لیا تھا۔

"ارے بیٹھئے تو سہی آنٹی! میں امی کو بلاؤں" کہہ کر اس نے اٹھنا چاہا۔

"نہیں بیٹے" میں نے اس کا بازو تھام کر اسے اپنے پاس ہی بٹھا لیا۔

ضبط کا یارا کہاں تھا۔ سسکیاں بھرتے، آنسو بہاتے رُندھے ہوئے گلے سے میں نے اسے سب کچھ بتا دیا۔ وہ کمال تحمل سے میری باتیں سنتا رہا پھر اچانک اٹھ کر کمرے سے باہر نکل گیا۔

میں اس کے سلوک پر حیران رہ گئی۔ مجھے امید تھی کہ وہ "امی" کہہ کر میرے گلے لگ جائے گا اور برسوں کی وہ بھڑکتی آگ جس نے اندر ہی اندر مجھے راکھ کر ڈالا تھا ٹھنڈی پڑ جائے گی لیکن اس کا یہ طرز عمل میری سمجھ سے بالاتر تھا۔ میں سہک سہک گئی۔ عارف کی واپسی شربت کے ایک گلاس کے ساتھ ہوئی۔ اس نے گلاس مجھے تھما دیا اور خود ایک طرف کھڑا ہو گیا۔ شاید بات کرنے کے لیے پر تول رہا تھا۔ وہ خود بھی خوفزدہ سا ہو گیا تھا۔!

"آنٹی" وہ میری سمت گھوما اور اس کا پہلا ہی لفظ برچھی بن کر میرے سینے میں ترازو ہو گیا۔ میں نے اس کے انداز تخاطب سے ہی اندازہ لگا لیا کہ ہمیشہ کی طرح اب میرا مقدر بن گئی ہے۔

"جس بات کا انکشاف آپ آج فرما رہی ہیں اس کا علم مجھے بہت دیر پہلے سے ہے لیکن جس طرح ایک شریفانہ معاہدہ آپ کے اور ابو کے درمیان طے پایا ہے ویسا ہی ایک معاہدہ میرے اور امی کے درمیان بھی ہو چکا ہے۔ کچھ اصول اپنے باپ کی طرف سے میرے خون میں منتقل ہوئے ہیں ان میں سے ایک عہد کی پاسداری بھی ہے۔ میرے ابو نے ایک عہد کی پاسداری کی اور آپ کے علاوہ دوسری کوئی عورت بیوی بن کر ان کی زندگی میں داخل نہیں ہو سکی۔ اس طرح میں نے بھی ثمینہ سے ایک معاہدہ کیا تھا کہ میں جب بھی کسی قابل ہوا اس کا ہاتھ تھاموں گا۔ آج اس عہد کے ایفاء کا وقت آیا ہے تو آپ فرما رہی ہیں میں اپنے عظیم باپ کی روایت توڑ ڈالوں اور آپ کی صف میں شامل ہو جاؤں۔ میرے شعور میں وہ واقعات ابھی محفوظ ہیں جب آپ نے روتے ہوئے بچے کو دھتکار دیا تھا۔ کیا یہی چاہتی ہیں آپ کہ میں بھی آپ کی طرح بے وفا کہلاؤں"۔! وہ بولتا رہا اس کے لفظ نیزے کی انی کی طرح میرے کلیجے میں اترتے رہے۔ پھر وہ پُر وقار چال چلتا کمرے سے نکل گیا اور مجھے یوں لگا جیسے اندر سے میری موت واقع ہو گئی ہے۔

(مرکزی خیال ماخوذ)

WAQAR SCANNED BY

WWW.PAKSOCIETY.COM

انسانیت کی بھینٹ

اپنی کہانی شروع کرنے کے لئے مجھے کوئی "آغاز" میسر نہیں آ رہا۔

میں نے زندگی کا سفر جہاں سے شروع کیا تھا گھوم پھر کر وہیں آن کھڑا ہوا ہوں۔ لیکن اب زندگی میرے ہاتھوں سے ریت کی طرح پھسل رہی ہے۔ میرا کوئی آغاز نہیں تھا کہ میں انجام کی فکر کروں۔ معلوم ہے ایک روز یونہی وقت کی ان خاردار راہوں پر دوڑتے دوڑتے میں جواب ہانپنے لگا ہوں گر کر مر جاؤں گا۔ لیکن کیا ہی اچھا ہو کہ میری یہ کہانی اس سے پہلے آپ تک پہنچ جائے ممکن ہے کوئی اسے پڑھ کر اس انجام سے بچ نکلے جس سے میں دو چار ہونے جا رہا ہوں۔

میرا نام ہاشم خان ہے۔ شاید آپ کو یقین نہ آئے کہ میرا تعلق کتنے بڑے خاندان سے ہے میرے پاس کیا نہیں تھا۔ دولت، عیش و آرام اور ایک شاندار اور محفوظ مستقبل۔ سب ہی کچھ مجھے میسر تھا لیکن ان سب سے بڑھ کر ایک اور چیز بھی ہوتی ہے ــــ محبت!

جی ہاں! بدقسمتی سے میں کبھی اس جذبے سے آشنائی حاصل نہ کر سکا۔ میں نے ہوش سنبھالا تو اپنے گھر میں نوکروں کی فوج اور دولت کی ریل پیل دیکھی۔ میرے والد اپنے بہن بھائیوں میں سب سے بڑے تھے اور اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ اپنے مزاج کے لحاظ سے وہ میرے سارے خاندان میں منفرد تھے۔

جاگیرداروں والی کوئی عادت ان میں نہیں تھی۔ وہ اپنے خاندان کے دوسرے لوگوں کے

SCANNED BY

برعکس تعلیم یافتہ اور ادب نواز تھے۔ میری تباہی کی بنیاد میرے دادا نے میری پیدائش سے پہلے ہی رکھ دی تھی۔ ہمارے خاندان میں یہ رواج ہے کہ بچوں کی پیدائش کے ساتھ ہی ان کی قسمت بھی ایک دوسرے سے منسوب کر دی جاتی ہے۔

یہی کچھ میرے والد صاحب کے ساتھ ہوا۔ وہ جب اپنی گریجوایشن کر چکے تو انہیں کہا گیا کہ ان کی شادی میری والدہ سے جو میرے والد کی خالہ زاد بہن تھیں طے پا چکی ہے۔ تو والد ابھی شادی کے لئے تیار نہیں تھے کیونکہ وہ اعلیٰ تعلیم حاصل کرنا چاہتے تھے اور دوسری وجہ ان کے اور میری والدہ کے درمیان ذہنی ہم آہنگی کا نہ ہونا تھا۔

دونوں ایک دوسرے کی ضد تھے۔ والد صاحب میں جہاں کوئی عادت جاگیر داروں اور نوابوں والی نہیں تھی وہاں والدہ میں ہر عادت نواب زادیوں والی تھی۔ وہ ولایت کی تعلیم یافتہ اور والد سے عمر میں بھی تین چار سال بڑی تھیں۔ والد صاحب نے دادا جان سے انکار تو نہ کیا لیکن یہ ضرور کہا کہ وہ ابھی شادی کرنا نہیں چاہتے مزید تعلیم حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ والد کا ارادہ ڈاکٹریٹ کرنے کا تھا۔

"روکا کس نے ہے بیٹا"۔ دادا جان کی دور اندیش نظروں نے والد صاحب کے اندر پیدا ہونے والی بغاوت کو وقت سے پہلے دیکھ لیا تھا۔ "شادی کے بعد بھی تعلیم جاری رکھی جا سکتی ہے"۔

انہوں نے والد صاحب سے کہا۔

"یہ بڑا مشکل ہوگا"۔ والد تھوڑے ڈرتے ڈرتے بولے۔

"کیا مشکل ہے"۔ دادا جان نے تو زندگی میں کبھی نا سنی ہی نہیں تھی۔ کس کی جرأت تھی کہ ان کے کسی بھی فیصلے کی مذمت یا مخالفت کر سکے۔ والد تو فطری طور پر شریف تھے ورنہ ممکن ہے اپنی بات پر اڑ بھی جاتے۔

وہ جان گئے تھے کہ یہاں کوئی کام دادا جان کی مرضی کے بغیر ہونا ممکن نہیں۔ میرے والد بہت بہادر آدمی تھے۔ انہوں نے دادا جان کی خوشنودی اور اپنے خاندان کے جھوٹے رسم و رواج کی بھینٹ چڑھ جانے کا فیصلہ محض اس لئے کیا کہ ان کی ذات کوئی مسئلہ نہ بن سکے۔

شادی کے پہلے ہی سال میری پیدائش ہوئی۔ میں نے ہوش سنبھالا تو سب سے پہلے گھر میں [illegible] کو جھگڑتے دیکھا میری ماں کسی کم رئیس گھرانے کی نہیں تھی۔ وہ بھی بہت بڑے جاگیر دار کی بیٹی تھی۔ کیا مجال جو کبھی کسی بات میں کمی دکھائی ہو۔ وہ فطرتی طور پر جاگیر دارانہ مزاج رکھتی تھیں۔ اپنی مرضی کے مطابق کرنے کی عادی۔ ہر واقعہ کو اپنے خیالات کی مخصوص عینک سے دیکھنے [illegible]۔ ان کی ہمیشہ یہی خواہش رہتی کہ یہاں ان کی حکومت چلے۔ اس چھوٹی سی مملکت کی وہ بے تاج ملکہ کہلانا چاہتی تھیں۔

میری عمر پانچ سال ہوئی تو مجھے خاندانی روایات کے مطابق ملک کے ایک بڑے شہر کے بہت بڑے سکول میں داخل کروا دیا گیا۔ یہ سکول اتنا بڑا تھا کہ چھوٹے آدمی اس کے نزدیک پھٹکنے کی ہمت بھی نہیں کر سکتے تھے۔ میں بورڈنگ میں داخل ہو گیا۔ دو تین مہینے بعد ایک دو روز کے لئے گاؤں چلا جاتا۔ اس دوران میرے والد ہی دراصل میری ماں کا کردار ادا کرنے آتے تھے۔ امی کے پاس میرے لئے ڈانٹ کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔

"یہ کپڑے کیوں میلے کئے"؟

"وہاں کیوں کھیلنے گئے تھے"؟

"دوپہر کو کیوں جاگ رہے ہو"؟ وغیرہ وغیرہ

وہ شروع ہی سے مجھے الگ تھلگ رکھ کر یہ احساس دلانا چاہتی تھیں کہ میں بھی ان کی طرح کوئی بڑا ہی ارفع و اعلیٰ قسم کا انسان ہوں اور عام انسانوں سے ہمارا کوئی تعلق ہی نہیں۔ ابتدا ہی سے میرے اندر ایک خوف سا پرورش پانے لگا تھا۔ مجھے والدہ سے ڈر لگتا۔ ہمارے گھر آئے دن بڑی بڑی دعوتیں ہوتیں جن میں رؤسا اور افسران اپنی بیگمات سمیت تشریف لاتے۔ میری والدہ ان پارٹیوں کی جان تھی۔ لیکن والد عموماً ایسے مواقع پر گھر سے غائب رہتے۔

شاید ہی ان پانچ سالوں میں کوئی ایسا دن گزرا تھا جب میرے والدین کی آپس میں تو تکار نہ ہوئی ہو۔ میرے والد جب کبھی مجھے اداس اور کھویا کھویا دیکھتے تو اپنے ساتھ گاڑی میں بٹھا کر

SCANNED BY CamScanner

کبھی زمینوں پر اور کبھی شہر لے جاتے وہ گھنٹوں میرے ساتھ کھیلا کرتے۔ واپسی پر امّی ان سے الجھ پڑتیں کہ وہ میری زندگی برباد کر رہے ہیں۔ وہ عموماً والد کو ایک فقرہ کہا کرتی تھیں۔

"ان حرکتوں سے تم اس کے دل میں میرے خلاف نفرت پیدا کر رہے ہو۔ لیکن میری جوتی کو بھی اس کی پروا نہیں۔"

والد مسکرا کر وہاں سے واپس چلے جاتے۔ وہ ہمیشہ ایک ہی جواب دیتے

اس معصوم کے سامنے تو خدا کا خوف کر لیا کرو۔"

میں شہر پڑھنے آگیا تو دوسرے تیسرے روز والد مجھے ستر اسّی میل کا سفر طے کر کے ملنے آتے اور دو تین گھنٹے میرے ساتھ گزار کر واپس چلے جاتے۔ میں ان دنوں ساتویں جماعت میں پڑھتا تھا۔ اس دوران گھر کے بھید بھیوں نے مجھے والد کی شادی کی کہانی سنا دی تھی ۔ ہر خاندان میں ایسے لوگ ضرور موجود رہتے ہیں جو موقع ملتے ہی ایک دوسرے کے خلاف کان بھرنا شروع کر دیتے ہیں۔ ان لوگوں نے مجھے یہ کہانی شاید اسی لئے سنائی ہو گی۔ لیکن وہ نہیں جانتے تھے کہ ایک اعلیٰ تعلیمی درسگاہ نے مجھے بھی کچھ شعور بخشا تھا۔ بچپن ہی میں گھر سے دور رہنے کی وجہ سے میرا مشاہدہ بھی کچھ ہو چلا تھا۔ میں سمجھتا تھا کہ میرے دادا اور میری ماں مل کر میرے والد کو آہستہ آہستہ قتل کر رہے ہیں۔

اس سے پہلے معاملہ "اوئے توئے" تک ہی تھا۔ پھر نوبت گالی گلوچ پر آگئی۔ بالآخر وہ بدقسمت دن بھی آگیا جو میرے بخت پر ہمیشہ کے لئے سیاہی پھیر گیا۔ شاید میرے والد اس روز بہت پریشان ہو کر گھر سے نکلے تھے۔ انہوں نے اپنی گاڑی گاؤں کے نزدیک ریلوے لائن پر عین اس لمحے ٹرین کے سامنے لا کر کھڑی کر دی۔ جب انجن کو بریک لگنے کے مواقع بالکل ختم ہو چکے تھے۔ یہ پھاٹک عموماً کھلا رہتا تھا۔ حال ہی میں ایک چوکیدار یہاں رکھا گیا تھا لیکن اس کی کیا مجال تھی کہ ہمارے گھرانے کی کوئی گاڑی دیکھ کر پھاٹک بند کر سکے۔ کتنی اذیت ناک موت کا انتخاب کیا تھا میرے پیارے ابّا نے ۔۔!!

کچھ تو بہر حال ہونا تھا۔

میری عمر تب تھی ہی کتنی بمشکل بارہ تیرہ سال۔ یہ اطلاع مجھے اپنے ہوسٹل میں ٹیلیفون کے ذریعے ملی تھی کہ میرے باپ نے خودکشی کر لی ہے۔ آپ تصور نہیں کر سکتے کہ ایک بارہ تیرہ سال کے بچے پر اس اطلاع سے کیا قیامت ٹوٹی ہو گی۔ میرا سہارا سوا باپ کے اور تھا ہی کون جس کو تو کبھی اپنے آپ سے فرصت نہ ملی تھی کہ وہ میری طرف متوجہ ہوتی۔

بعد میں مجھے علم ہوا کہ دادا جان کی ہدایت کی خلاف ورزی کرتے ہوئے کسی "ہمارے دشمن" نے مجھے فون کرنے کی جرأت کی تھی۔ ورنہ یہاں دادا جان کا حکم یہی تھا کہ میرے والد کی موت کو اتفاقی حادثہ قرار دیا جائے۔

ان کی دانست میں خودکشی کی خبر ان کے خاندان کی بدنامی کا باعث ہوتی۔ اس روز جب میں اپنے والد کی لاش کے سرہانے کھڑا تھا تو پہلی مرتبہ اچانک روتے روتے میرے ذہن میں ایک عجیب وحشت ناک سی سوچ نے سر اٹھانا شروع کر دیا۔

میں نے سوچا آخر میرے والد کو خود بخود مرنے کی کیا ضرورت تھی؟ وہ اتنے پڑھے لکھے اور سمجھدار انسان تھے کہ زندگی میں کبھی مجھے ماں کی کمی کا احساس بھی نہ ہونے دیا۔ انہوں نے مرتے ہوئے یہ تو ضرور سوچا ہو گا کہ میں اکیلا رہ جاؤں گا۔

میرا کیا بنے گا؟ ۔۔۔ کیا مستقبل ہو گا میرا؟

یقیناً میرے والد نے مرنے سے پہلے یہ سب کچھ سوچا ہو گا۔ پھر آخر وہ کیوں مر گئے۔ انہیں کتنے دکھی ہو گئے تھے وہ۔

اس سے پہلے میں اپنے دادا سے خوفزدہ رہتا تھا۔ آج میں ان کے لئے شدید نفرت محسوس کرنے لگا تھا۔ مجھے یقین ہو چلا تھا کہ اس المیے کے ذمہ دار صرف اور صرف میرے دادا جان اور ان کے وہ بے بنیاد اور کھوکھلے اصول ہیں جن کو وہ ہمیشہ اپنی انانیت کا مسئلہ بنائے رکھتے ہیں۔

SCAN PDF WAQAR AZEEM

میری ماں بار بار مجھ سے لپٹ کے روتی اور چلا چلا کر بین کرتی تھی کہ وہ گناہگار ہے اس کی بدقسمتی نے ہی اسے یہ دن دکھائے ہیں۔

والد کی موت پر میں نے اپنے تمام مزارعوں کو دھاڑیں مار مار کر روتے دیکھا۔ میری طرح وہ بھی جانتے تھے کہ ان کے لئے اس بے رحم اور حوصلہ دینے والے اذیت ناک ہاتھوں میں اگر کوئی سائبان تھا تو وہ والد مرحوم تھے جنہوں نے ہمیشہ انہیں دادا کے عتاب سے بچائے رکھا۔

آٹھ دس روز تک میں کھویا کھویا رہا۔ لیکن اس دوران ایک نامعلوم سا جذبہ میرے لاشعور میں پرورش پاتا رہا۔ والد کے چالیسویں تک مجھے گھر پر رکھا گیا۔ چالیسویں پر ایک خاندانی رسم ادا ہوئی اور میرے والد کی پگڑی میرے سر پر رکھ دی گئی۔ ان حالات میں بھی دادا جان نے اپنے خاندانی رسم و رواج کو نہیں بھلایا تھا۔

میں ہوسٹل میں آگیا۔ اس دوران میرے رویئے سے جو بغاوت چھلکنے لگی تھی اس کا احساس میری ماں کو بھی ہو گیا تھا۔ لیکن اس نے مجھے کچھ نہ کہا۔ غالباً وہ سمجھ رہی تھی کہ یہ ردعمل ہے اور وقت کے ساتھ آہستہ آہستہ میں نارمل ہو جاؤں گا۔

میرے ہوسٹل واپس لوٹنے تک میرے والد کی خودکشی کی کہانی یہاں پہنچ چکی تھی۔ میرے ہم جماعت اس واقعے پر افسوس کا اظہار کر رہے تھے۔ لیکن وہ سب یہ ضرور جتا دیتے تھے کہ انہیں والد کی خودکشی کا علم ہو چکا ہے۔ نجانے مجھے کیوں محسوس ہوا کہ بجائے مجھے پرسہ دینے کے یہ لوگ میری بے عزتی کر رہے ہیں۔ میں غصے سے کھولنے لگتا۔

مجھے علم نہیں میرے اس ساتھی نے میرا مضحکہ اڑانے کی کوشش کی تھی یا واقعی وہ مخلص تھا۔ لیکن جب اس نے کہا "ہاشم تمہارے ڈیڈی کی خودکشی کا بہت افسوس ہوا۔" میرا ہاتھ بے رفتار اٹھ گیا۔ اس لمحے نہ جانے مجھ میں کہاں سے ایسا شدید احساس نفرت اور غصہ سمٹ آیا تھا کہ میں نے اسے فحش گالیاں دیتے ہوئے مارنا شروع کر دیا۔ وہ بیچارہ عجیب و غریب حالات سے دوچار تھا۔ اسے شاید سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ اس سے کیا گناہ سرزد ہوا ہے۔

جب تک لوگ ہمیں ایک دوسرے سے الگ کرتے وہ نیم بیہوش ہو چکا تھا۔ میں آج بھی یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ اگر ہمیں الگ نہ کر دیا جاتا تو جس طرح اس کی گردن میں نے دونوں ہاتھوں میں دبوچ لی تھی۔ شاید میں اس کی جان ہی لے لیتا۔

[illegible] درس گاہ کے اپنے کچھ اصول تھے۔ یہاں ایسی غلط حرکات برداشت نہیں کی جاتی [illegible] خواہ کرنے والا کوئی بھی ہو۔

[illegible] ہوئی اور میرا قصور نکل آیا۔ میرے گھر والوں کو بلایا گیا۔ ایک چچا آئے جنہیں وارننگ [illegible] دی گئی کہ آئندہ یہ حرکت برداشت نہیں کی جائے گی۔ جرمانہ الگ ہو گیا۔ چچا نے اس حرکت کا [illegible] پس منظر جانے بغیر مجھے ڈانٹنا شروع کر دیا۔ مجھے طیش آ گیا اور میں نے ان کے سامنے بھی بدتمیزی کا مظاہرہ کیا۔ اس کے ساتھ ہی یہ دھمکی بھی دی کہ اگر آئندہ کسی نے میرے باپ کے متعلق کوئی بات کہی تو میں اس کا یہی حشر کروں گا۔

چچا نے کچھ زیادہ ہی مرچ مسالہ لگا کر یہ دھمکی دادا جان کے کانوں تک پہنچا دی۔ دوسرے روز [illegible] خود چلے آئے۔ پہلی مرتبہ وہ میرے سکول آئے تھے۔ زندگی میں پہلی مرتبہ ہی میں نے انہیں [illegible] پشیمان بھی دیکھا تھا۔ لیکن جھکنا تو انہوں نے سیکھا ہی نہیں تھا۔ ان کی گردن جوں کی توں اکڑی [illegible] وہ میرے متعلق دکھی ضرور تھے لیکن اپنی جھوٹی انانیت کی خاطر کھل کر اس بات کا اقرار بھی نہیں کرتے تھے۔ دم رخصت مجھے بڑے پیار سے سمجھایا کہ میں آئندہ لڑائی جھگڑا نہ کروں۔ میں نے ان کی بات کا کوئی جواب نہ دیا اور وہ مجھے خاصے پیسے دے کر چلے گئے۔

میں نے آپ کو پہلے بھی بتایا ہے کہ اس درس گاہ میں کم حیثیت والا کوئی طالب علم نہیں تھا۔ جس لڑکے کو میں نے مارا تھا۔ اس وقت تو وہ ڈسپلن کی خاطر چپ رہا لیکن اس نے یہ بات دل میں رکھی۔ ایک روز جب میں سکول سے چھٹی پر اپنے ہوسٹل کے کمرے میں پہنچا تو میرے کمرے کے دروازے پر ایک کارٹون لگا ہوا تھا۔ جس میں ایک آدمی کو اپنی بیوی کے رویئے سے دل برداشتہ ہو کر خودکشی کرتے دکھایا گیا تھا۔

SCANNED BY CamScanner

میرے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ میں نے وہیں کھڑے ہو کر تمام لڑکوں کو گالیاں دینی شروع کر دیں۔ وہ بھی بڑے گھروں کے لڑکے تھے۔ دو لڑکے مجھے مارنے کے لئے آگے بڑھے۔ میں نے کمرے کے باہر رکھا گملا اٹھا کر ایک کے سر پہ دے مارا۔ میرے سر پہ خون سوار ہو گیا تھا۔ جی چاہتا تھا ان سب کو جان سے مار ڈالوں۔ میں نے گملے کا لوہے کا سٹینڈ اٹھا لیا اور دیوانوں کی طرح ان سب پہ پل پڑا۔

مجھے کچھ ہوش نہیں رہا تھا کہ کیا کر رہا ہوں۔ اچانک کوئی چیز میرے سر پہ لگی۔ میں چکرا کر گرا اور بے ہوش ہو گیا۔

ہوش آیا تو میرا سر پٹیوں میں بندھا ہوا تھا اور انگ انگ درد کر رہا تھا۔ میں ایک ہسپتال کے پرائیویٹ کمرے میں پڑا تھا۔ ایک نرس میرے سرہانے کھڑی تھی۔ وہ مجھے ہوش میں آتے دیکھ کر کسی کو اطلاع کرنے باہر چلی گئی۔ دوسرے ہی لمحے میرے بورڈنگ ہاؤس کے انچارج اور ایک پولیس تھانیدار اندر آ گئے۔ تھانیدار کو علم ہو گا کہ میں کون ہوں۔ وہ خاصا مؤدب اور سہما ہوا دکھائی دے رہا تھا۔

میرے ہوسٹل انچارج میری نفسیاتی پوزیشن کو شاید سمجھتے تھے۔ انہوں نے مجھے حوصلہ دیا اور قبل اس کے کہ میں کچھ بولوں۔ مجھے آرام سے لیٹے رہنے کی تلقین کی۔ میرے آنسو نکل آئے۔ انچارج صاحب میرے نزدیک ہی بیٹھ گئے۔ انہوں نے تھانیدار کو جس نے ایک ہاتھ میں گتے سے چپکائے کاغذ پکڑ رکھے تھے کہا کہ وہ باہر جائے اور جب میرے وارث آئیں گے اس کے بعد میرا بیان لکھے۔

تھانیدار "جی جی" کرتا باہر چلا گیا۔ میرے انچارج وہیں کرسی پر بیٹھ گئے اور میری دلجوئی کرنے لگے۔ انہوں نے مجھے سہارا دے کر بٹھایا اور دوائیاں دیں۔ خود مجھے دودھ پلایا۔ اس کے ساتھ مشفق استاد کی طرح مجھے سمجھاتے بھی رہے۔

قریباً شام ڈھلے میری والدہ، دادا جان، دو چچا اور اماں پہنچ گئے۔ ماں آخر ماں ہوتی

ہے۔ اس سے رہا نہ گیا اور ایام عدت کو بھی نظر انداز کر کے بضد ہو کر دادا کے ساتھ ہی چلی آئی۔ مجھ پٹیوں میں جکڑا دیکھ کر وہ رونے لگی لیکن میرا تو جیسے دل ہی پتھر ہو چکا تھا۔

بعد میں مجھے علم ہوا کہ جس لڑکے پہ میں نے گملا پھینکا تھا۔ اس کی حالت بڑی بگڑ گئی تھی۔ ہسپتال کو مجبوراً کر یکس پولیس کو دینا پڑا۔ رات تک میرے اور اس کے ورثا کے درمیان مذاکرات ہوتے رہے۔ دونوں امیر پارٹیاں تھیں۔ اندر ہی اندر انہوں نے آپس میں صلح کر کے معاملہ گول کر دیا لیکن ابھی میرے خلاف تادیبی کارروائی باقی تھی۔ اس مرتبہ گو کہ میرے انچارج صاحب نے میرے حق میں بیان دیا اور کہا کہ مجھے اشتعال دلایا گیا تھا۔ دوسری پارٹی نے بھی صلح کر لی تھی اس لئے شاید مجھے معافی مل گئی۔

بہرحال یہ لڑائی جھگڑا اب میرا آئے دن کا معمول بن چکا تھا۔ دو سال کا عرصہ پلک جھپکتے گزر گیا۔

اس دوران ایک اور اہم واقعہ جو میری زندگی میں بھونچال لے آیا۔ میری والدہ کی دوسری شادی تھی۔ میری والدہ کسی چھوٹے گھر کی عورت نہیں تھیں کہ خاوند کے ساتھ وہ بھی "ستی" ہو جاتیں۔ وہ امیر، آزاد خیال اور پڑھی لکھی ہونے کے علاوہ اپنے ماں باپ کی اکلوتی اولاد بھی تھیں جن کے لئے ان کا غم اب ناقابلِ برداشت ہوتا جا رہا تھا۔

شاید اپنے دکھ کا ازالہ انہوں نے اس طرح کیا کہ بیٹی کو بیاہ دیا۔ یہ تو ممکن ہی نہیں تھا کہ یہ شادی میری والدہ کی مرضی کے بغیر طے کر دی جاتی۔ ان کے سامنے تو کسی کو دم مارنے کی مجال نہیں تھی۔ وہ خود بھی اب زندگی سے تنگ آ چکی تھیں۔ اگر خاوند کے مرنے پہ کوئی امید کی کرن ان کی تاریک بیوگی میں جگمگا سکتی تھی تو وہ میں یعنی ان کا بیٹا تھا۔ لیکن وہ جان گئی تھیں کہ میرے لاشعور میں ان کے خلاف دلی نفرت کی چنگاری نے اب سلگنا شروع کر دیا ہے کوئی دن جاتا ہے کہ وہ شعلہ بن جائے

میں بنیادی طور پہ ایک مظلوم بچہ تھا جس کا واحد روحانی سہارا اس کا باپ حالات کے

WAQAR SCANNED PDF

ہاتھوں قتل ہو چکا تھا۔ میرے اندر اب معاشرے کے لئے جز نفرت کے اور کچھ نہیں رہا تھا۔ میں تلخی ایام کے ہاتھوں فرار چاہتا تھا اور فرار کا آسان ترین راستہ مجھے دولت نے دکھا دیا میرے پاس بے تحاشا دولت تھی۔ دادا اور نانی میں جنگ شروع ہو چکی تھی۔ وہ دونوں پوتے پوتی ایک سی فطرت رکھنے والے تھے۔ اس لئے یہی سمجھتے تھے کہ میرا پیار وہ بے تحاشا دولت کے عوض خرید لیں گے۔ مجھے ہر مہینے ایک خطیر رقم ماں کی طرف سے اور پھر دادا جان کی طرف سے ملنے لگی۔

میٹرک میں پہنچنے تک میں سگریٹ نوشی کبھی کبھی شراب نوشی بھی کرنے لگا تھا۔ پھر ایک روز میں اپنے ہی جیسے بگڑے ہوئے رئیس زادوں کے ساتھ بازارِ حسن میں گانا سننے بھی چلا گیا۔

نیا ماحول، نئے لوگ، نئی قدریں۔ مجھے یہ تو احساس نہ ہوا کہ یہ سب کچھ تو سب ظاہر ہی ظاہر ہے اندر سے تو بالکل کھوکھلا ہے۔ اس رقاصہ نے جس کے پاس مجھے پہلی بار لے جایا گیا۔ اپنی رسومات کے مطابق "نیا شکار" جان کر مجھے خصوصی توجہ دی اور میں جو پیار کا متلاشی تھا یہ سمجھ بیٹھا کہ جو کچھ بھی ہے بس یہی ہے۔ یہی تھی وہ ہستی جس کی تلاش کے لئے میں بھٹکتا رہا ہوں۔ آج گوہر خانم کو مل کر جیسے میری تلاش مکمل ہو گئی ہے۔ میرے ہمراہ آنے والے اس میدان کے پرانے کھلاڑی تھے۔ انہوں نے یہاں آنے سے پہلے میرا تعارف "موٹی مرغی" کی حیثیت سے کروا دیا ہو گا۔

میری سادگی کا اندازہ کیجئے کہ جب ابتدا میں گوہر خانم نے مجھے پان پیش کیا تو اس کی یہی ادا مجھے مار گئی۔ دوران رقص وہ یہی تاثر دیتی رہی کہ میرے گرداگرد موجود سب گدھے ہیں اور اس محفل کا اگر کوئی ہیرو ہے تو وہ ہاشم خان ہے۔ دو سال تک میں گوہر خانم کے کوٹھے پہ دولت لٹاتا اور بدبختیاں سمیٹتا رہا۔ وہ تربیت یافتہ خاندانی طوائف تھی اور اپنے شکار کو پھنسائے رکھنے کے تمام گر جانتی تھی۔ اس نے مجھے جی بھر کے لوٹا۔

میں اب سکول سے ایک بڑے کالج میں پہنچ گیا تھا اور بہت جلد ہوسٹل کے ان طلباء

کا شکار ہونے لگا جو تعلیم کو بھی عیاشی کا ذریعہ سمجھ لیتے ہیں۔ اس دوران دادا جان کی جہاندیدہ نظروں نے اندازہ کر لیا کہ میں غلط راستوں پر چل نکلا ہوں۔ میری سگریٹ اور شراب نوشی کا چرچا تو خاندان بھر میں تھا۔

ایک دو مرتبہ دادا نے سمجھانے کی کوشش کی تو والدہ بھڑ آئیں۔ انہوں نے ہمیشہ میری حوصلہ افزائی کی اور کبھی مجھے یہ احساس نہ ہونے دیا کہ میرے پاس دولت کی کمی ہے۔ میرا ماہانہ جیب خرچ اب سینکڑوں سے ہزاروں روپے میں پہنچ چکا تھا۔ مہینے میں بمشکل دو تین مرتبہ میں کالج میں اپنی شکل دکھاتا تھا لیکن میری حاضری مسلسل لگ رہی تھی۔

اپنے کالج کی یونین میں مجھے اپنی دولت اور بدمعاشی کے بل بوتے پہ ممتاز حیثیت حاصل ہو چکی تھی۔ وہ دور بڑا عجیب تھا۔ آئے روز طلباء کے ہنگامے اور توڑ پھوڑ کی کارروائیاں ہو رہی تھیں۔ مختلف ذرائع سے ہمیں اسلحہ اور پیسے بھی ملنے لگے تھے جن کا ہم بے دریغ استعمال کرتے تھے۔

دادا جان نے میری مسلسل بداعمالیوں سے بالآخر تنگ آ کر ایک روز مجھے صاف صاف کہہ دیا کہ اگر میں نے توبہ نہ کی تو وہ میرا خرچہ بند کر دیں گے۔ اس موقعے پہ میری والدہ آگے بڑھیں اور مجھے کہا کہ میں پیسوں کی بالکل فکر نہ کروں کیا مجال ہے جو انہوں نے ایک مرتبہ بھی مجھے ان حرکات سے منع کیا ہو۔ بس ان کے پاس تو دادا جان کے خلاف شکایتیں تھیں۔ جب موقع ملتا وہ پٹارہ کھول کر بیٹھ جاتیں۔ انہوں نے مجھے ابھی سے اس بات کا احساس دلانا شروع کر دیا تھا کہ دادا جان اور میرے چچا ہمارے حصے کی جائیداد ہڑپ کر جائیں گے۔

میں ان کی ہاں میں ہاں ملاتا رہتا۔ مجھے سوائے گوہر خانم اور شراب و شباب کے اور کسی بات سے کوئی غرض نہیں تھی۔ گوہر خانم کے تقاضے بھی اب بڑھنے لگے تھے۔ اس نے ایک روز مجھے انتہائی اعتماد میں لیتے ہوئے کہا۔

"ہاشم! کیا میں یونہی ساری زندگی تماش بینوں کے سامنے ناچتی رہوں گی۔ تم آخر مجھے

WAQAR Scanned PDF

اس گناہ کی زندگی سے نکال کیوں نہیں لیتے"۔

جو بات میں اپنی زبان پر لاتے ہوئے ہچکچاتا تھا وہ گوہر خانم نے کہہ ڈالی۔ اس کے ساتھ ہی یہ بھی بتا دیا کہ ہمارا فرار یہاں سے ناممکن ہے۔

"پھر کیا کیا جائے؟" — میں نے دھڑکتے دل سے پوچھا۔

"ان لوگوں کی کمزوری صرف دولت ہے ہاشم خان! تم اگر اماں کا منہ بند کرنے کے لئے پچاس ہزار روپے کا بندوبست کر لو تو وہ ہمیں بخوشی شادی کر کے یہاں سے جانے کی اجازت دے دے گی"۔

اس نے مجھ سے اتنی مختصر بات نہیں کی تھی جتنی مختصر میں نے سنائی ہے۔ یہ بات اس نے خاصے ہیر پھیر سے اور گھما پھرا کر کہی تھی، لیکن میں اس کے عشق میں جتنا اندھا ہو چکا تھا۔ اس کے بعد اگر وہ مجھے حکم دیتی کہ آسمان سے تارے توڑ لاؤ تو میں اس کا یہ حکم بھی مان لیتا۔

اس روز جب میں گوہر خانم کے پہلو سے اٹھ کر ہوٹل پہنچا تو مجھ پر عجیب دہشت طاری تھی۔ میری زندگی کا واحد مقصد اب صرف اور صرف گوہر خانم کا حصول رہ گیا تھا۔ ذہن اتنا ماؤف ہو چکا تھا کہ میں نے کبھی یہ نہ سوچا آخر مستقبل میں ہم کیا کریں گے؟

میں اسے لے کر جاؤں گا کہاں؟

اس بھرے پُرے جہان میں مجھے اماں بھی میسر آ سکتی ہے یا نہیں؟

بس ایک ہی نظریہ دل میں جڑ پکڑ چکا تھا کہ گوہر خانم سے شادی کر کے اپنے حصے کی جائیداد لے کر الگ ہو جاؤں گا۔ اگر دادا جان نے الجھن پیدا کی تو ماں کے پاس کم دولت نہیں ہے وہ میرا منہ موتیوں سے بھر دے گی۔

ان پچاس ہزار روپوں کے حصول کے لئے میں نے بڑا سیدھا اور آسان راستہ اپنایا تھا۔ میں ان بگڑے ہوئے امیر زادوں کو جانتا تھا جو کبھی کبھی بطور مشغل "ڈاکہ زنی" کر لیا کرتے تھے۔ انہوں نے مجھے بھی اس "کارِ خیر" میں حصہ لینے کی کئی مرتبہ دعوت دی لیکن مجھے چونکہ ابھی پیسوں

کی کمی کا مسئلہ پیش نہیں آیا تھا اس لئے میں آمادہ نہ ہوا۔

اس مرتبہ میں نے ان کی دعوت کو نہ ٹھکرایا۔

انہیں ایک ایسی ویگن کی خبر مل گئی تھی جو مہینے کی ایک خاص تاریخ کو لاکھوں روپے کیش [illegible] کیا کرتی تھی۔ منصوبہ یہ بنا کہ ہم ایک قدرے ویران راہگذر پہ اس ویگن کو روک کر لوٹ لیں [illegible] ویگن میں ایک گن مین اور تین آدمی بیٹھے ہوں گے۔

ہم پانچ آدمی تھے تین کے پاس پستولیں اور دو کے پاس مشین گنیں تھیں۔ اتنے زیادہ ہتھیار دیکھ کر ہی وہ چوکیدار سہم جاتا۔

وقت مقررہ پہ منصوبے کے مطابق ہم ایک کار میں سوار اس جگہ پہنچ گئے۔ دوپہر کا وقت اور جون کا مہینہ غضب کی گرمی پڑ رہی تھی اور سڑک پر دور دور تک کسی گاڑی کا نام و نشان دکھائی نہیں دیتا تھا۔ ویگن آتی دیکھ کر ہم اپنی اپنی جگہ چوکس ہو کر بیٹھ رہے۔ جیسے ہی ایک موڑ پہ اس کی رفتار کم ہوئی ہمارا وہ ساتھی جو کار میں سوار تھا اچانک اس کے سامنے آ گیا۔ ویگن رک گئی اور ہم آناً فاناً اس کے سواروں کے سروں پہ مسلط ہو گئے۔ گرمی کی وجہ سے کھڑکیاں کھلی تھیں۔ ہم نے انہیں اسلحہ دکھا کر دھمکا کر نیچے اتار لیا۔

چوکیدار کی رائفل چھین لی اور نوٹوں سے بھرا بیگ کار میں رکھ لیا۔ وہاں سے رخصت ہوتے وقت ہمارے ایک ساتھی نے فائر کر کے ویگن کے ٹائر پھاڑ دیئے اور ہم بھاگ نکلے۔ ہماری بدقسمتی کہ وہاں سے روانگی کے بمشکل دو تین منٹ بعد ہی ایک کار وہاں سے گزری جسے لٹنے والوں نے روک کر اپنے لٹنے کی روداد سنائی دی۔

یہ کار سوار کوئی پولیس آفیسر تھا اور کار بھی سرکاری تھی جس میں وائرلیس سسٹم لگا ہوا تھا۔ اس نے اپنے ہیڈ کوارٹر کو اطلاع دی اور ہم ابھی بمشکل چھ سات میل دور اس موڑ پر پہنچے ہی تھے جہاں سے ہم نے گھوم کر ایک ذیلی سڑک پر اترنا تھا کہ وہاں پہلے سے تیار پولیس کی چوکی نے ہمیں گھیرے میں لے لیا۔ مزید بدبختی کہ ہم نے فائرنگ کر کے نکل جانے کی کوشش کی لیکن بے سود۔

WAQAR AZEEM
Scan & PDF

پولیس کی جوابی فائرنگ سے ہمارا ایک ساتھی مارا گیا۔ دو شدید زخمی ہو گئے۔ ہم نے ہتھیار پھینک دیئے۔ گرفتار ہوئے۔ کیس چلا۔ دو سال تک چلتا رہا۔ اس دوران والدہ نے کچھ پیروی کی۔ دادا جان قضائے الٰہی سے اس حادثے کے ڈیڑھ ماہ بعد ہی انتقال کر گئے۔ والد اب خود تین بچوں کی ماں بنا چکی تھیں۔

دادا کے فوت ہوتے ہی تمام اقربا نے مقدمے کی پیروی چھوڑ دی۔ والدہ کے لیے [illegible] کوئی "حریف" (دادا کے مرنے کے بعد) میدان میں نہیں رہا تھا۔ انہوں نے بھی ایک وکیل کے سپرد یہ معاملہ کر کے کنارہ کشی اختیار کر لی۔

جیلیں اور حوالاتیں دولت کے سر پہ کاٹی جاتی ہیں۔ باقی مقدمہ وار امیر لوگ تھے۔ ان کے وکیلوں نے پولیس کی ملی بھگت سے اس جرم کا محرک مجھے گردانا اور عدالت سے دس سال قید کی سزا ہو گئی۔ ان دس سالوں میں میں نے سینکڑوں خطوط اور پیغامات گوہر خانم، اپنی ماں، رشتہ داروں اور دوستوں کو بھیجے لیکن مجھے کوئی ملنے نہ آیا۔

دوران مقدمہ ہی مجھے اپنے گناہوں کا احساس ہو چلا تھا۔ میں نے سچے دل سے توبہ کر لی تھی۔ میں اچھے کردار کی وجہ سے معافی بھی ملتی رہی۔ یہیں میں نے بی اے بھی کر لیا۔ رہا ہو کر ماں کے پاس پہنچا تو انہوں نے پہچاننے سے انکار کر دیا۔ میں ہکا بکا رہ گیا۔

جب ماں ہی مجھے نہیں پہچان رہی تھی تو اور کون پہچانتا۔ تب میں نے یہ عزم کیا کہ آج کے بعد کبھی اس طرف کا رخ نہیں کروں گا۔ میں نے اکیلے سفر کا آغاز کر دیا اور چلتا چلا جا رہا ہوں۔ سزا یافتہ مجرم ہونے کے ناطے میرے لئے کسی کے پاس "رحم" نہیں ہے۔

ایک پرائیویٹ دفتر میں کلرک بن کر زندگی گھسیٹ رہا ہوں۔ شاید اپنے گناہوں کا کفارہ ادا کر رہا ہوں۔

چیونٹیاں نے پھیلے

گورداسپور جیل پر موت کا سناٹا طاری تھا سوائے گشت کرنے والے نمبرداروں کی آواز کے اور کوئی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔ تمام بیرکوں میں قیدی گھوڑے بیچ کر سو رہے تھے صرف پھانسی کوٹھیاں" ہی ایسی جگہ تھی جہاں ایک سزائے موت کا منتظر قیدی اپنی کوٹھڑی کی دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ اسے چند روز پہلے ہی سیشن کورٹ سے سزائے موت کا حکم جاری ہوا تھا اور اب ہائیکورٹ میں اپیل زیر سماعت تھی۔ یہ آتما سنگھ تھا۔ جالندھر کا مشہور ڈاکو جس نے پچھلے دو سال سے پولیس کی نیندیں حرام کر رکھی تھیں۔

آج ہی اسے دربارا سنگھ کا پیغام ملا تھا کہ اگلے دو چار روز ہی میں کام ہو جائے گا اس عرصے میں اسے سکون کا مظاہرہ کرنا تھا۔ دربارا سنگھ اور فضل خاں بھیس بدل کر اور دوسرے ناموں سے اس سے ملاقات کرنے آئے تھے تو اس نے ان سے ایک ہی بات کہی تھی۔

"سجنو! اگر میں گرمیت کور کا بدلہ نہ لے سکا تو جیتے جی مر جاؤں گا۔ ایک مرتبہ میں اس برہمن کے بچے سے نمٹ لوں اس کے بعد مجھے پھانسی ہو جائے۔ میں کم از کم اپنے دل میں کوئی حسرت لے کر مرنا نہیں چاہتا۔"

ان تینوں نے اسی روز منصوبہ تیار کر لیا تھا۔ اب مناسب موقع کا انتظار تھا۔ دربارا سنگھ چونکہ خود بھی مفرور تھا اس لیے کھل کر کسی معاملے میں ہاتھ ڈالنے سے اسے آتما سنگھ اور

SCAN BY PDF WALA

فضل خان نے سختی سے منع کر دیا تھا۔ فضل خاں یہ نہیں چاہتا تھا کہ دربارا پولیس کی نظروں میں آجائے۔

آتما سنگھ کا تعلق سکھوں کی ایک پسماندہ قوم "مذہبی سنگھ" سے تھا۔ تقسیم کے فوراً بعد اس کے عیسائی باپ "خالصہ پنتھ" میں شامل ہو گیا تھا کیونکہ عیسائی بن کر زندگی گزارنا اور وہاں [illegible] دس پندرہ ایکڑ زرخیز زمین چھوڑ کر جانا اس کے لیے ناممکن تھا۔ ابھی ہنوز [illegible] یا چار سال ہی گزرے تھے جب سرپنچ گریوال نے اس کی آدھی زمین زبردستی ہتھیالی۔

تمہاری دو بیٹیاں اور ایک لڑکا پاکستان میں رہتے تھے۔ تم خود ریٹائرڈ فوجی ہو اور پاکستان کے لیے جاسوسی کرتے ہو۔ اگر زیادہ چوں چراں کی تو یاد رکھنا"۔۔۔ گریوال نے اس کو دھمکی دیتے ہوئے کہا۔

۱۹۶۵ء کی لڑائی لگی تو سب سے پہلے انڈین انٹیلی جنس نے آتما سنگھ کے باپ کو "نظر بند" کر دیا اس کا گناہ صرف یہ تھا کہ اس کے تین بچے ابھی تک عیسائی تھے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ پاکستان میں رہتے تھے اور یہ ناقابل معافی گناہ تھا۔

ان دنوں آتما سنگھ آٹھویں جماعت میں پڑھتا تھا بس باپ کی صرف یہی خواہش پاٹھ شالا میں لیے جا رہی تھی۔ ورنہ تو مذہبی سکھوں کے بچے سوائے سرداروں کی خدمت کرنے کے اور کوئی کام نہیں کیا کرتے تھے۔ سرپنچ گریوال کو رہ رہ کر یہ بات کھاتی تھی کہ ایک کمین کا لڑکا تعلیم کیوں حاصل کر رہا ہے۔

"تم لوگ آستین کا سانپ پال رہے ہو۔ ایک تو حکومت نے ہریجن کہہ کر سر چڑھا رکھا ہے اور اب شیڈول کاسٹ کے لیے نئی نئی آسامیاں بھی نکالی جا رہی ہیں۔ میں کہتا ہوں تمہیں آخر کیا ہو گیا ہے؟ تمہارے پرکھوں کی آن کیا مر گئی ہے؟ ایک چوڑے کا لونڈا جب کل کو پڑھ لکھ کر افسر بن گیا تو سارے گاؤں کا کیا حال کرے گا۔ کبھی سوچا ہے تم نے؟" وہ اکثر پنچایت میں ایسی باتیں کیا کرتا تھا۔

۱۹۶۵ء کی جنگ ختم ہو گئی اور تین مہینے تک نظر بند رہنے کے بعد بالآخر آتما سنگھ کا باپ بھی رہا ہو کر آ گیا۔ سرپنچ گریوال نے نجانے کیا چکر چلایا کہ دوسرے روز ہی آتما سنگھ کو پاٹھ شالا سے چھٹی مل گئی۔

"یہاں سب اونچی جاتی کے بچے پڑھتے ہیں۔ ہم نے اپنا ماحول خراب نہیں کرنا۔ ہم سرپنچ سے [illegible] مول لے کر یہاں پاٹھ شالا چلانے سے تو رہے۔ تم تو جانتے ہی ہو یہ پاٹھ شالا حکومت کی گرانٹ پر چل رہا ہے اور سرپنچ کو ناراض کر کے ہم اپنی گرانٹ بند کروا لیں گیا؟" شام کماری نے جو پاٹھ شالا کی ہیڈ مسٹرس تھی۔ اس کے باپ کو سمجھاتے ہوئے کہا۔ جب اس طرح اچانک اس کے بیٹے کو سکول نکالا بھی مل گیا تو وہ ٹوٹ کر رہ گیا۔ یہ روگ اس کی بیوی کو کھا گیا اور جس روز آتما سنگھ کی ماں مری اس روز پہلی مرتبہ اس نے بغاوت کی۔

"باپو! ماتا کی ارتھی جلانا نہیں۔ اس نے ہماری طرح اپنا مذہب نہیں بدلا تھا وہ آخر تک عیسائی رہی اس نے کبھی گردوارے کا منہ بھی نہیں دیکھا۔ باپو! وہ ہماری طرح بزدل نہیں تھی۔"

"میرے بچے خداوند تمہیں کبھی میرے جیسا مجبور نہ کرے۔ کاش میں تمہارے بھائی بہنوں کا کہا مان کر پاکستان چلا جاتا کاش۔!! اب تو بیٹا ہمارے لیے رسوائی ہی رسوائی ہے۔ تم کسی قابل ہو جاؤ تو ہم کہیں دور دراز چلے جائیں اور ان ظالموں سے ہماری جان چھوٹ جائے"!!! اس نے بچوں کی طرح سسکیاں لیتے ہوئے آتما سنگھ سے کہا۔

"باپو خداوند یسوع مسیح کی قسم میں ان سب سے گن گن کر بدلے لوں گا۔ میں کسی کو معاف نہیں کروں گا"۔ اس نے صرف اتنی بات کہی اور واپس گاؤں چلا آیا۔

آتما سنگھ کے باپ کو اس کے دوسرے ساتھی بمشکل سہارا دے کر اس کے گھر تک لائے تھے اسے زندگی میں پہلی مرتبہ دل کا دورہ پڑا تھا وہ "دکھوریہ کراس" یافتہ فوجی تھا۔ اور برما کے محاذ پر اس نے بڑے بڑے زبردست معرکے لڑے تھے۔ لیکن زندگی کی جنگ وہ بڑی آسانی سے ہار گیا۔

"مکھے! میری امانت تیرے حوالے تو ہی میرا واحد یار ہے اس ملک میں"۔ اس نے ایک

Scanned with CamScanner

روز مکھا سانسی سے التجا کی جو اس کی خبر گیری کو آیا تھا۔ آتما کھیتوں میں کام کرنے گیا ہوا تھا۔ وہ اب سولہ سال کا گبھرو بن چکا تھا۔ اسے دیکھ کر بڑے بڑے جٹ سرداروں کے لڑکے بھی غلط فہمی کر رہ جاتے تھے۔ قدرت نے حسن اور جوانی تو گویا اس چوڑے پر لٹا دی تھی۔

پھر ایک روز آتما سنگھ بھاگا بھاگا مکھا سانسی کے پاس گیا اس کا سانس پھولا ہوا تھا ایسا لگتا تھا جیسے وہ ہزاروں میل کی مسافت پیدل طے کر یہاں تک پہنچا ہے۔

"چاچا! باپو مر گیا۔" اس نے بمشکل اتنا کہا اور مکھے سانسی کے ہاتھوں میں جھول گیا۔

"ہوش کر پتر! کوئی بات نہیں۔ ابھی تیرا باپو زندہ ہے۔ مجھے تو انتظار ہی اس وقت کا تھا۔"

اس نے آتما سنگھ کو سنبھالتے ہوئے کہا۔

مکھے سانسی کے متعلق کسی کو کوئی غلط فہمی نہیں تھی۔ وہ سمگلنگ کا بادشاہ تھا۔ اب اس نے خود تو سرحد پار کرنا چھوڑ دی تھی اور صرف "تھامو" بن کر رہ گیا تھا لیکن اس کے بیٹوں نے باپ کی جگہ سنبھال رکھی تھی۔ اس کے چاروں بیٹے باری باری "کیس مقابلہ" میں جیل یاترا کر چکے تھے اور اکثر عدالت پر ہی رہتے تھے۔ ان کا مال درجنوں بار ڈھے چکا تھا اور دو تین مرتبہ پاکستانی سمگلر بھی اس کے اڈے سے گرفتار ہو چکے تھے۔ اس کے باوجود انڈین پولیس اسکو ڈکر ہاتھ ڈالا کرتی تھی اس نے کئی بار آتما سنگھ کے باپ کو کہا تھا کہ وہ پیچھے ہٹ جائے اور اسے خود گریوال سے نمٹنے دے۔ لیکن آتما سنگھ کے باپ نے ہر دفعہ اسے سختی سے منع کر دیا۔ اسے علم تھا کہ ایک مرتبہ اگر سانسیوں نے گریوال پر ہاتھ اٹھا لیا وہ اسے آفیشل سیکرٹ ایکٹ کے تحت جاسوسی کے جرم میں ساری عمر کے لیے انٹروگیشن سنٹروں میں سڑنے کے لیے پھنکوا دے گا۔

"مکھا سانسی" نے بڑے اطمینان سے اپنے یار کو شمشان گھاٹ تک پہنچایا اور اس کی آخری رسومات ادا کیں۔ اس نے بہتیرا زور لگایا کہ آتما سنگھ اس کے ساتھ ہی چلا آئے لیکن آتما سنگھ نے انکار کر دیا اس نے اپنی زمین کاشت کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

"تیرے باپ کی اور بات تھی پتر! تو اپنے چچا کا سر نیچا نہ ہونے دینا۔ خود کو کبھی اکیلا نہ سمجھنا"

جاتے جاتے مکھا سانسی نے اس سے کہا۔

مشکل دس دن ہی گزرے تھے کہ سرپنچ گریوال کے لڑکے آ گئے۔ ٹریکٹر پر گریوال کا بڑا لڑکا اندر جیت اور منور لال کے دونوں لڑکے اپنے دو تین مزارعوں کے ساتھ بیٹھے تھے۔

"اے چوڑے کی اولاد تو یہاں کیا کر رہا ہے۔ بھاگ جا تو بھی پاکستان اپنے بہن بھائیوں کے پاس۔" اندر جیت کے جو شراب کے نشے میں دھت تھا اسے للکارا اور ہاتھ میں پکڑی ہاکی لے کر اس پر پل پڑا۔ دو تین ضربیں تو آتما سنگھ نے برداشت کر لیں پھر دوسرے ہی لمحے ہاکی اس کے ہاتھ میں تھی اور گریوال کا لڑکا زمین چاٹ رہا تھا۔ یہ منظر دیکھ کر منور لال کے لونڈوں کی ہمت کو بھی بریک لگ گئے۔ انہوں نے مزارعوں کو غیرت دلائی اور سارے آتما سنگھ کی طرف بڑھے اس اثنا میں آتما سنگھ نے اندر جیت کا حلیہ بگاڑ کر رکھ دیا تھا۔ منور لال کے درنوں لڑکوں نے کرپانیں نکال لی تھیں اور مزارعوں نے برچھے سنبھال رکھے تھے۔ آتما سنگھ نے عقل مندی کی اور بھاگ جانے میں عافیت سمجھی۔ لیکن بھاگنے سے پہلے اس نے اتنی تیزی سے اندر جیت کو ضربات لگائی تھیں کہ اس کے ایک بازو کی ہڈی اور دو پسلیاں ٹوٹ گئیں وہ سیدھا سانسیوں کے ڈیرے پر گیا تھا اس وقت سورج غریبا ڈھل رہا تھا۔ جلدی جلدی اس نے مکھے سانسی کو تمام واردات بتائی۔

"شاباش پتر! مجھے امید تھی کہ تیرا خون ابھی اتنا بے غیرت نہیں ہوا۔ حوصلہ رکھ کوئی تیرا بال بیکا نہیں کر سکتا۔" اس نے آتما سنگھ کو اپنے لڑکے کے حوالے کر دیا۔ تھوڑی دیر کے بعد ہی گاؤں کے سرکردہ لوگ پولیس کے ساتھ وہاں موجود تھے۔

"مکھے بات بہت دور چلی گئی ہے۔ ملزم میرے حوالے کر دے" تھانیدار نتھا سنگھ نے اس سے کہا۔

مکھے کو علم تھا کہ اس سے "مہینہ" وصول کرنے والا نتھا سنگھ یونہی اس کے ڈیرے تک نہیں آ گیا۔

WAQAR SCANNED BY

"تھانیدار! پہلی بات تو یہ ہے کہ یہاں آتما سنگھ آیا ہی نہیں اور اگر آیا بھی ہے تو یہاں نہیں ہے۔ مجھے اس کے علاوہ کچھ نہیں کہنا۔ اگر کسی مائی کے لال کی ہمت ہو تو اندر گھس کر دیکھ لے۔" مکھا سالنی کے پیچھے اس کے لڑکے ایک قطار میں برچھے تھامے کھڑے تھے اور گریوال کو اس کے منہ لگنا ذرا مشکل دکھائی دے رہا تھا۔

"ٹھیک ہے ہمارے آدمیوں نے ڈیرے کی ناکہ بندی کی ہوئی ہے۔ تو بھی ناہموار آدمی ہے اس لیے ہم عورتوں کی موجودگی میں تلاشی نہیں لے رہے مکھے جو بات گڑ سے ختم ہو جائے اس کے لیے زہر کا استعمال اچھی بات نہیں ہے۔" گریوال نے جانتے جانتے مکھے سالنی کو بے لفظوں میں دھمکی دی پر وہ بھی سالنی تھا کسی طرح دقت ٹالنا چاہتا تھا۔ جیسے ہی گاؤں والے رخصت ہوئے اس نے دربارے کو بلایا۔

"بچہ اسے آج رات ہی پار لے جا۔ بہرام خان سے کہہ دینا ہماری عزت کا سوال ہے۔ یہ میرے جگری یار کا بیٹا ہے۔ اور میں نے اس کو ہر حال میں گریوال اور ٹھوردلال سے بچانا ہے۔" اس نے دربارے کو سمجھاتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے چاچا۔ تو بے فکر رہ۔ میں پہلی گشت کی روانگی سے پہلے ہی نکل جاؤں گا۔"

"چنگا بچہ رب راکھا۔"

کہہ کر مکھا سالنی وہاں سے چل دیا وہ اپنے ڈیرے کے گرد کی گئی گریوال کی ناکہ بندی کا جائزہ لینے جا رہا تھا جلد ہی واپس لوٹ آیا۔ دربارا سنگھ بیلے کی طرف روانہ ہو چکا تھا۔

اس رات پہلی مرتبہ آتما سنگھ نے سرحد عبور کی اور اس کی ملاقات بہرام خان کے بیٹے فضل خان سے ہوئی تھی۔ بہرام خان خود بڈھا شیر بن چکا تھا اور مکھے سالنی کی طرح اب صرف ڈیرے دار ہی بنکر رہ گیا تھا۔ ایک زمانہ وہ تھا جب دونوں یار فرنگی پولیس کے لیے دہشت کی علامت بن چکے تھے۔ انہوں نے ناچھے" اور "بار" کے شاید ہی کسی علاقے میں پولیس کو معافی دی ہو۔ ہندو بانیے تو مکھے اور بہرام کا نام ہی سن کر کانپ اٹھتے

WAQAR SCANNER

تھے اور ان کا پیغام ملنے پر ہی مال لے کر پہنچ جایا کرتے تھے۔

مکھے سالنی اور بہرام کی یاری اب ان کی اولادوں میں منتقل ہو چکی تھی۔ بہرام خان نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا اور اس روز صبح کو اپنے لڑکے فضل خان کے ساتھ ایک گھوڑی پر گریوال کے پیچھے محفوظ علاقے میں بھیج دیا تھا۔ آتما سنگھ نے زندگی کا ہمیشہ ایک ہی روپ دیکھا تھا۔ جبر اور قہر کا روپ۔ فضل خان کے ساتھ دو دن گزار کر ہی اسے احساس ہو گیا کہ وہ درندوں کے چنگل سے نکل کر انسانوں کے پاس پہنچ چکا ہے اسے اب وہ رہ کر تلاش آ رہا تھا کہ وہ بزدلوں کی طرح اپنا سب کچھ گریوال کو سونپ کر بھاگ آیا تھا۔ وہ دن رات انتقام کی آگ میں جل رہا تھا۔

آٹھویں روز دربارا سنگھ دوبارا اس سے ملنے آیا جس کی زبانی اسے علم ہوا کہ ایس پی کی ذاتی نگرانی میں پولیس نے تین دفعہ ان کے گھر کی تلاشی لی ہے اور اب وہ مکھے کو یرغمالی بنا کر لے گئے ہیں۔

"دربارے! بس یار بہت ہو گئی۔ میں تمہارا دینا کبھی نہ دے سکوں گا۔ اب مجھے اکیلا چھوڑ دو میرا اب کون ہے مجھے اپنی ماں اپنے باپ اور اپنی زمین کا قرض چکا لینے دو!"

دربارا سنگھ بڑے سیانے بدمعاش کا بیٹا تھا۔ اس نے تربیت مکھے سالنی سے حاصل کی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ جذبات میں کی جانے والی حرکت کا نتیجہ کتنا خطرناک ہوتا ہے۔ وہ بدمعاش کا بدمعاش بیٹا تھا۔ وہ لفظوں کے تول سے آدمی کی کمیت جان لیتا تھا۔ اسے پہلے ہی روز سے آتما سنگھ سے ایک خاص خوشبو آیا کرتی تھی اور اسے تلاش بھی کسی ایسے سنگ کی تھی۔ فضل خان اور دربارا سنگھ اس رات کافی دیر تک جاگتے رہے پھر ایک فیصلے پر پہنچ کر وہ سو گئے اس رات دربارا سنگھ واپس اپنے گاؤں آ گیا۔

اگلے روز اینٹی سمگلنگ سٹاف کو اطلاع ملی کہ مکھے سالنی کے ڈیرے پر مال آیا ہوا ہے۔ ایک سپیشل مجسٹریٹ کی نگرانی میں پولیس نے چھاپہ مارا اور مکھا سالنی کے ڈیرے سے

SCANNED BY CamScanner

آدھ کلو افیون برآمد کر کے اس کے چاروں لڑکوں کو گرفتار کر لیا۔ اسی روز مقامی پولیس نے ان کا ریمانڈ حاصل کر کے ایس۔ ایچ او بلکار سنگھ کو ان کی تفتیش پر مامور کر دیا۔ بلکار سنگھ بھی یار دل کا یار تھا اگر مکھا سانسی نے کبھی اس کے نذرانے میں بخل سے کام نہیں لیا تھا تو اس نے بھی حق نمک ادا کرنے میں کبھی بزدلی نہیں دکھائی تھی۔ اگلے ہی روز شام کے وقت اس نے دربارا سنگھ کو اپنے "ڈسک" پر آزاد کروا دیا۔

اپنے منہ سر کو لپیٹ کر وہ تھانے کی عمارت سے باہر آ گیا۔ کسی کو کانوں کان بھی خبر نہ ہوئی تھی۔ حسب وعدہ فضل خاں اور آتما سنگھ بیلے میں اس کے منتظر تھے۔

سورج ابھی مکمل غروب نہیں ہوا تھا جب وہ گھوڑیوں پر سوار آتما سنگھ کے کھیتوں میں پہنچ گئے جہاں گریوال اور تھور لال کے لڑکے حویلی میں شراب پی رہے تھے۔ سب سے آگے آتما سنگھ اس کے پیچھے دربارا سنگھ اور فضل خاں تھے۔ انہوں نے مزارعوں کو تو ایک ہی گھرکی پلائی اور وہ سہم کر ایک طرف کھڑے ہو گئے۔

تین منٹ کے اندر اندر وہاں تین لاشیں پھڑک رہی تھیں۔ انہوں نے تینوں لاشیں ٹریکٹر پر لادیں اور مزارعے کو حکم دیا کہ وہ ٹریکٹر سیدھا گریوال کے ڈیرے پر لے جائے۔ آتما سنگھ اور اس کے دونوں ساتھی ٹریکٹر کے ساتھ گھوڑیاں بھگاتے ہوئے چلے جا رہے تھے۔ گریوال کی حویلی کے دروازے پر کھڑے ہو کر آتما سنگھ نے اس مکار کو باہر بلایا۔ اس اثنا میں اس کے دونوں ساتھیوں نے ہوائی فائرنگ کر کے گاؤں میں دہشت پھیلا دی تھی۔

وقت گزر رہا تھا اور پولیس کی آمد کا خطرہ۔ فضل خاں نے للکارا مارا اور ہوائی فائرنگ کر کے انہیں متنبہ کیا۔ تینوں گھوڑیوں نے گاؤں کا چکر کاٹا اور دھول اڑاتی غائب ہو گئیں۔

جس وقت گاؤں والے پرچہ کروانے والے تھانے میں پہنچے تو دربارا سنگھ چوہیں کی حراست میں وہاں پہلے سے موجود تھا۔ فضل خاں اور آتما سنگھ سرحد پار کر چکے تھے۔ تھانیدار بلکار سنگھ نے ایف آئی آر میں دربارا سنگھ کا نام درج کرنے سے انکار کر دیا۔

"تمہارا دماغ خراب ہے کیا؟" تھانیدار بلکار سنگھ نے مدعیان سے کہا۔

اس اثنا میں تھور لال کے آدمی بھاگے اور شہر سے ایس پی صاحب کو لے آئے۔ ایس پی دربارا سنگھ نے بہ نفس نفیس روزنامچہ دیکھا۔ مکھا سانسی اور اس کے بیٹوں کی گرفتاری کی تصدیق کی۔ وہ گھاگ پولیس افسر تھا تمام بات اس کی سمجھ میں آ گئی لیکن وہ کچھ کر نہیں سکتا تھا۔

"مہاراج! ماتا کی قسم لے لیں۔ پرماتما کی قسم لے لیں۔ مہاراج ہم نے خود اپنی آنکھوں سے دربارے کو دیکھا ہے۔" گاؤں والوں نے قسمیں کھا کھا کر گواہیاں دیں۔

ایس۔ پی ڈوبے تھور لال کا ذاتی دوست تھا اور اکثر اس کا مہمان رہا کرتا تھا۔ لیکن آج وہ مجبور تھا۔

"شاجی! مجھے علم ہے لیکن دنیا کا کوئی قانون مجھے بلکار سنگھ یا دربارے کے خلاف کارروائی کرنے پر مجبور نہیں کر سکتا۔" مکھے سانسی نے بہت گہری چال چلی۔ وہ بہت خطرناک شخص ہے۔ میرے پتا جی انسپکٹر ریٹائر ہوئے تھے۔ انہوں نے تیس سال اس علاقے میں نوکری کی ہے لیکن مکھے سانسی جیسا مکار بدمعاش انہوں نے بھی نہیں دیکھا۔ "شاجی! وقت کا انتظار کیجیے۔" اس نے غم و غصہ سے نڈھال تھور لال کو ایک طرف لے جا کر سمجھایا۔

تھور لال تو جیسے تیسے یہاں تک آ ہی گیا تھا۔ گریوال تو اس قابل ہی نہیں تھا۔ دو جوان بیٹوں کی موت نے اس کی کمر توڑ ڈالی۔ صدمے اور غصے نے اسے نیم پاگل کر دیا تھا۔ آتما سنگھ نے پچھلے پچیس سال کا بدلہ صرف پانچ منٹ میں اتار دیا تھا۔

بالآخر سارے گاؤں کے جات منہ لٹکائے واپس آ گئے۔ پولیس نے آتما سنگھ اور اس کے دو گمنام ساتھیوں کے خلاف مقدمہ درج کر لیا تھا۔ لیکن دربارا سنگھ کا نام اس مقدمے میں نہیں تھا۔ اس روز رات ڈھلنے سے پہلے ہی فضل خاں اور آتما سنگھ پاکستانی علاقے میں واپس آ چکے تھے اور اب وہ مکمل محفوظ تھے۔ آتما سنگھ کو یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اس نے یہ کارنامہ سرانجام دے کر اپنے سر سے سارا بوجھ اتار دیا ہو۔ اس کو اپنا وجود کافی ہلکا پھلکا محسوس ہو رہا تھا پندرہ

WWW.PAKSOCIETY.COM
Scanned by

بیس روز تک وہ فضل خاں کا مہمان رہا۔ اس اثنا میں اس نے سمگلنگ کے تمام اسرار و رموز سے آگاہی حاصل کر لی تھی۔ فضل خاں نے اس کو سرحدی محافظوں کی تمام کمزوریاں اور غیر قانونی طور پر سرحد عبور کرنے کے تمام طریقے بتا دیے تھے۔

پھر آتما سنگھ نے ایک نئی زندگی کا آغاز کر دیا۔ اس مرتبہ جب وہ انڈیا واپس گیا تو اپنے ساتھ افیون لے کر گیا تھا۔ سکھے سانسی اور اس کے بیٹوں کی لگے ہی ہفتے ضمانت ہو گئی۔ اس سے دو تین روز بعد ہی ایس۔ ایچ۔ او بلکار سنگھ کا تبادلہ ہو گیا۔ اب وہاں منشی لال اور گربچن کا بالکل خاص آدمی تھانیدار کیدار ناتھ آ چکا تھا جس نے یہ "سونے کی کان" تھانہ سنبھالنے سے پہلے ٹھور لال اور گربچن کو "وچن" دیا تھا کہ وہ آتما سنگھ دربارا سنگھ اور فضل خاں کو ہر حال موت کے گھاٹ اتار دے گا خواہ اس کے لیے اسے ملازمت سے ہاتھ کیوں نہ دھونے پڑیں۔ آتما سنگھ کی غیر موجودگی میں کسی نے اس کے کھیتوں کی طرف منہ کرنے کی جرأت نہیں کی تھی۔ ایک روز گاؤں والے یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ راتوں رات وہاں چھوٹی بیبی نصب ہو چکی تھی اور سکھے سانسی کے لڑکے ٹریکٹر چلا رہے تھے۔ گربچن کے آدمی فوراً تھانے کی طرف بھاگے اور تھوڑی دیر کے بعد تھانیدار کیدار ناتھ وہاں موجود تھا۔

"اوے چھندے جا وہ رجسٹری نے آ" اس نے بجائے تھانیدار کو جواب دینے کے اپنے لڑکے کو آواز دی اور جب وہ واپس پلٹا تو اس کے ہاتھ میں کچھ سرکاری خرید و فروخت کے کاغذات تھے۔ کیدار ناتھ نے بڑی بے صبری کے ساتھ کاغذات کا معائنہ کیا۔ آتما سنگھ نے وقوعہ سے قریباً ایک ہفتہ قبل یہ زمین اس کے ہاتھ فروخت کر کے رقم وصول کر لی تھی۔ تھانیدار کو اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ اس کے حکم پر دو سپاہی بھاگے اور پٹواری کو لے آئے پٹواری کے رجسٹروں نے تمام اندراج کے صحیح ہونے کی تصدیق کر دی اور تھانیدار تلملا کر رہ گیا۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ سکھے کو جہان سے مار ڈالے۔

جس وقت کیدار ناتھ واپس جا رہا تھا۔ اس کا بے بس آئی شربا اور تھانے کا محرر

سکھے سانسی کو حیرانی میں اس کے بڑکے دربارے کے ساتھ سانسیوں کے گھر کی نکالی ہوئی "پہلے توڑ" کی شراب سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔

ایس۔ ایچ۔ او کیدار ناتھ واپس تو آ گیا تھا لیکن چین سے وہ بھی نہ بیٹھا۔ اس نے بخوبی اندازہ لگا لیا تھا کہ تھانے کے سارے ملازمین ہی سکھے سانسی کے کاٹنے ہیں اور وہ اس کے کام میں ہمیشہ روڑے اٹکاتے رہیں گے۔ اس کے علاوہ نہ صرف ایم ایل اے سے اس کی گاڑھی چھنتی تھی بلکہ عدالت کچہری میں بھی شاید ہی کوئی ایسا افسر تھا جس سے اس کی آشنائی نہ رہی ہو۔ ان حالات میں کوئی بھی قدم سوچ سمجھ کر ہی اٹھایا جا سکتا تھا۔

سانسیوں کی اپنی کچھ مخصوص رسومات ہوتی ہیں سب سے پہلے یہ کہ وہ اپنے کسی بچے کو اپنا بچہ نہیں مانتے جب تک پولیس کچہری میں اس کا نام نہ گونجنے لگے اور دوسری بات یہ کہ وہ بہادر دل کی قدر کرتے ہیں سکھے کا چل چلاؤ ہی تھا۔ لڑکے ایک سے ایک بڑھ کر اٹھے تھے۔ ان کو پولیس کی آنکھ مچولی سے فرصت ہی کب ملتی تھی کہ وہ اور کسی کام کے بارے میں سوچ سکیں۔ آتما سنگھ نے سکھے سے وہ بات پالی تھی جو وہ چاہتا تھا اس نے آتما سنگھ کے پہلے کارنامے پر ہی اپنی لڑکی گرمیت کا ہاتھ اس کے ہاتھ میں دینے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

تین چار ماہ میں فضل خاں نے اسے سارے گر بتا دیے تھے۔ وہ اب دربارا سنگھ اور فضل خاں کی طرح سرحدی کیرا بن چکا تھا۔ اس کو بھارتی حکومت مفرور قرار دے چکی تھی اور سرحدی پولیس کو خفیہ اطلاعات موصول ہو چکے تھے کہ اسے ہر صورت میں زندہ یا مردہ گرفتار کر لیا جائے۔ ایک روز سکھے نے اپنے بیٹے دربارے سے بھی مشورہ کر لیا اور اس کی منظوری ملنے پر اس نے اپنے بڑے بوڑھوں کو اکٹھا کر کے اپنے فیصلے سے آگاہ کر دیا اپنی روایت کے مطابق تمام سانسیوں نے ایسے گبھرو جوان سے بیٹی بیاہنے پر اسے خراج تحسین پیش کیا اور سارے سانسی مل بیٹھ کر سلاح مشورہ کرنے لگے کہ اسے کس طرح جالندھر میں آباد کیا جائے بالآخر وہ سب ایک نتیجے پر پہنچ گئے۔

WAQAR ZAKI SCANNED PDF

جالندھر کے ہی ایک گاؤں میں جہاں سانسیوں کی اکثریت آباد تھی۔ آتما سنگھ اور گوبند کی شادی بڑی دھوم دھام سے سانسیوں کے رسم و رواج کے مطابق انجام پائی۔ فضل خاں نے آتما سنگھ کی طرف سے ایک ہندو دوست کے روپ میں شرکت کی تھی۔ اس شادی کی دھوم اردگرد کے دیہات میں مچ گئی تھی۔ یہ الگ بات ہے کہ گورداسپور پولیس کو کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوئی۔

دربارا سنگھ نے اب سارا زور اس بات پر لگا دیا تھا کہ وہ آتما سنگھ کا نام کسی نہ کسی طرح پولیس کی فائلوں سے نکلوا دے کم از کم وہ اسے گریوال والے کیس میں بے گناہ ثابت کروا دے۔ پھر ایک روز نکھا سانسی اور اس کا بیٹا آتما سمیت یہ عزم لیکر دلی روانہ ہوئے وہ اب اپنے پرانے دوستوں سے حق نمک وصول کرنے جا رہے تھے۔

بیٹی شادی کرنے کے تین چار ماہ بعد یہ علم ہوا کہ گورداسپور کی پولیس نے اسے اشتہاری قرار دے رکھا ہے۔ اس نوجوان نے ضمانت قبل از گرفتاری کروا رکھی تھی۔ اسے خطرہ تھا کہ گورداسپور کی پولیس اسے کسی کے قتل میں خواہ مخواہ پھنسا کر پریشان کرنا چاہتی ہے ایس۔ پی نے نوجوان کو اپنے دفتر میں کرسی پیش کی اور دو تین روز بعد پولیس انکوائری رپورٹ مل گئی کہ نوجوان آتما سنگھ گزشتہ ایک سال سے کلکتہ میں قیام پذیر تھا اور وقوعہ کے تین روز بعد تک سرکاری ہسپتال میں داخل رہا تھا۔ یہ کارروائی اتنی تیزی کے ساتھ اور ایسے خفیہ طریقے سے عمل میں آئی تھی کہ گورداسپور کی پولیس کو کانوں کان خبر نہ ہو سکی اور ان کی آنکھیں اس وقت کھلیں جب آتما سنگھ نے گورداسپور کے تھانیدار بلکار اسنگھ پر استغاثہ کر دیا کہ اس نے گریوال اور نتھو لال کی ملی بھگت سے اس کے خلاف قتل کا مقدمہ درج کیا ہے۔

بلکار اسنگھ اس وقت کسی دوسرے تھانے میں تعینات تھا لیکن موقع افسر ہونے کی وجہ سے وہ مقامی تھانے کی طرف سے پیش ہوا ایسا گول مول سا بیان دیا کہ عدالت جج نے اسے عدالت ہی میں کھری کھری سنا دیں اور پولیس کو حکم دیا کہ اس کے خلاف [illegible] اور ناجائز اختیارات کے ضمن میں باقاعدہ کارروائی کر کے عدالت کو رپورٹ پیش [illegible] عدالت عالیہ نے آتما سنگھ کو باعزت بری کر دیا تھا۔

تھانیدار کیدار ناتھ کو جب تمام واقعات کا علم ہوا تو وہ چکرا کر رہ گیا۔ ایسے مکار بدمعاش سے آج تک پالا کبھی نہیں پڑا تھا۔ اس نے ایس پی دوبے اور گریوال کے سامنے حلف اٹھایا کہ [illegible] اور آتما سنگھ سے ایسا بدلہ لے گا کہ نہ اس سے پہلے کسی نے لیا ہو نہ اس کے بعد کوئی لے گا۔ اس نے بڑا خطرناک منصوبہ تیار کیا تھا اسے امید تھی کہ نکھا سانسی لاکھ چالاک ہوشیار ہونے کے باوجود اس سے بچ نہیں سکتا۔ اس نے گریوال وغیرہ کی طرف سے ایک رپورٹ آتما سنگھ کے خلاف درج کی تھی کہ اس نے قاتلانہ حملہ کر کے اس کے ملازم کو زخمی کر دیا۔

کیدار ناتھ نے اندر ہی اندر زخمی کی میڈیکل رپورٹ حاصل کر لی اور روزنامچے میں دو تین مرتبہ چھاپے کی کارروائی بھی ڈال دی۔ جالندھر میں ایس پی دوبے نے اس بات کا [illegible] بندوبست کر رکھا تھا کہ جالندھر کی پولیس کی طرف سے دوسرے تیسرے روز آتما سنگھ کی گرفتاری کے لیے چھاپے مارنے کی مہم کاغذی طور پر جاری ہے۔ یہ سب کچھ اتنی ہوشیاری اور خفیہ طریقے سے انجام پا رہا تھا کہ نکھے کے فرشتوں کو بھی خبر نہ ہو سکی۔

قریباً تین مہینے کے بعد ایک روز جب آتما سنگھ اپنی بیوی گرمیت کے ساتھ گاؤں آیا ہوا تھا۔ گھر میں آتما سنگھ کی بیوی اور نکھے کا ایک لڑکا موجود تھا۔ کیدار ناتھ نے پولیس کے دستے کے ساتھ آتما سنگھ کی گرفتاری کے لیے چھاپہ مارا۔ مخبر کی اطلاع بالکل درست تھی۔ گھر میں واقعی نکھا اور اس کے باقی لڑکے موجود نہیں تھے۔ حویلی کا دروازہ حوالدار جگن ناتھ نے کھٹکھٹایا۔

"کون ہے کیا بات ہے؟" نکھے کی لڑکی نے ایک سوراخ میں سے جھانکتے ہوئے پوچھا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

"دروازہ کھولو — ہم آتما سنگھ کو گرفتار کرنے آئے ہیں۔" باہر سے کیدار ناتھ بولا۔

گرمیت سانسی کی لڑکی تھی ایسی باتیں اُسکے خون میں رچ بس چکی تھیں۔ اس نے پہلی ہی نظر میں حالات کا اندازہ لگا لیا تھا۔

"کھولتی ہوں ایک منٹ"۔ اس نے اپنے چھوٹے بھائی کو آنکھ کے اشارے سے صورت حال سمجھائی۔ پولیس مقابلہ سانسیوں کے لیے معمول کی کارروائی تھی اور عموماً وہ تیاری کی حالت میں رہتے تھے۔ مکھے کے چھوٹے لڑکے نے اپنے بہنوئی کو افراتفری میں حالات سمجھنے سے پہلے ہی دیوار سے پرلی طرف دھکیل دیا اور بہانہ یہ رکھا کہ وہ پولیس کو باتوں میں لگاتے ہیں اس اثنا میں آتما سنگھ بھاگ کر مکھے اور اس کے لڑکے کو خبر کر دے گا۔ مکھے کے لڑکے کو علم تھا کہ اگر آتما سنگھ کو ٹھیک بات بتا دی تو وہ جانے سے انکار کر دے گا اور آج کیدار ناتھ کے ہاتھ سے اس کا بچنا ناممکن ہو جاتا۔ !! جب ایک دو منٹ کی تاخیر ہو گئی تو تھانیدار کیدار ناتھ کا ماتھا ٹھنکا۔

"دروازہ کھولو ورنہ ہم توڑ ڈالیں گے۔" اس نے چلا کر حکم دیا۔ اچانک پولیس کی نظر دروازے کے اوپر چھت کی جانب اٹھ گئیں جہاں مکھے سانسی کا چھوٹا لڑکا چھندا اسٹین گن تھامے کھڑا تھا۔

"تھانیدار! چپ چاپ یہاں سے چلے جاؤ۔ یہ سانسیوں کا گھر ہے کسی بنیئے کا نہیں یہاں کوئی آتما سنگھ موجود نہیں ہے۔ میں اپنے وکیل کے آنے سے پہلے دروازہ نہیں کھولوں گا۔"

"میرے پاس مکان کی تلاشی کا وارنٹ ہے۔ دروازہ کھول دو، ورنہ میں فائرنگ کا حکم دیتا ہوں۔" کیدار ناتھ نے غصے سے پھنکارتے ہوئے کہا

"وارنٹ بھی میرا وکیل چیک کرے گا۔ میں تو ان پڑھ ہوں۔"

ابھی اس کی بات نامکمل ہی تھی کہ کیدار ناتھ نے چلا کر پولیس کو فائرنگ کا حکم دیا۔

مکھے کا لڑکا "فتح بلا" کر مقابلے پر ڈٹ گیا وہ جلد جلد بدل بدل کر فائرنگ کر رہا تھا۔ گرمیت اس اثنا میں چھوی تھامے دروازے سے ہٹ کر ایک جگہ ٹولی ٹکھڑی تھی۔ اچانک ایک چیخ کی آواز نے جیسے اس کی جان نکال دی۔ سامنے سیڑھیوں میں خون سے لت پت چھندا لڑکھڑاتا ہوا نیچے آ رہا تھا۔

"بھاگ کر جا دیدی" — وہ بمشکل اتنا ہی کہہ پایا۔

اس اثنا میں پولیس دروازے سے اندر داخل ہو گئی تھی گرمیت نے انہیں روایتی سانسی جنگلیوں کی طرح للکارا اور چھوی لے کر آگے بڑھی اس کی چھوی اور حوالدار بگن ناتھ کی گولیاں اکٹھے ہی ایک دوسرے کے جسم میں داخل ہوئی تھیں۔ اس سے پہلے کہ وہ سنبھلتی۔ کیدار ناتھ نے ریوالور سے دو تین شعلے اگل کر اسے ٹھنڈا کر دیا۔ جیسا آتما سنگھ گاؤں سے سانسیوں کی مدد کے لیے پولیس کی طرف سے بڑی عجلت دکھائی تھی اور مکھے کو جو پکھری تاریخ بھگتنے گیا تھا۔ ایک سانسی لڑکے کے ذریعے پیغام بھجوا دیا تھا۔ جو پیغام سنتے ہی گھوڑی لے کر ہوا ہو گیا۔ باقی سانسی حسب توفیق سمجھا بجھا سنتے ہوئے مکھے کی حویلی کو پہنچے جہاں تھانیدار کیدار ناتھ خون کی ہولی کھیل چکا تھا۔ کیدار ناتھ نے بھی کچی گولیاں نہیں کھیلی تھیں ان نے روانگی کے وقت ہی ایس۔ پی دوبے سے کمک مانگ لی تھی۔ اب وہ حویلی کو گھیرے میں لیے پولیس کی مدد کا منتظر تھا جب اسے سانسیوں کی "وار" دکھانی پڑی۔

مکھے کا ایک بوڑھا مزارع جس نے چھپ کر یہ خون کی ہولی دیکھی تھی کسی طرح بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو گیا اس کا اور سانسیوں کا گھر راستے میں ہی تھا۔

"آتما سیاں تھانیدار نے گرمیت اور چھندے کو مار ڈالا"!!

سانسیوں کے لیے پولیس مقابلے میں مارے جانا یا پولیس کو مار دینا کوئی نئی بات نہیں تھی۔ ان کے لیے مر جانے کا مقام بنتا تھا جب کیدار ناتھ گرمیت کو تھانے لے جاتا یا ان کی بہو بیٹی کی عزت کو کوئی خطرہ ہوتا۔ لیکن اس طرح ہندو تھانیدار کے ہاتھوں ان کے در

بچے مارے جائیں۔ یہ ناقابل برداشت تھا۔

ہر دوسرا سانسی کھاسانسی تھا۔ اس وقت ان کے پاس بکھے کی ایک ہی امانت پگ تھی اور وہ تھی اُتما سنگھ۔ وہ اس کے سامنے کم از کم اس سلسلہ میں سر مندہ ہونے کے لیے تیار نہیں تھے دو گبھرو سانسیوں نے اُتما سنگھ کو قابو کر رکھا تھا اپنے بزرگوں کے حکم پر انہوں نے اس کے گرد کچھ ایسا مضبوط گھیرا ڈالا ہوا تھا کہ اس کا بھاگنا ناممکن بنا دیا تھا۔ خود آگے بڑھ کر سانسی پولیس سے ٹکرا گئے۔ گرمیت کی موت کی خبر نے سانسیوں کے تن بدن میں آگ لگا دی تھی ان کی عورتیں چھریاں سنبھالے پولیس کے پیچھے لپکیں اور اب کیدار ناتھ چاروں طرف سے گھیرے میں آچکا تھا۔ اس کی گارد کے سپاہی اس کے ساتھ ہی ڈسٹے ہوئے تھے جبکہ سانسی اپنا گھیرا اس کے گرد تنگ کرتے جا رہے تھے۔ حوالدار جگن ناتھ زخمی حالت میں بھاگتا ہوا ان کے قابو آگیا۔ اور چند منٹ کے اندر سانسی عورتوں نے اس کی تکا بوٹی کر ڈالی۔

جب تک بکھا اور اس کے بیٹے واپس آتے۔ ایس پی دو بے پولیس پارٹی کے ساتھ پہنچ چکا تھا پندرہ سانسی مرد اور عورتیں گرفتار تھیں۔ حوالدار جگن ناتھ مارا گیا تھا۔ ان کا تانا کرا گرفتار شدگان اور پولیس پارٹی کے ساتھ گاؤں سے باہر سڑک پر ہوا

بکھے نے بڑی دانشمندی سے کام لیتے ہوئے اپنے بیٹوں کو دوسرے راستے سے گاؤں بھیجوا دیا تھا۔ اسے اپنے خون کی گرمی کا احساس تھا اگر دربارا کیدار ناتھ سے ٹکرا جاتا کو کیدار ناتھ کو پورے بھارت کی پولیس بھی اس کے ہاتھوں سے نہ بچا سکتی۔ وہ دانشمند بدمعاش تھا۔ بہادری اور بیوقوفی کا فرق اسے اچھی طرح معلوم تھا۔ سانسیوں نے اُتما سنگھ کو غائب کر دیا تھا بکھے نے اس روز زندگی میں پہلی مرتبہ اپنے بیٹوں کے سامنے خود کو بے بس محسوس کیا وہ اسی وقت تھانے پر حملہ کرتے پر تلے ہوئے تھے لیکن بکھے اور دوسرے بزرگوں کے زور دینے پر رک گئے۔ سب سے پہلے تو بکھے نے راتوں رات اُتما سنگھ کو فضل خاں کے پاس پہنچا دیا۔ سانسیوں نے پولیس کو اپنی لاشیں دینے سے انکار کر دیا تھا۔ وہ ساتوں رات لاشیں

لے کر چندن گڑھ پہنچ چکے تھے اور چیف منسٹر ہاؤس کے سامنے جلوس کی شکل میں دھرنا دیے بیٹھے تھے۔ صورتحال اتنی سنگین ہو چکی تھی کہ آئی جی پنجاب کو سنٹرل گورنمنٹ کے براہ راست حکم پر تھانیدار کیدار ناتھ کو معطل کر کے لائن حاضر کرنا پڑا۔ ایس پی دوبے کا تبادلہ دوسرے ضلع میں ہو گیا اور تھانہ گرداسپور کا عملہ معطل ہو چکا تھا۔ دوسرے ہی روز بلکار سنگھ نے تھانے کا چارج سنبھال لیا۔

اس اثنا میں گریوال اور نتو لال بھی چپکے نہیں بیٹھے تھے۔ انہوں نے بھی دو پیسہ پانی کی طرح بہا دیا تھا لیکن مقابلہ پوری سانسی قوم سے تھا۔ پولیس اور عوام کی ہمدردیاں سانسیوں کو حاصل ہو چکی تھیں۔ گرمیت اور چھندے کے انتم سنسکار میں کئی اعلیٰ حکام نے شرکت کی تھی اور سانسیوں سے وعدہ کیا تھا کہ وہ انکوائری رپورٹ موصول ہوتے ہی ملزموں کے خلاف سخت کارروائی کریں گے۔

ابھی اس واردات کو ایک ہفتہ بھی نہیں گزرا تھا کہ ایک روز گریوال اور نتو لال پراسرار موت مارے گئے۔ ان دونوں کی لاشیں سرحد کے قریب ایک گاؤں کے باہر پائی گئیں۔ انہیں ایک زہریلے سانپ نے کاٹا تھا اور افیون کی کافی مقدار ان کے قریب موجود تھی۔ دونوں کے رشتہ دار چیختے چلاتے ہی رہ گئے کہ مارنے سے پہلے انہیں شام کے وقت اغوا کیا گیا تھا لیکن بلکار سنگھ نے ان کی ایک نہ سنی اور ایف آئی آر میں لکھ دیا کہ دونوں کو اپنا مجرم گروہوں سے تھا وہ سرحد پار مال وصول کر کے واپس آ رہے تھے راستے میں ایک زہریلے سانپ نے انہیں ڈس لیا اور ان کی موت واقع ہو گئی۔ پوسٹ مارٹم رپورٹ نے اس کی بات کی تصدیق کر دی اور مقدمہ داخل دفتر ہو گیا۔ اس روز سانسیوں نے ارد گرد کے دیہاتوں میں مفت شراب تقسیم کی تھی۔

پھر ایک روز وہ آیا کہ سینکڑوں لوگوں کی موجودگی میں دربارا سنگھ، اُتما سنگھ اور فضل خان نے بھری کچہری میں تھانیدار کیدار ناتھ کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ پولیس نے جیپ پر ان کی

گھوڑیوں کا پیچھا کیا لیکن وہ کچے پکے راستوں سے بچا نے کس طرف نکل گئے صبح ہی کچہری میں تھا نیدار کا قتل کوئی معمولی واقعہ نہیں تھا ملزموں نے سینکڑوں لوگوں کے سامنے للکار کر کہا کہ انہوں نے اپنی بہن اور بھائی کا بدلہ لے لیا ہے اب ڈرامے کا ایک ہی کردار باقی تھا ایس پی ڈوبے جس نے اپنی حفاظت کے لیے سپیشل گارد مقرر کروا رکھی تھی۔

ایک سال کے عرصے میں ہی جالندھر کے در و دیوار آتما سنگھ کے نام سے گونج اٹھے اتنا میں وہ کئی مرتبہ پولیس کے ساتھ دو بدو مقابلہ کر کے فرار ہو چکا تھا۔ پولیس نے اس دفعہ کھیل کی کوئی جان نہیں چلنے دی تھی اور موقع کے ایسے گواہ تیار کیے تھے کہ آتما سنگھ اور دربارے کا بچ نکلنا ناممکن ہو گیا تھا۔ ایس پی ڈوبے نے کیس بیرجی مان جان سے دلچسپی لی اور مجرکی اطلاع پر بارڈر سکیورٹی فورس کی مدد سے ایک سرحدی گاؤں پر چھاپہ مارا جہاں فضل خان، دربارا سنگھ اور آتما سنگھ کی پکی مخبری ہو لی تھی۔ چھاپہ اتنی منظم اور تیزی سے مارا گیا کہ وہ بمشکل جان بچا سکے فضل خان اور دربارا تو اکٹھے رہے اور فائرنگ کرتے سرحد پار کر گئے لیکن آتما سنگھ ان سے الگ ہو گیا اور بھاگتے ہوئے اس کی ٹانگ میں گولی لگی۔ وہ زخمی ہو کر گر پڑا اور قابو آ گیا۔ پولیس نے ان کی گھوڑیاں بھی قبضہ کر لی تھیں۔

قسمت اچھی تھی جو وہ بچ گیا اور ہسپتال تک پہنچ گیا جہاں آتما سنگھ کی ٹانگ کے آپریشن کے بعد گولی نکال دی گئی۔ دو سال تک مقدمہ چلتا رہا۔ پولیس نے اس پر تیرہ قتل ڈال دیے تھے مکھے نے اپنا روپیہ پانی کی طرح بہایا اپنا اثر و رسوخ ہر جگہ استعمال کیا لیکن اس مرتبہ پولیس جیت گئی۔ آتما سنگھ کو سزائے موت کا حکم سنا دیا گیا۔ اس اثنا میں فضل خان اور دربارا اس سے بھیس بدل کر پولیس کی آنکھوں میں دھول جھونک کر ملاقات کرتے رہے۔

آتما سنگھ ابھی مرنا نہیں چاہتا تھا۔ ڈرامے کا ایک کردار ابھی زندہ تھی اور بدلہ لیے بغیر مرنا اسے گوارا نہ تھا۔ دربارا اور فضل خان ایس پی کو کچانے کب کی چھٹی کروا دیتے لیکن وہ آتما سنگھ کو قسم دے چکے تھے کہ وہ ڈوبے کو اس کے لیے چھوڑے رکھیں گے — اور آج — !!

وہ گھڑی آ رہی تھی جس کا انتظار پچھلے ڈھائی سال سے آتما سنگھ کو تھا۔ اگلے روز اس کی ملاقات آئی۔ پھانسی کے مجرم کی ملاقات حوالات کوٹھڑی میں کروائی جاتی ہے لیکن اس کے پچھلے ڈھائی سال کی قید نے جیل سپرنٹنڈنٹ کو اس کی شرافت کا یقین دلا دیا تھا اور شہوت تو پھانسی کے سب کا دینا آ رہا تھا ابھی پچھلے ہی دنوں اس نے ایک "سیجر ہوئی" نہیں دیکھی کے گھر پیدا ہوئی تھی۔ ملاقات ڈیوڑھی میں ہوئی اور دربارا سنگھ کے دھوئیں کے بم اور فضل خان کی پھلجھڑی والی مرچوں نے انہیں اندھا کر دیا۔ باہر کار تیار کھڑی تھی جس نے گھوڑیوں تک کا فاصلہ چند ہی منٹ میں مضروبے کے عین مطابق طے کر لیا تھا جب تک پولیس ان کے تعاقب میں روانہ ہوتی وہ محفوظ ہو چکے تھے۔

آج فضل خان کی ان سے الوداعی ملاقات تھی انہوں نے اپنے جگری یار کو آج خود سے الگ کرنا تھا۔ فضل خان۔ آج بچنے والی کوئی بات نہیں ہم دیندار ہو کر مرنا نہیں چاہتے تیرا دینا داگھور کے ہاں کہا سنا معاف آخری وقت تیرا دل توڑ رہے ہیں۔ جیونڈے بچے ترمیلے ہوں گے سجناں! رب راکھا۔ آتما سنگھ نے بمشکل اتنا ہی کہا۔

تینوں کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے پھر تینوں کبھی نہ ملنے کے لیے جدا ہو گئے فضل خاں اپاہج رہ گیا اس کے یار اپنا حساب بے باک کرنے بھارت چلے آئے۔ جگلے سے ایک روز قبل رات کے وقت انہوں نے باری باری اپنے سانسی بزرگوں سے معافی مانگی اجازت لی سب کی سانسی عورتوں نے اپنی روایت کے مطابق ان کی "آرتی" اتاری۔ دیوی کی نذر محبت کی اور جیسے انہیں الوداع کہہ دیا۔

ایس پی ڈوبے اس روز اپنے دفتر سے باہر نکل کر جیپ میں سوار ہو کر کہیں جانے والا تھا۔ آتما سنگھ کو فرار ہوئے ہفتہ عشرہ ہو رہا تھا اور ڈوبے کا خون روز بروز

خشک ہوتا جا رہا تھا۔ جیسے ہی وہ جیپ کے نزدیک آیا اچانک ایک بار کے پیچھے سے رام سنگھ نے اسے للکارا۔ اس سے پہلے کہ دوسرے اپنا پستول نکالتے۔ آتما سنگھ نے للکارا مارا اور کرپان سے اس پر وار کیا۔ دربارے اور آتما سنگھ نے ایس پی کے جسم کو لمحوں میں ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا۔ پولیس نے بھی اس مرتبہ انہیں گرفتار کرنے کا تکلف نہیں کیا اور دونوں کو بھون کر رکھ دیا۔

گورداسپور کے سفاک ہسپتال کا منظر اس روز دیدنی تھا۔ لاشوں کا پوسٹ مارٹم ہو چکا تھا۔ پنجاب کے قریباً تمام اضلاع سے سانسی مرد عورتیں جمع تھیں۔ رکھا سنگھ کو انہوں نے پھولوں سے لاد رکھا تھا۔ لاشیں جیسے ہی باہر آئیں ڈھول کی آواز پر سانسیوں نے رقص شروع کر دیا۔ جیکارے مارتے پیدل ہی گاؤں کی طرف روانہ ہو گئے سارا گورداسپور گھبروں کو دیکھنے کے لیے امڈ آیا تھا۔

پولیس نے سانسیوں کے جلوس کو گھیرے میں لے رکھا تھا۔ اس کے باوجود آتما سنگھ اور دربارا سنگھ کی ارتھیاں پھولوں سے لد گئیں ان کے انتم سنسکار کے وقت سانسی نعرے لگا رہے تھے۔

"برا ہنو! ہم جیت گئے"!!

اُس نے کہا تھا!

ٹرین گجرات پہنچی تو حوالدار نور محمد نے سکھ کا سانس لیا۔ وہ پچھلے تین چار روز سے مسلسل سفر کر رہے تھے۔ گلگت کے ایک دور دراز علاقے سے ان کی کمپنی کو اچانک ایک سرحدی علاقے میں پہنچنے کا حکم ملا تھا۔ رات کے گیارہ بج رہے تھے اور صبح انہیں وہ سپیشل ٹرین پکڑنا تھی جسے دس بجے آنا تھا۔ کمپنی کے باقی نوجوان فوجی دفاتر خانے میں جمگھٹے سو بیدار جہاں داد اور اس کا بیٹا نائیک زمان حوالدار نور محمد سے باتیں کرتے رہے۔

"نورے آیا! میرا گھر سٹیشن کے قریب ہی ہے۔ رات وہیں گزارتے ہیں۔ صبح ہمارے ساتھ ہی واپس جانا۔" صوبیدار نے تجویز پیش کی اور نورے نے نہ چاہتے ہوئے بھی ہامی بھر لی۔ اس کا انگ انگ ٹوٹ رہا تھا۔ ٹرین پر اتنا لمبا اور مسلسل سفر اس نے بخار کی حالت میں کبھی بھی کرنے کا تصور نہیں کیا تھا۔ تینوں سٹیشن سے پیدل ہی روانہ ہوئے تھے۔

صوبیدار جہاں داد گھر آگیا۔ وہ اور اس کا بیٹا تو دوسرے کمرے میں چلے گئے۔ انہوں نے حوالدار نور محمد کو اسی کمرے میں لٹا دیا۔ بخار نے اپنا اثر دکھانا شروع کر دیا تھا۔ نور محمد چارپائی پر گرتے ہی بے سدھ ہو کر لیٹ گیا۔ اسے صرف اتنا یاد رہا کہ نائیک زمان نے اسے دودھ کے ساتھ اسپرین کھانے کو دی تھی۔

صبح اس کی آنکھ کھلی تو سورج چڑھ آیا تھا۔ غالباً صوبیدار یا اس کے بیٹے نے اس کی حالت کے پیش نظر اسے جگانا مناسب نہیں سمجھا تھا۔ وہ دونوں قریبی مسجد میں نماز ادا کرنے چلے گئے تھے۔ نائیک

زمان کی گولی نے بھی جادو کا اثر دکھایا تھا خوب پسینہ آنے سے اس کے جسم کے سارے مسام کھل گئے اور صبح تک اس کا بخار غائب ہو گیا۔ نورے نے چارپائی سے اٹھ کر ایک انگڑائی لی۔ نماز کا وقت تو گزر چکا تھا پھر بھی وہ پانی کی ضرورت محسوس کر رہا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ صوبیدار کے آنے سے پہلے پہلے قریبی نخلستان سے نہا کر واپس آجائے اور ان کے ساتھ مل کر ناشتہ کر کے واپس سٹیشن چلا جائے۔

اس نے اپنے سرہانے رکھا تولیہ اٹھایا اور دروازے پہ پڑی چق اٹھا کر جونہی باہر نکلا اسے ایسا محسوس ہوا جیسے زمین نے اس کے پاؤں پکڑ لئے ہوں۔ ایک عورت سامنے سے دودھ کی بالٹی پکڑے آ رہی تھی۔ دونوں ایک دوسرے کو دیکھ کر ٹھٹک گئے ایسا دکھائی دے رہا تھا جیسے دونوں کو سکتہ ہو گیا ہو۔

"نورے" ــــ خاتون نے بمشکل کہا۔

"عائشہ" ــــ نورا بھی ایک ہی لفظ کہہ پایا تھا اس کا ذہن کئی سال پیچھے چلا گیا۔

جالندھر کے ایک محلے کی گلی میں قطار در قطار بنے مکانوں میں سے ایک مکان کا دروازہ کھلا اور ایک بارہ تیرہ سال کی لڑکی ہاتھ میں پیتل کا کٹورا پکڑے باہر نکلی۔ وہ سرمستی کے عالم میں بھاگتی ہوئی جا رہی تھی۔ اگلے گلی کی ایک نکڑ والے مکان سے ایک پندرہ سالہ لڑکا باہر نکلا۔ جیسے وہ پہلے ہی سے اس کا منتظر ہو۔ نوجوان پر نظر پڑتے ہی لڑکی کی رفتار میں کچھ کمی آگئی۔ اس نے اپنا دوپٹہ پھر سے سر پہ جمایا۔ اب وہ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی اس کے قریب آگئی تھی۔ پاس سے گزرتے ہوئے اس نے کنکھیوں سے لڑکے کو دیکھا عین اسی لمحے لڑکا بھی اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ دونوں کی نظریں ٹکرائیں۔ ایک سرخی سی دونوں کے چہروں پر دوڑ گئی تب لڑکی نے اپنی رفتار ایک دم بڑھا دی۔ لڑکے کی نظریں گلی کے آخری موڑ تک اس کا تعاقب کرتی رہیں۔ روزانہ کے معمول کے مطابق اس نے اس کی واپسی کا انتظار بھی وہیں کھڑے کھڑے کیا۔ واپسی پہ بھی دونوں نے وہی عمل دہرایا ۔۔ دونوں کچھلے ایک ڈیڑھ ماہ سے اسی طرح ایک دوسرے کو ٹکٹکی لگا کر دیکھا کرتے تھے۔

اگلے روز ایک عجیب بات ہوئی!

آج لڑکے نے اس کا تعاقب بھی کرنا شروع کر دیا۔ وہ اس طرح چھپ چھپ کر اس کے پیچھے جا رہا تھا کہ لڑکی کو اپنے تعاقب کا احساس بھی نہ ہو سکا۔ وہ حسب معمول محلے کے باہر سڑک کے کنارے

بنے پہلوان کی دوکان سے دہی خرید رہی تھی۔ لڑکی نے جیسے ہی مڑ کر اس کی طرف دیکھا اچانک گھبرا سی گئی۔ شرم اور خوشی کے ملے جلے جذبات کے ساتھ اس نے تیزی سے سڑک پار کرنا چاہی شاید اس نے جیپ نظر انداز کر دی تھی جو اس کے بالکل قریب پہنچ چکی تھی۔ جیپ کا ڈرائیور اس اچانک صورت حال سے گھبرا گیا۔ اس نے بریک لگانا چاہی لیکن پاؤں شاید ٹھیک سے نہ پڑا تھا۔ اس سے پہلے کہ جیپ پوری طرح رک جاتی اس کا فولادی بمپر لڑکی کو زور سے ٹکرا گیا۔ لڑکی کے ہاتھ سے بجلی کی سی پھرتی کے ساتھ متحرک کے عین درمیان پہنچ کر لڑکی کو زور سے واپس دھکا دیا تھا۔ لڑکی تو بچ گئی لیکن وہ خود جیپ کے ایک مڈگارڈ سے ٹکرا کر گر پڑا۔ وہاں موجود تمام لوگ حیرت زدہ سے دکھائی دے رہے تھے ان کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہیں تھی کہ لڑکی اس طرح بچا لی جائے گی۔ لڑکی کے ہاتھ سے دہی کا کٹورا پہلے جا گرا تھا۔ وہ خود زمین پہ گر پڑی تھی۔ چند ہی لمحوں میں ساری بات اس کی سمجھ میں آگئی اس نے پھٹی پھٹی نظروں سے لڑکے کے زخمی سر کی طرف دیکھا جس سے خون بہہ رہا تھا۔ اس کا دل جیسے پھٹ گیا۔ اب لوگوں کا ہجوم ان دونوں کے گرد اکٹھا ہو گیا تھا۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد وہ لوگوں کے ساتھ اسے زخمی حالت میں لے کر واپس آ رہی تھی۔

اگلے تین چار روز تک وہ اس دروازے کے سامنے رک رک کر بازار جاتی رہی۔ وہ ہر مرتبہ وہاں سے گزرتے ہوئے خالی خالی نظروں کے ساتھ دروازے کی طرف دیکھتی۔ لیکن ہر مرتبہ وسوسوں کے رہ جاتی۔

پانچویں روز اچانک وہ اسے نظر آ گیا۔ اپنے سر پہ پٹی باندھے دروازے کے باہر کھڑا تھا۔ آج تمام احتیاطیں بالائے طاق رکھ کر وہ اس کے قریب پہنچ کر ٹھہر گئی۔ کسی ان دیکھی طاقت نے اسے وہاں کھڑا کر دیا تھا۔

"تو پاگل ہے کیا۔ اس روز تو نے مجھے بچانے کے لئے"..... اس کا فقرہ نامکمل ہی رہ گیا۔ اسے بولنے میں بڑی دقت محسوس ہو رہی تھی۔

"تیرا نام کیا ہے"؟ لڑکے نے اچانک پوچھا۔

"عائشہ اور تیرا"؟ اس نے جواب اور سوال اکٹھا ہی کیا۔

SCAN PDF WAQAR AZEEM

"نور محمد ۔ نورا" اس نے ہی اتنا ہی کہا تھا کہ قریب ہی کسی کے قدموں کی چاپ سنائی دی لڑکی گھبرا کر تیزی سے آگے بڑھ گئی۔

پھر تو جیسے ان کا معمول ہو گیا وہ اسی جگہ رک کر ایک آدھ مکمل سی بات کر لیا کرتے تھے۔ ایک روز لڑکی وہاں سے گزری تو اس کا چہرہ اترا اترا دکھائی دے رہا تھا۔

"میں کل سے نہیں آؤں گی" ۔ اس نے نظریں جھکا کر کہا۔

"کیوں؟" نورے کو ایسا لگا جیسے کسی نے اسے پہاڑ سے دھکا دے دیا ہو۔

"آج میری کٹھائی ہو جائے گی۔ اماں کہتی ہے اب میرے سسرال والے برا نہیں گے"۔ اس نے زخمی نظروں کو ایک لمحے کے لئے اٹھا کر پھر جھکا لیا۔ لیکن اتنے عرصے میں جو قیامت نورے کے دل پہ ٹوٹی تھی اسے بھی اس نے بخوبی محسوس کر لیا تھا۔

"کیا؟" اس کے گلے سے بڑی ہی سی آواز نکلی۔ اچانک کسی نے نورے کو اندر سے آواز دی اور وہ گھبرا کر آگے بڑھ گئی۔ گلی کی نکڑ پر کھڑے ہو کر وہ دو تین منٹ تک دروازے کی طرف ٹکٹکی باندھے دیکھتی رہی۔ اس اثنا میں اس نے دو تین بار اپنی چنری سے آنکھوں کو صاف بھی کیا۔ وہ باہر نہ نکلا تو عائشہ بوجھل بوجھل قدموں سے آگے بڑھ گئی۔ واپسی پر بھی وہ موجود نہیں تھا۔ وہ جیسے کٹ کر رہ گئی۔

اس کی کٹھائی کے مشکل ایک ڈیڑھ ماہ کے بعد ہی بخوار ہو گیا تھا۔ اس اثنا میں اس کی ماں نے اسے ایک مرتبہ بھی تو باہر نہیں جانے دیا تھا۔ صرف ایک دن اس نے بہلنے سے اپنی سہیلی سے پوچھا تو اس نے بتایا کہ نورا ہر روز دروازے پہ کھڑا کسی کا انتظار کیا کرتا ہے۔

"نورے تو ٹھیک ہے نا؟" خاتون نے اس کی طرف دیکھے بغیر پوچھا۔

"ہاں تم سناؤ خوش تو ہی ہو؟" نورے کو جو سوال ہو رہا تھا جیسے بات کی ساری تلخی نے پلٹ کر اس پہ حملہ کر دیا ہو۔

"تو نے شادی کر لی کتنے بچے ہیں تیرے" خاتون نے اس سے مشکل آنکھیں ملائیں۔

"میں نے شادی نہیں کی" ۔ نورے نے مختصر سا جواب دیا۔ اس کی جسمانی طاقت اب جواب دے رہی تھی۔

"کیوں؟" اس کی زخمی نظریں دیکھ کر نورے کو کئی سال پہلے والی عائشہ یاد آ گئی جس نے ایک روز نظروں کے ساتھ اسے اپنی کٹھائی کا المیہ بتایا تھا۔

اب خاتون کا بھی دل بیٹھنے لگا تھا۔ اس نے دودھ کی بالٹی زمین پر رکھ کر قریبی دیوار کا سہارا لیا۔ نورے نے چاہا کہ آگے بڑھ جائے اسے خود سے زیادہ اس پر ترس آ رہا تھا۔ اچانک ایک آواز نے اسے روک لیا۔

"نورے ایک بات سنتے جاؤ" خاتون کی سانس دھونکنی کی طرح چل رہی تھی۔

"کیا؟" ۔ نورے کو ڈر تھا اگر اسے دوبارہ کسی بات کا جواب دینا پڑا تو شاید وہ بول بھی نہ پائے گا۔

"ایک روز تم نے میری جان بچائی تھی نورے! میری زندگی بھر کا ثمر میری آس مراد میرا ایک ہی بیٹا ہے۔ زمان اس کا خیال رکھنا" ۔ آنسو اس کی آنکھوں سے گر کر اس کے گالوں پہ بہنے لگے تھے۔

"اچھا" کہہ کر حوالدار نور محمد تیزی کے ساتھ آگے بڑھ گیا۔ اسے ڈر تھا کہ وہ گر نہ پڑے۔ مکان کے دروازے سے باہر نکلتے ہوئے اس نے دہلیز میں کھڑے ہو کر ایک نظر مڑ کر دیکھا۔ خاتون اپنے دوپٹے سے آنسو پونچھ رہی تھی۔ ایک مرتبہ اسی طرح اس نے جالندھر کے ایک محلے کی ایک گلی کی نکڑ پر اپنی چنری سے اپنے آنسو پونچھے تھے۔

صوبیدار اپنے بیٹے کے ساتھ واپس آیا تو وہ واپس سٹیشن جا چکا تھا وہ حیران رہ گیا۔

گولہ باری قیامت ڈھا رہی تھی۔ وہ ایک مورچے سے نائیک زمان کے ساتھ دشمن پر فائرنگ کر رہا تھا۔ اچانک اس نے دیکھا کہ ان کے دائیں ہاتھ ایک پہاڑی سے تین گورکھے ان کی طرف بڑھنے ہی والے تھے کہ وہ مشین گن کا منہ ان کی طرف پھیر سکے۔ نائیک زمان نے رائفل تھامی اور بجلی کے کوندے کی طرح باہر کو لپکا۔ اس نے پہلے ہی بلے میں ایک گورکھے کو جہنم واصل کر دیا۔ دوسرے گورکھے پر وہ سامنے سے حملہ آور ہو رہا تھا تو تیسرے نے چاہا کہ پیچھے سے اسے سنگین گھونپ دے۔ اس اثنا میں حوالدار نور محمد عقاب کی طرح اس پہ جھپٹا۔ گورکھے کی رائفل کی سنگین اس کی پسلیوں میں لگی تھی۔ لیکن اس

WAQAR SCAN PDF

نے اپنی تمام تر ٹریننگ بروئے کار لاکر گورکھے سے رائفل چھین کر سنگین اس کے سینے میں اتار دی۔ اس اثنا میں زمان دوسرے سے فارغ ہو چکا تھا۔ نور محمد نے اس کی طرف دیکھا تو جیسے اس کا دل اچھل کر حلق میں آگیا۔ اس کے سینے سے خون بہہ رہا تھا۔

"زخم زیادہ تو نہیں ۔ ٹھیک ہونا"

"بالکل ٹھیک ہوں حوالدار صاحب معمولی زخم ہے"

وہ دونوں اپنے مورچے میں پہنچ چکے تھے۔ نور محمد نے اس کی اور اپنی فیلڈ پٹی زمان کے پیٹ پر کس کر باندھ دی تھی۔

خود اس نے مورچے میں پڑا اپنا بڑا سا فوجی کوٹ پہن لیا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ اس کا زخم چھپا رہے۔

لڑائی رک گئی۔ مورچہ فتح ہو چکا تھا۔ وہ ایک خطرناک پہاڑی علاقے میں لڑ رہے تھے۔ بڑی مشکل سے ایک ایمبولینس وہاں تک پہنچی تھی اور صرف شدید زخمی ہی پیچھے لیجائے جا رہے تھے۔ باقیوں کا محاذ پر ہی علاج کیا جا رہا تھا۔ ایک آدمی کی گنجائش باقی رہ گئی تھی۔

"تم بیٹھو حوالدار" صوبیدار جہانداد نے اس کے چہرے کی زیادہ نزاکت دیکھ کر اس کی حالت کا اندازہ لگا لیا تھا۔ خون بے تحاشہ بہہ چکا تھا۔

"صوبیدار صاحب میں بالکل ٹھیک ہوں معمولی زخم ہے۔ آپ زمان کو بھیجیں۔ اس کے پیٹ میں بڑا گہرا زخم لگا ہے" ۔ اسے تو نائیک زمان کی فکر کھائے جا رہی تھی "اگر اسے کچھ ہو گیا"۔ اس سے آگے وہ نہ سوچ سکا پھر اس کی ضد کے باعث نظر زمان کو ایمبولینس میں بٹھا کر بھیج دیا گیا۔

نور محمد کو معمولی زخم نہیں آیا تھا۔ زہریلی سنگین نے اس کے سارے جسم میں آگ لگا دی تھی۔ جیسے ہی ایمبولینس آگے بڑھی وہ لڑکھڑا کر گر پڑا۔

"کیا ہوا کیا ہوا؟" ۔ صوبیدار نے گھبرا کر اس کا بھاری کوٹ اوپر اٹھا کر دیکھا تو سہم گیا بہت گہرا زخم تھا۔ اسے یہ بات صاف سمجھ آگئی تھی کہ حوالدار نور محمد نے یہ سب کچھ اس کے بیٹے کی زندگی بچانے کے لئے کیا ہے۔

"نور محمد ۔ تم سے کس نے کہا تھا کہ تم میرے بیٹے کو بچانے کے لئے اپنی جان دے ڈالو بتاؤ نور مجھے بتاؤ ۔ صوبیدار نے اسے جھنجھوڑ ہی ڈالا تھا۔

حوالدار نور محمد کے منہ سے بمشکل نکلا۔

"اس نے کہا تھا"

ایمبولینس پہاڑی کے گرد اگرد بنی ہوئی سڑک کا چکر کاٹتی اس کی نظروں سے دور ہوتی جا رہی تھی۔ اس کی گردن اچانک ایک طرف ڈھلک گئی۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے وہ اسی لمحے کا انتظار کر رہا تھا۔

(مرکزی خیال ماخوذ)

WWW.PAKSOCIETY.COM

اوما

یہ کانپور ہے بھارت کا ایک شہر!

جس میں ایک چھوٹا سا قصبہ ہے موضع ناگرمی، جو برہمنوں کا گاؤں ہے جس کے مالک برہمن ہیں لیکن جہاں اچھوت، مسلمان اور عیسائی بھی رہتے ہیں۔ رہتے کو تو یہاں اور قومیں بھی بستی ہیں لیکن اس سے فرق ہی کیا پڑتا ہے۔ یہاں کے مالک تو بہرحال اونچی جاتی کے برہمن ہی کہلائیں گے۔

ناگرمی کے ایک سمت پھولوں کے باغات ہیں اور ان سے ذرا ہٹ کر برہمنوں کی خوبصورت اور پرشکوہ حویلیاں جو چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں میں گھری ہوئی ہیں یہ حویلیاں بظاہر بہت خوبصورت اور پرسکون ہیں۔ صاف ستھرے مویشی خانوں سے تازہ بھوسی کی مہک آ رہی ہے۔ دودھیلی گائیں زبانیں باہر نکال کر اپنے بچھڑوں کے ماتھے چاٹ رہی ہیں۔ آنگن میں بچوں کا شور ہے۔ برہمن خاندان کی عورتوں کے ہنسنے کی آوازیں خوشیوں کے ساتھ ساتھ لگائے گئے گلاب کے پھولوں کے باغات میں بھی سنائی دے رہی ہیں۔

یاقوت کی طرح سرخ اور شفق رنگ گلاب ہے۔

چاندنی رات کی برف ایسی دودھیا چاندنی کی طرح سفید اور معصوم گلاب۔ پیلے پیلے گلاب جو اپنے قلب میں بچھڑ کی نرمی اور بشن لئے ہوئے ہیں جن کی خوشبو اتنی تیز ہے کہ دور دور تک پھیلے ہوئے پھلواری پر چائے کے باغات میں پھیلتی چلی گئی ہے۔ یہ خوشبو محبت کی طرح خاموش اور راز کی طرح پراسرار مدھم مدھم اور بہت ہی گہری ہے۔ ایسے سینکڑوں ہی گلاب ان باغات میں کھلے

Scanned with CamScanner

ہوئے ہیں۔ برہمن زادیوں کے سیاہ بالوں کی زینت بنیں گے ۔ ان کے جوڑوں میں سجیں گے۔

برہمنوں کے محلات سے ذرا ہٹ کر گاؤں کے نچلی طرف بھارت ندی بہتی ہے۔ خاموش سی ندی چپ چاپ ندی ۔ جس کے سینے میں برہمیت کی جانے کتنی داستانیں صدیوں سے چھپی ہوئی ہیں۔ اس کے کنارے کنارے یہاں بسنے والی مخلوق کی جھونپڑیوں کا ایک سلسلہ پھیلتا چلا گیا ہے۔ یہاں رہنے والے ہر شخص کے چہرے پہ ایک نئی کہانی لکھی ہے۔

ناشاد آرزوؤں اور نارسیدہ امنگوں کی کہانی ۔ اترسی ہوئی نگاہوں ۔ چھلکے ہوئے جذبوں کی کہانی ۔!

صدیوں کے فاقوں کی بھوکی اور بوسیدہ کہانی ۔ ! جس میں محبت مرگئی ۔ عصمت لٹ گئی اور معصومیت بھکاری بن گئی۔ یہ وہی کہانی ہے جو انڈیا بھر میں پھیلی ہوئی ہے ۔ جس کا دامن اتنا وسیع ہے کہ اگر ایک طرف اس نے کشمیر کی پہاڑیوں کو ڈھانپ رکھا ہے تو دوسری طرف راس کماری کے ساحلوں تک پھیلتی چلی گئی ہے۔

یہاں کی کہانیاں سب کہانیوں پہ سبقت لے گئی ہیں۔ یہ وہ دھرتی ہے جو اپنی سندرتا اور حسن کے لئے دنیا بھر میں ایک عظیم مقام رکھتی ہے۔ جنوبی ہند کی اس دلفریب وادی کا یہ خطہ کتنا حسین ہے۔

چھوٹے چھوٹے پہاڑ کہیں کہیں گول گول چوٹیوں کے پھیلتے پھیلے ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے پہاڑ نے دھوپ سے بچنے کے لئے چھاتہ اوڑھ لیا ہو۔ دور میلوں تک پھیلے ہوئے جنگل، دھان کے کھیت، کہیں پر دھان کی پنیری تو کہیں پہ کٹائی ۔ ایک جگہ دھان سبز ہے تو دوسری جگہ پیلا ہو کر کٹنے کو تیار ۔ پھر پہاڑی علاقہ اور ڈھلانیں، بھیگڑ کی جھاڑیاں۔ دھوپ میں سنسناتی ہوئی گزر جاتی ہیں۔ بھیگڑ اور کھجور کے درختوں میں گھومتی ہوئی پتلی نرم رو ندیاں اور لانبی دریائی گھاس میں چرتے ہوئے بیل بکریوں کے ریوڑ سنگڑوں کے باغ، جنگلی مینڈھروں پہ ناگ پھنی کی جھاڑیاں ۔ کہیں کہیں کوئی پرانا مندر اور نیلی آنکھوں والے تالاب، مندر جو فن تعمیر اور سنگتراشی کا شاہکار

ہیں۔ یہ مندر ہیں جہاں سے بھرت ناٹیم اور کتھا کلی نے جنم لیا ۔ جو صدیوں پہ محیط ہندوستان کی تہذیب کا مرکز و محور رہے ہیں۔

وہ تہذیب جو انہی جنگلوں میں پل بڑھ کر جوان ہوئی اور انہی میں کہیں کھو کر رہ گئی۔

دھان کے کھیتوں ہی کے ایک کونے پہ چند ٹوٹے پھوٹے جھونپڑے نظر آ رہے ہیں۔ جہاں اب برہمنوں کی رعیت آباد ہے۔ جسے وہ "اچھوت" کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ ان لوگوں کی زندگی کا مقصد برہمنوں کی خدمت کرنا۔ ان کے تعیش کے لئے خوبصورت لڑکیوں کو جنم دینا اور بالآخر کھاتے کھاتے مر جانا ہے۔ دھان کے کھیتوں میں بنے ان جھونپڑوں میں سے ایک میں برہمنوں کا پشت در پشت خادم کنیٹورام بھی رہتا ہے جو ان کا مالی ہے جس نے گلاب کے پھول لگائے ہیں اور جس نے اپنے علاوہ اپنی بیٹی کو پھولوں سے محبت کرنا سکھایا ہے۔ اس کے جھونپڑے کے چاروں طرف جنگلی گلاب کی بیل نے ایک جال سا تان رکھا ہے اور یہی چیز اس کے جھونپڑے کو دوسرے جھونپڑوں سے ممتاز کرتی ہے۔

جتنا پرانا یہ قصبہ ہے اتنی ہی پرانی اس برہمن خاندان کی تہذیب بھی ہے۔ یہ برہمنوں کا وہ روایتی گھرانہ ہے کہ جس کے مکینوں کے کانوں میں اگر صبح صبح کسی اچھوت کی آواز پڑ جاتی تو وہ اس کے کانوں میں پگھلتا ہوا سیسہ ڈال دیا کرتے تھے۔ کسی برہمن کنیا کو دیکھ لینے پہ ان کی آنکھیں نکال دی جاتی تھیں! ۔۔۔ اچھوت جنہیں اپنے آقاؤں کے مندروں میں پوجا کرنے کی اجازت نہیں تھی ۔۔۔!!

آج بھی اس خاندان کی یہی روایت تھی۔ فرق صرف اتنا تھا کہ اب گورنمنٹ نے اچھوتوں کو ہریجن بنا کر انہیں بھی قانونی طور پہ عام انسان کا درجہ عطا کر دیا تھا ۔۔۔!!

اس سے بھی کوئی فرق نہیں پڑتا تھا کیونکہ قانون کو یہاں تک پہنچنے کی اول تو اجازت ہی نہیں تھی اس لئے کہ تمام اعلیٰ حکومتی عہدوں پہ کم از کم اپنے صوبے کی حد تک یہی خاندان قابض تھا اور اگر قانون یہاں تک پہنچ بھی جاتا تو ان محکموں میں سے کسی کو فریاد سننے کی جرأت کبھی

WAQAR Scan PDF

نہ ہوتی۔ کیونکہ اس ہجرت کی قیمت جو انہیں ادا کرنی پڑتی تھی وہ ان کے تصور سے بھی زیادہ تھی۔!

اتنی بھیانک سزا ملتی تھی کہ اس کے تصور ہی سے رونگٹے کھڑے ہو جاتے تھے۔

کیشو رام کے غلیظ بستر کے سامنے دھان کے کھیتوں کے دوسری طرف بھی پکے مکانوں کا ایک سلسلہ پھیلتا چلا گیا تھا۔ ان مکانوں میں سے ایک میں ماسٹر نور محمد بھی رہتے تھے۔ سفید داڑھی اور سرخ چہرے والے ماسٹر نور محمد! ہر وقت ہر ہندو کی آنکھ میں کھٹکتے رہتے تھے۔ ان کی دشمنی بھی بہت پرانی تھی۔

دراصل برہمنوں کی شروع ہی سے کوشش رہی ہے کہ تعلیم کا اجالا اس قصبے میں نہ پھیلنے پائے۔ کیونکہ اس طرح ان کی رعیت اکھڑ، سیانی اور گھاگ بنتے اور ہمیشہ سے نظر آجائیں گے جنہوں نے برہمنوں کے گورکھ دھندوں میں پھنس کر رہنا ہے۔ ماسٹر صاحب ناگری قصبے کے دوسری طرف واقع ایک گاؤں میں بنے سرکاری سکول میں ماسٹر ہیں۔ وہ روزانہ پانچ میل سائیکل چلا کر جاتے ہیں اور پھر واپس آتے ہیں۔ ماسٹر صاحب نے ناگری میں سکول کھولنے کے لیے حکومت کی درخواست دے رکھی ہیں لیکن جب بھی کوئی معائنہ ٹیم محکمہ تعلیم کی طرف سے یہاں آنے کو تیار ہوتی ہے اسے راستے ہی میں روک کر خراب چیاق کر دیا جاتا ہے۔

برہمنوں کی ایک قدیم شکانگاہ ناگری کے ساتھ ساتھ پھیلتی چلی گئی ہے۔ ان جنگلات میں بھی وہی مالک ہیں۔ سنا ہے یہاں کبھی شیر چیتے وغیرہ بھی پائے جاتے تھے لیکن اب نہیں۔ انہوں نے شاید خون آشام برہمنوں کے ڈر سے سیاس لے لیا تھا۔

شکانگاہ میں برہمن خاندان کو درختوں میں آباد ہے۔ جانوروں کا بھی اور انسانوں کا بھی!

بستی کے اچھوتوں کے لئے مسلمانوں کے چند گھرانے اسی نرک میں موت کی چکی چلتے ہیں یہاں ان کو چند لمحوں کا سکون مل جاتا ہے۔ ماسٹر نور محمد رات کو انہیں ریڈیو پر جہاں دنیا کی خبریں اور اخبار سے دنیا بھر کی باتیں سناتا کرتے ہیں کتنی عجیب اور حیران کن ہوتی ہیں یہ باتیں ۔۔۔!! ایک دم ناقابل یقین

کیشو رام نے کئی بار سوچا کتنا عجیب ہے ان کا دھرم اور ان کی باتیں بھی، لوبھلا یہ بھی کبھی ہوا ہے کہ دنیا کے سب انسان برابر ہوں۔ زندگی پہ سب کا ایک جیسا حق ہو۔!! نہیں جھوٹ بالکل جھوٹ تھا۔

ماسٹر نور محمد کی باتوں پہ تو ہو یا نہ ہو لیکن ماسٹر صاحب پر کیشو رام کو مکمل اعتبار تھا۔ رام پیاری نوزائیدہ اوما کو جنم دینے کے دو سال بعد ہی رام کو پیاری ہو گئی تھی لیکن اس کی نشانی ابھی تک اس کے پاس تھی۔ صبح کام پہ جاتے وقت وہ اوما کو ماسٹر صاحب کے ہاں چھوڑ جاتا جہاں دن بھر وہ ان کے بچوں کے ساتھ کھیلتی رہتی۔ ماسٹر صاحب اپنے بچوں کی طرح اس کے ہاتھ میں بھی قاعدہ دے دیتے اور وہ سب کے ساتھ مل کر پڑھتی۔

برہمنوں کے مندروں میں اچھوتوں کو جانے کی اجازت نہیں تھی اور اپنے لئے مندر وہ تعمیر نہ کر سکتے تھے۔ اس لئے زندگی بھر مذہب کا مقصد جو ان کی سمجھ میں آتا تھا وہ یہی تھا کہ برہمنوں کی خدمت کرتے کرتے مر جاؤ۔!!

ننھی اوما نے بچپن سے لڑکپن میں قدم رکھنا شروع کر دیا تھا کیونکہ اس کا بچپن ماسٹر صاحب ہی کے گھر میں گزرا تھا۔ لہٰذا اس نے اب ماحول کو سمجھنے کی کوشش شروع کر دی تھی۔ شام کو اس کا کاکا اس کے لئے گلاب کے پھولوں کا گلدستہ لے آتا اور صبح کو وہ ماسٹر صاحب کے گھر پھولوں کا گلدستہ لے جاتی۔ بس یہی تھی اس کی دن بھر کی مصروفیت!

اوما کے لئے ماسٹر صاحب کے گھر میں دلچسپی کی ہر شے موجود تھی جبکہ اپنے گھر کے اردگرد اسے گلاب کے پھول دھان کے کھیت اور کورے کورے سہمے سہمے لوگوں کے علاوہ کچھ نظر نہ آتا۔ کبھی کبھی پنڈت دوارکا داس یا اس کا کوئی اور رشتہ دار اس طرف سیر کو نکل جاتا تو تمام لوگ ڈر کے مارے اپنے جھونپڑوں میں چھپ جاتے۔

ننھی اوما یہ سب کچھ چپ چاپ دیکھتی رہتی لیکن اس کی سمجھ میں کبھی کچھ نہ آتا۔ وہ اپنے کاکا سے کہتی۔

WWW.PAKSOCIETY.COM
Scanned PDF

ماسٹر صاحب کے گھر میں تو کوئی کسی سے ڈر کر نہیں چھپتا۔ وہاں تو سب لوگ ایک ہی جگہ کھاتے ہیں لیکن یہاں: یہ تضاد آخر کیوں؟ اور اس کیوں کا اسے کبھی کوئی جواب نہ ملتا؛ گاندھی کے ہریجن کہہ دینے سے اچھوت خدا کے بیٹے تو بننے سے رہے۔

کیشو رام شام کو تھکا ہارا گھر لوٹتا اور اس کا منہ چومتا تو ایک لمحے کو اس کے ذہن میں ایک جالا سا تن جاتا اور جب یہ فضا صاف ہوتی تو اس پر رام پیاری کی تصویر ابھرتی۔ رام پیاری جو اس کے اردگرد پھیلے ہوئے دھان کے کھیتوں میں کام کیا کرتی تھی جس کا گندمی رنگ اب گلاب کے پیلے پھولوں جیسا ہو گیا تھا۔ پیلے گلاب کے کئی پودے اس نے اپنے اردگرد لگا رکھے تھے پھر ایک روز وہ دھان کے انہی کھیتوں میں لال رنگ کا خون تھوک کر مر گئی۔ کیشو رام نے تو اسے مرتے سمے بھی نہیں دیکھا تھا۔ بس لوگوں سے ہی معلوم پڑا تھا اس کے مرنے کا۔!

اسے تو یہ بھی یاد نہیں رہا تھا کہ اس کی ارتھی کو کس نے پھونکا تھا۔ بس ایک ڈھیر سا تھا راکھ کا جس کے ایک طرف سفید ڈاڑھی اور سرخ چہرے والے ماسٹر نور محمد کھڑے تھے اور دوسری طرف ننھی اوما اسی کا ہاتھ تھامے کھڑی تھی۔۔!!

حیران سی ننھی منی بچی اپنے کھوئے کھوئے سے باپو کو دیکھ رہی تھی جو پاگلوں کی طرح آگ اور دھوئیں کی لپٹوں کو گھور رہا تھا۔

اس روز بھی وہ انہی خیالوں میں گم تھا کہ اچانک ایک آواز سنائی دی "کیشو"۔ منشی مہنگا مل نے ایک چھناکے کے ساتھ اس کی سوچوں کا تانا بانا منتشر کر دیا۔

"آیا مہاراج"۔! اس نے اوما کا منہ چوم کر اسے ایک طرف کر دیا اور بھاگتا ہوا باہر نکل گیا۔

اوما نے ایک نظر بھاگتے ہوئے باپ پر ڈالی اور باہر نکل کر گلاب کے پھولوں کا گلدستہ بنانے لگی۔ ماسٹر صاحب کی بیوی نے حسب معمول اس کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرا۔ اس سے گلدستہ لے کر ایک طرف رکھا اور قاعدہ اس کے ہاتھ میں پکڑا دیا۔

قریبی گاؤں سے آتے ہوئے ماسٹر صاحب کے دوست کے بیٹے راشد نے ایک نظر اس سانولی سی لڑکی کو دیکھا جس نے بڑی بڑی معصوم آنکھوں میں بجانے کتنا سحر سمیٹ رکھا تھا اور اس کو بے ساختہ اپنے سکول کے ساتھ والے گرجے کی وہ نن یاد آ گئی جس نے ایک بار اسے گود میں اٹھا کر پیار کیا تھا اور ہر روز اسے مٹھائی اور پھل کھلایا کرتی تھی۔

راشد قریبی گاؤں کے ایک مسلمان کا بیٹا تھا۔ اس کا باپ اس سکول کا چپراسی تھا جہاں ماسٹر نور محمد پڑھایا کرتے تھے۔ خود بے اولاد ہونے کی وجہ سے وہ تمام مسلمان اور اچھوت بچوں کو اپنے ہی بچے سمجھتے تھے لیکن راشد کو انہوں نے بچپن ہی سے اپنی زیر نگہداشت رکھا تھا اور اسے اب اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لئے بڑی تگ و دو کے بعد کانپور کے ایک مشنری سکول میں داخل کروا دیا تھا۔ راشد کو گاؤں کے زہریلے براہمنی ماحول سے بچانے کے لئے انہوں نے وہاں ایک ہوسٹل میں داخلہ دلا دیا تھا۔

وہ اسے اپنے بیٹوں سے بڑھ کر عزیز رکھتے تھے اور راشد نے انہیں اپنے باپ کا درجہ دیا تھا۔ اس کا باپ ایک روز ایک ٹھاکر کے ٹریکٹر تلے آ کر کچلا گیا تو وہ ماسٹر صاحب کا ہی ہو کر رہ گیا کیونکہ اس نے ماں نام کی کوئی شے جنم لینے کے بعد نہیں دیکھی تھی۔ اس کی ماں نے تو جیسے اسے جنم دینے کے لئے ہی چند سانسیں بچا رکھی تھیں۔

دوپہر کا سناٹا رفتہ رفتہ گہرا ہوتا گیا۔ وہی سناٹا جو ناگری کے ہرے بھرے کھیتوں والے علاقے کی فضاؤں پر ہمیشہ چھایا رہتا ہے۔ دھان کے کھیتوں سے پرے بھارت ندی بڑی آہستہ خرامی سے جانے کب سے اسی طرح بہتی آ رہی تھی۔ اس کے کنارے کے ساتھ ساتھ پھیلے ہوئے جنگلوں میں ناگری کے براہمنوں کے ہاتھوں جانے کتنی اچھوت دوشیزاؤں کی عصمت دری ہوئی تھی۔ یہ سب مناظر اس کے دیکھے ہوئے تھے۔ لیکن وہ ان سب سے بے تعلق ہمالیہ پربت کے ریشوں ایسی بے تعلقی سے بہے چلی جا رہی تھی۔!

"شہر کے سب لوگ ایسے ہی کپڑے پہنتے ہیں کیا؟"۔۔۔

WAQAR Scan & PDF

ننھی اوما نے گیلی مٹی کا مکان بناتے راشد سے پوچھا۔

"اور کیا نہیں تو" ۔۔۔!! اس نے بے نیازی سے جواب دیا۔

"راشد بابو کسی روز مجھے بھی شہر لے جاؤ نا"

اس نے شہر کی باتیں تو راشد سے اکثر پوچھی تھیں لیکن شہر جانے کی فرمائش آج پہلی بار کی تھی اور ننھا راشد حیران تھا آخر اسے کیا جواب دے۔

"تم ماسٹر چاچا سے کہو نا ۔۔۔" بالآخر اس نے سوچ سمجھ کر اوما سے کہا۔

اور اسی روز اوما نے ماسٹر صاحب سے بھی کہہ ہی ڈالا۔

"اچھا اچھا لے چلیں گے کسی روز ۔۔۔!

وہ بھاگتی بھاگتی اپنے کاکا کو یہ خوشخبری سنانے چل دی جو ابھی ابھی کام سے واپس آیا تھا۔

"نہ بیٹا! ہم تو غریب لوگ ہیں ہم شہر نہیں جایا کرتے۔"

"لیکن کاکا کملا اور روپا بھی تو روزانہ شہر ہی پڑھنے جاتی ہیں۔"

"میری بچی! وہ تو دھنوان ہیں! بڑے لوگ ہیں۔ ہمارے مالک ہیں۔ ہم ان کی برابری تو نہیں کر سکتے۔" اس نے بڑی محبت سے اوما کو اپنے پاس بٹھاتے ہوئے سمجھایا۔

لیکن بالآخر اسے اپنی بیٹی کی ضد ماننا پڑی۔ ایک بار پھر بڑی شدت سے اس کے دل میں ماسٹر جی کے لئے عقیدت کے جذبات جاگ پڑے جو اس کی بیٹی کو اتنی شدت سے چاہتے تھے ایک اچھوت کی بیٹی کو جس کا سایہ بھی اس کے مالکوں کے نزدیک منحوس تھا۔

پھر ایک روز اوما ماسٹر جی کے ساتھ کانپور چلی آئی۔ شہر کی بڑی بڑی سڑکیں، عمارتیں، گاڑیاں اور آتے جاتے مصروف لوگوں کو وہ ایک عجوبہ کی طرح دیکھ رہی تھی۔ اتنی بھیڑ بھاڑ کا تصور ہی اس کے لئے محال تھا۔

راشد اسے اپنے ساتھ سکول لے گیا جہاں ایک گرجے کی نن نے ان دونوں کو پیار کیا اور پھل بھی کھلائے۔

"ماسٹر جی میں گاؤں نہیں جاؤں گی۔" اس نے واپسی پر مچلتے ہوئے کہا۔

"نہیں بیٹی پھر آئیں گے تمہارے باپو کے ساتھ۔" ماسٹر صاحب نے اسے بمشکل ٹالا۔

"راشد جب میں اپنے باپو کے ساتھ آؤں گی نا! پھر واپس گاؤں نہیں جاؤں گی۔" وہ ہانپتے ہوئے راشد کو سب کچھ بتا رہی تھی۔

صبح کے بھیگے ہوئے سناٹے میں اوما نے دھان کے کھیتوں پر نظر ڈالی جن کے دونوں اطراف کچی منڈیروں پر ہیری اور ببول کے پیڑ جھکے ہوئے تھے۔ ندی کی طرف جانے والی پگڈنڈی اور اس ٹیلے پر نظر ڈالی جہاں دور دیس کے آنے والے پرندوں کی وہ پرانی جھونپڑی اور شکستہ خانقاہ بنی ہوئی تھی جس کی دیواروں کی اینٹوں میں سے اگ کر لمبی لمبی گھاس باہر کو جھک آئی تھی۔ پھر وہ کھلی ہواؤں کی مہک، ریہٹ کے چلنے کی آواز، بیل گاڑیوں اور ادھوں کے بہتیوں سے پیدا ہونے والے شور اور ان میں سے نکلنے والی طرح طرح کی صداؤں میں کھو کر رہ گئی۔ ان سب چیزوں کو اس نے دوبارہ دیکھا ان کی واقفیت اور مکمل پن کو محسوس کیا وہ کسان مرد اور عورتیں جو دن بھر اسے کھیتوں اور پگڈنڈیوں پر اپنے اپنے کام میں مصروف ادھر ادھر آتے جاتے نظر آ رہے تھے اسی دھرتی کے بیٹے تھے۔ ان کی زبان لب و لہجہ گیت، دکھ سکھ اور وہ فضا جس میں وہ پیدا ہوئے یہی تھی۔

وہ سب اسی اپنی مٹی کے دیوتا تھے۔ حیات کی ارتقا کے دیوتا۔ لیکن یہ صدیوں کا بیمار سکوت یہ غلاظت یہ سارے بوجھ جو ایک دم اکٹھے ہو کر ان پر سوار ہو گئے ہیں اس نے سوچا۔ ... یہ پھٹے پرانے چیتھڑوں میں ملبوس انسان نما گدھے جو صبح سے شام تک کیڑوں کی طرح رینگتے رہتے ہیں۔ ابھی کچھ سوچتی وہ ماسٹر صاحب کے گھر کی طرف جانے والے راستے پر چلتی رہی جہاں راشد اس کا منتظر تھا۔

قریبی مندر سے پجاری کے اشلوک پڑھنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ ایک لمحے کو اس کا دل چاہا کہ اس حرامی کا گلا اتنی زور سے دبائے کہ اس کی آنکھیں ابل کر باہر آ جائیں۔ اس کی جھوٹی زبان

WAQAR
Scan & PDF

دانتوں سے باہر نکل کر چلا چلا کر کہے۔

"ہم جھوٹے ہیں صدیوں سے جھوٹے، رذیل اور کمینے چلے آرہے ہیں۔ ہماری ساری زندگی جھوٹی ہے۔ ہماری موت بھی جھوٹی ہوگی۔ ہم۔ ہماری تہذیب، ہمارا سماج، ہمارا دھرم سب کچھ جھوٹا ہے۔ ہماری ہر چیز جھوٹی فرسودہ اور ٹھکرائی ہوئی ہے۔"

اس نے سوچا ان کی زیست اور موت میں کیا فرق ہے؟

اچانک راشد اسے اپنی طرف آتا نظر آیا۔ اس کی زندہ اور ٹھوس شخصیت نے ادما کے تخیل کو تیرہ و تار کر دیا۔ جیسے تاریک و سیاہ بادلوں سے بھرے ہوئے آسمان پہ بجلی کوند جائے اور ساری کائنات کو اپنی تابانیوں سے منور کرتی چلی جائے۔ اس کا سارا غصہ فرو ہو گیا اور وہ مبہوت ہو کر راشد کو آتے ہوئے دیکھنے لگی۔!!

اسے دیکھ کر ادما کی چال میں لغزش پیدا ہو گئی۔ اس کے قدم آہستہ ہو گئے۔ وہ دونوں اب اس تنگ سی راہگزر پر تھے دونوں طرف سے دھان کی فصلوں بھرے کھیت اسے ڈھانپے کھڑا تھا ایک دوسرے کا منہ دیکھ رہے تھے۔ ادما کے سر پہ اوڑھے سفید دوپٹے میں سے اس کے شانوں پر لہراتے ہوئے گیسو اس کے حسن کو اور بھی تابدار کر رہے تھے۔ اس کے چہرے پہ ایک جاں بخش تازگی تھی اور رسیلے ہونٹوں کے کونے نہ جانے کون سے جذبے کے زیر اثر کانپ رہے تھے۔ راشد کی نگاہیں رعب حسن کی تاب نہ لاتے ہوئے جھک گئیں۔

"کیسی ہو ادما؟" اس نے بمشکل یہ الفاظ ادا کئے۔

جواب میں ادما مسکرا دی۔ جیسے مونالیزا کی تصویر میں جان پڑ جائے۔ مسکراہٹ جس میں چاشنی نزاکت اور چاندنی گھلی ہوئی تھی جس میں ایک حسین ترین نغمے کی مکمل غنائیت موجود تھی۔ اس کا دل بڑی شدت سے چاہا کہ ادما یونہی مسکراتی رہے۔

"بابو جی تو ٹھیک ہیں نا"؟

اور جواب میں اس نے ادما کے چہرے پہ گلاب کے پھول کھلتے ہوئے دیکھے۔

راشد کے دل میں شدت سے اسے اپنے سینے میں سما لینے کی خواہش پیدا ہوئی۔ ہمیشہ کی طرح اس نے اپنے احساس کی اس ضدی جبلت کو دبا دیا۔ وہ حیران رہ جاتا۔ جب بار بار دبانے پہ بھی یہ احساس دل کے کسی کونے سے پھر ابھر آتا تھا۔ وہ اس جنسی کشش کو خوب سمجھتا تھا لیکن یہ کشش ہر بار ایک ضدی بچے کی طرح مچل اٹھتی تھی۔ وہ سوچا کرتا کہ دو جوان مرد عورت ایک دوسرے سے ناآشنا ہوتے ہوئے ایک دوسرے سے محبت نہ کرتے ہوئے بھی ایک دوسرے کے اس قدر نزدیک کیوں ہو جاتے ہیں کہ ساری کائنات گھوم گھما کر ایک ہوتی محسوس ہوتی ہے اور زمین آسمان کا یہ سنہرا سنگم ان کی دھڑکنوں میں اس طرح سما جاتا ہے کہ لاکھ کوشش پر بھی وہ یہ نہیں جان پاتے کہ وہ ایک ہیں یا دو؟

"آپ کہاں کھو گئے۔"؟ ادما نے اسے کھوئے کھوئے دیکھ کر پوچھا۔

"کچھ نہیں"۔ سوچوں کا طلسم ٹوٹ گیا۔

"میں تو سوچ رہا تھا گلاب کے یہ سفید سرخ اور پیلے پیلے پھول کتنے بھلے لگتے ہیں اور ان کی مہک کتنی عجیب ہے۔" اس نے ادما کے ہاتھ میں پکڑے گلاب کے پھولوں کے گلدستے کو غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"یہ تو بابو جی! میں آپ ہی کے لئے لے کر جا رہی ہوں کل ماسٹر جی نے کہا تھا آپ رات کو آجائیں گے"۔

"ادما"۔

"ہوں"۔

"ایک بات پوچھوں"۔

"پوچھئے"۔ اس نے غزالی آنکھیں اوپر اٹھا دیں۔

"تم رات کو اچھی طرح سو بھی سکیں تھیں کیا"؟

اور جواب میں ادما ہنستی ہوئی وحشی ہرنی کی طرح چوکڑیاں بھر کر بھاگ گئی۔ کیونکہ قریب

Scan by PDF WAQAR

ہی کسی کے قدموں کی آہٹ سنائی دے رہی تھی۔

یہ پنڈت دوارکا داس کا بیٹا پرکاش تھا جو گورنمنٹ کا بہت بڑا عہدیدار تھا اور کبھی کبھی زبان کا ذائقہ بدلنے کے لئے اپنے آبائی گاؤں چلا آتا تھا جہاں اس کی جاگیر میں دھوتیوں کی نوجوان چھوکریاں رہا کرتی تھیں۔ جن کے نمکین اور لچکدار جسموں کی طلب اسے دیوانہ بنا دیا کرتی تھی ۔! اور جن کی روحوں اور جسموں کو وہ اپنے باپ کی ملکیت سمجھتا تھا۔ وہ اکثر سوچا کرتا کہ آخر کیا اتنے بدصورت لوگ اتنی خوبصورت لڑکیوں کو کیسے جنم دیتے ہیں ؟

سال بھر میں وہ ایک دو دفعہ اپنے گاؤں آتا اور ہر دفعہ کسی نہ کسی بدقسمت کو اس کے بستر کی زینت بننا پڑتا۔ یہ لہو کچھ ایسا اس کے منہ لگا تھا کہ اب چھٹتا نظر نہیں آتا تھا۔ آج بھی وہ اس چکر میں ادھر آنکلا تھا۔ جہاں اس نے اوما کی بھاگتے ہوئے ایک جھلک دیکھی تھی اور دل تھام لیا تھا۔ پھر اس کی نگاہیں راشد کی نگاہوں سے ٹکرائیں۔ گھاگ اور مکار آنکھوں والے برہمن زادے نے ایک ہی لمحے کے ٹکراؤ میں ان آنکھوں میں تڑپتی ہوئی کہانی کا ایک ایک لفظ پڑھ لیا۔ ایک حقارت بھری نظر اس نے راشد پہ ڈالی۔ اس نوجوان پر جس نے ان کی صدیوں سے غلام قوم کی لڑکی کو اپنانے کا ناقابل معافی جرم کیا تھا۔ بھلا کس کو یہ حق حاصل تھا کہ ان کی جاگیر میں بستی ہوئی کسی بھی چیز کو اپنا جانے ۔؟

"کون ہو"؟ اس نے بڑی رعونت سے پوچھا۔

"جی میرا نام راشد ہے"

"اوہ! اس ماسٹر کے کچھ لگتے ہو ۔" گردن مزید اکڑ گئی۔ "کیسے آنا ہوا؟ تم تو غالباً کانپور میں پڑھتے ہو"

"جی چھٹیوں میں یہاں چلا آتا ہوں"

"ٹھیک ہے لیکن اپنی حیثیت کبھی نہ بھولنا" اس نے تیزی سے کہا اور ایک طرف چل دیا۔

راشد کچھ نہ سمجھتے ہوئے بھی مسکرا دیا۔

راشد نے ندی کی طرف جاتے ہوئے ایک نظر ان کسانوں پہ ڈالی جو اپنے گھاس کے گٹھوں کے قریب ہی پڑے سو رہے تھے۔ ان کے چہروں پر چاند چمک رہا تھا۔ تارے مسکرا رہے تھے۔ کھیتوں کی نازک لطیف ہوا اپنے دوش پر پھولوں کی مہک لئے ان کی مدھم سانس کو مہکائے دے رہی تھی۔ ساری دھرتی سے ایک سوندھی سوندھی باس اٹھ رہی تھی۔ جیسے دھرتی نے اپنی نرم و گداز آغوش ان پر وا کر دی ہو۔ ساون کی ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں انہیں تھپک تھپک کر کہہ رہی تھیں۔

"سو جاؤ۔ میرے بیٹو۔ ماں کی آغوش میں سو جاؤ یہاں تمہیں کوئی خطرہ نہیں"

راشد نے سوچا بے شک خطرہ وہیں ہوتا ہے جہاں جنگلے بنے ہوتے ہیں۔ یہاں کون سا خطرہ ہے۔

وہ تیز قدموں سے ندی کے کنارے کنارے اس درخت کی طرف چل دیا جس سے ٹیک لگائے اوما اس کی منتظر تھی۔ اسے اوما سے بے پناہ محبت تھی اور

بلکہ ندی کی ساری روانی اور اس کی گہرائی موجود تھی۔ اس گہرائی سے اسے ڈر لگتا تھا۔ اب اگر وہ چاہتا بھی تو اس جذبے کو اپنی روح سے اکھاڑ کر پھینک نہیں سکتا تھا۔ اس کے ہیولے نے اس کے سارے ذہنی افق کو مستور کر دیا تھا اور سانس کی ہر دھڑکن زیست کی ہر حرکت میں اسے اس لمحے کی موجودگی کا احساس ہوتا رہتا۔ ہر وقت اس کی روح پہ ایک گہری اداسی کا پرتو جھلکتا رہتا۔ شاید اس کی روح اپنی انفرادیت کو کھو کر اپنی انا کو کسی دوسری ہستی میں مدغم کر رہی تھی۔ اور یہ احساس چاہے کتنا ہی پیارا کیوں نہ ہو ضرور تکلیف دہ ہوتا ہے۔ اس اداسی میں شیرینی بھی تھی اور اذیت بھی، لیکن یہ اذیت بھی کتنی شیریں تھی۔ اس نئے احساس نے اس کی زندگی میں نئے معانی پیدا کر دیئے تھے اور اس کی روح کو ایک نئی خوبصورتی، نئی تابانی اور نئی جمالیت سے معمور کر دیا تھا۔ اس سے پہلے تو ایسا کبھی نہ ہوا تھا ۔!

WAQAR
Scan & PDF

"راشد بابو!"

"ہوں!"

"صبح تم چلے جاؤ گے!"

"پھر آ بھی تو جاؤں گا! تو ہر دفعہ ایسی باتیں کیوں کیا کرتی ہے؟"

"راشد اس دفعہ میرا دل کسی انجانے خوف سے دھڑک رہا ہے۔ بھگوان جانے کیا ہونے والا ہے۔ میرا دل اس طرح پہلے کبھی نہ دھڑکا تھا۔"

"ایسی باتیں سوچا ہی نہ کرو۔ دیکھو چاند کی طرف وہ بھی بادلوں کی اوٹ سے نکل کر سامنے آگیا ہے ہمیں دیکھنے کے لئے۔ یہ چاند بھی کتنی عجیب شے ہے۔ جانے کتنے پریمیوں کو پیار کرتے دیکھتا ہے روزانہ، لیکن ایک کا راز دوسرے کو نہیں بتاتا۔" وہ نہیں چاہتا تھا کہ ان خوبصورت لمحات کو اپنے اور ادما کے ذہن میں پیدا ہونے والے وسوسوں کی بھینٹ چڑھا دے۔ بہت دیر تک وہ درخت کے تنے سے لگے باتیں کرتے رہے۔ آہستہ آہستہ مدھم مدھم سرگوشیاں بیچ بیچ میں خاموشی۔ قربت کی شہد آگیں خاموشی اس لمحے زندگی اور زمین کی گردش اپنے محور پر گھومتے گھومتے رک گئی تھی اور ساری کائنات ایک طویل لمحہ بھی نہ ختم ہونے والا سلسلہ دکھائی دینے لگی تھی۔

"راشد بابو! اب تو جی چاہتا ہے چپکے سے اسی طرح سو جاؤں۔" ادما نے اپنے سر کو اس کے سینے پر رکھتے ہوئے کہا۔

"کیوں؟"

"اتنی خوشی برداشت جو نہیں ہوتی۔"

"ہسٹیریکل کہیں کی — ڈرتی ہو؟"

"ہاں۔"

"کس سے؟"

"اپنے آپ سے تم سے قسمت سے اپنے سماج سے اور سب سے زیادہ پنڈت دوارکا داس سے —!"

"پنڈت دوارکا داس سے کیوں؟" راشد چونک پڑا۔

"راشد! تم اسے نہیں جانتے! تم نے اس کا اصلی روپ ابھی نہیں دیکھا۔ وہ درندہ ہے درندہ۔ جانتے ہو اس نے بملا کا گلا اپنے ہاتھوں سے گھونٹ ڈالا تھا۔"

"ادما!" راشد نے اسے کندھے سے لگاتے ہوئے کہا۔

"راشد میں تمہاری طرح بہت زیادہ پڑھی لکھی نہیں ہوں — پر میں! میں..... سچ کہتی ہوں میرا جسم یہ تو کچھ بھی نہیں۔ میری آتما سب کچھ تمہارا ہے۔ پر دیکھو اس کے اندر جو دل ہے نا! اسے ٹھیس نہ لگانا۔"

"ادما" جذبات سے مغلوب ہو کر اس نے ادما کو گلے لگا لیا۔

ایسے لمحوں میں جب الفاظ کھو جاتے ہیں تو ایسی الٹی سیدھی حرکتیں ہی جذبات کا اظہار کیا کرتی ہیں۔ وہ دونوں اسی طرح چپ چاپ نہ جانے کتنی دیر ایک دوسرے میں کھوئے رہے۔ خاموش ایک دم خاموش — ! ایسے جیسے ان کے قدموں کے پاس بہتی ہوئی بھارت ندی۔ ان کی نظروں کے سامنے ننھے منے جگنو چمک رہے تھے جیسے ستارے ان کے مقدس پیار کی گواہی دینے کے لئے دھرتی پر اتر آئے ہوں۔ پورن ماشی کا چاند مسکراتا ہوا ان کے سر پر سایہ فگن ہو گیا تھا۔ جیسے ان سے کہہ رہا ہو۔

"میرے بچو! آؤ میرے دامن میں پناہ لے لو اور جی بھر کے ایک دوسرے کو پیار کرو۔ میری آغوش میں چلے آؤ۔ یہاں کوئی پنڈت دوارکا داس نہیں جو تمہاری مسرتوں کو ڈس لے گا۔

سینٹ میری چرچ میں لوگ دھیمے دھیمے سروں میں گا رہے تھے۔ ریورنڈر فرانسس کا وعظ ختم ہو چکا تھا۔ چرچ سے بھی آگے نکل کر اس نے کالج کی جانب جاتی ہوئی سیاہ تارکول کی سڑک پر نظر دوڑائی جیسے کوئی نجومی کسی کے گھور اندھیرے مستقبل میں جھانکنے کی کوشش کرے۔

WAQAR Scan PDF

سفید کپڑوں پر سرخ سویٹر پہنے ایک لڑکی سامنے سے آ رہی تھی۔ راشد کو یوں لگا جیسے تاریکی میں ستارہ آسمان سے ٹوٹ کر زمین پر گر پڑا ہو۔ کالج کی سڑک کو چھوڑ کر وہ دوسری سڑک پر ہو لیا جو سیدھی گومتی کے کنارے جاتی تھی۔ اس کے دونوں طرف انسانوں کا سمندر ٹھاٹھیں مار رہا تھا جس میں ہر طرح کے انسان تھے۔ مزدور، سرمایہ دار، لیڈر، انٹلیکچوئل، ادیب، شاعر اور نہ جانے کیا کیا۔ سڑک کے ایک طرف سائیکلوں پر سوار لڑکیوں کا ایک ہجوم سا جا رہا تھا۔ نیلے پراک اور سفید شلواروں والی لڑکیاں جنہوں نے سیاہ بالوں میں سرخ ربن باندھ رکھے تھے۔ آپس میں خوش گپیاں لڑاتی ساری کائنات سے بے پرواہ چلی جا رہی تھیں۔

وہ ان سب سے بے پرواہ گومتی کنارے بنے ہوئے گاندھی پارک میں پہنچ گیا جہاں سفید ساڑھیاں پہنے ہوئے سیاہ اور خاموش آنکھوں والی بے شمار لڑکیاں اپنے جوڑوں میں جوہی کے پھول سجائے گھوم رہی تھیں اور ان کے ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے وہ نوجوان بھی تھے جن کے نوجوان چہروں پہ امید، مایوسی، بے یقینی اور خود اعتمادی کی ملی جلی پرچھائیاں آنکھ مچولی کھیل رہی تھیں۔ وہ بہت کچھ سوچتے تھے۔ بہت کچھ کر چکے تھے اور ابھی بہت کچھ کرنا چاہتے تھے۔ ان کے چاروں طرف ایک بہت بڑی اندھیری دنیا پھیلی ہوئی تھی جس سے وہ اب تک لڑتے آئے تھے جس سے انہیں نہ جانے کب تک لڑتے رہنا تھا۔ ان کے درمیان انقلابی خیالات والے بھی تھے، اعتدال پسند اور قنوطی بھی ــــ لیکن وہ ان سب سے الگ تھلگ گومتی کے کنارے ساحل کے ایک طرف بیٹھ گیا جہاں اس سے ذرا ہٹ کر ایک جوڑا ایک دوسرے کی باہنوں میں باہیں ڈالے بیٹھا تھا۔ ایک لمحہ کو انہوں نے اس کھوئی کھوئی سی آنکھوں والے نوجوان کو دیکھا اور پھر اسے بے ضرر جان کر اپنی باتوں میں مگن ہو گئے۔ وہ ٹکٹکی باندھے پانی کی لہروں کو گھور رہا تھا۔ کافی دیر بعد وہ بے مقصد ان لہروں کو گھورنے کے بعد واپس چلا آیا۔

ہوسٹل واپس آیا تو ماسٹر جی کے خط کے ساتھ ہی امّا کا ایک خط بھی اس کا منتظر تھا۔

اس نے لکھا تھا۔

"راشد بالو!

کل مجھے پرکاش نے اپنے حضور طلب کر کے سرزنش کی تھی اور مجھے اس انجام سے بھی آگاہ کیا تھا جس سے مجھے دوچار ہونا پڑے گا۔ پر تم گھبرانا نہیں۔ وہ پاگل ہے اسے کیا معلوم میرے تو جنم کا باعث ہی تم ہو۔ میں تو جنم جنم کے ویرانوں میں تمہیں تلاش کرتی ہوئی یہاں تک پہنچی ہوں۔ اب تو دنیا کی کوئی طاقت تمہیں مجھ سے جدا نہیں کر سکتی۔ موت ہمارے وصال کا حرفِ اوّل ہوگا۔ محبت کا جو شعلہ تم نے میرے دل میں فروزاں کیا ہے وہ آتش پرستوں کی آگ کی طرح ہمیشہ جلتا رہے گا اور میرے دل کا معبد زندگی کے آخری لمحوں تک اس شعلے سے روشن رہے گا۔

میں تو تم سے اس طرح پیار کرتی ہوں جیسے شبنم پھولوں اور پتوں سے۔ پرکاش تو پاگل ہے۔ بھلا ندی کو اپنے کناروں اور چاند کو اپنی کرنوں سے پیار کرنے سے بھی کوئی روک سکتا ہے؟ وہ چشمہ جس نے تپتے ہوئے صحرا میں میری پیاس بجھائی تھی تجھے بھول جانے کا؟

میری محبت وہ ستارہ صبح نہیں جو سورج کی پہلی کرن کے ساتھ ماند پڑ جائے۔ یہ تو ہمالہ پربت کی وہ چوٹی ہے جہاں سے بہتا ہوا پانی پانچ دریاؤں کو جنم دیتا ہے۔ نرگس کا وہ اندھا پھول ہے جو سب کچھ دیکھتا ہے۔ بن بھی سینچ سورج کر رہ جاتی ہوں کہیں آشاؤں کے پتھریلے پہاڑوں سے ٹکراتے ٹکراتے میرا جسم ہی چور چور نہ ہو جائے۔ عورت ہوں نا۔!

تم کب آؤ گے؟ محمد حسین نے بتایا تھا۔ اس مہینے تم آ جاؤ گے لیکن کیا کروں میں تو چاہتی ہوں تم بہت پڑھ لکھ کر بہت بڑے افسر بنو۔ پرکاش سے بھی بڑے تاکہ وہ ہم سے ٹکرا ہی نہ سکے۔ محمد حسین بہت اچھا ہے۔ تمہارے خطوط مجھے فوراً پہنچا دیتا

WAQAR Scan PDF

ہے۔ ماسٹر جی بھی بہت اچھے ہیں۔ تم سب لوگ ہی بہت اچھے ہو۔ بہت ہی پیارے۔"!

میں ہوں تمہاری

اوما

خط پڑھتے وقت اس کی تمام حیات سمٹ کر آنکھوں میں آگئی تھیں۔ اس نے ایک ایک لفظ کو نہ جانے ہمیشہ کی طرح کتنی کتنی بار پڑھا تھا۔ اسے ایک ایک لفظ سے اوما کی خوشبو آرہی تھی۔

جسے وہ اپنی زندگی سے بڑھ کر پیار کرتا تھا تاکہ وہ بہت بڑا افسر بن جائے۔ دنیا کی کوئی طاقت بڑائی اور امارت میں اس کا مقابلہ نہ کر سکے اور اب تو منزل بہت ہی نزدیک آرہی تھی۔ بس چھ ماہ بعد ہی اسے ڈگری مل جائے گی ــــ !! پھر وہ ہوگا اور اوما۔ دنیا کتنی حسین ہو جائے گی۔

سینٹ میری کی مقدس نن کتنی خوش ہوگی۔ اس کی اس کامیابی پر۔ وہ اسے کتنا چاہتی ہے۔ وہ کتنا خوش نصیب ہے جسے سب پیار کرتے ہیں۔ سسٹر مری فرنک ماسٹر نور محمد، محمد حسین اور سب سے بڑھ کر اوما۔

"کیشو"۔ پنڈت دوارکا داس نے سامنے ہاتھ باندھ کر کھڑے کیشو رام پر دھاڑتے ہوئے کہا۔ "تم کیا سمجھتے ہو تمہاری حرکتیں ہم سے پوشیدہ ہیں"!

"مہاراج! میں نے کچھ نہیں کیا"۔

"بکتے ہو حرام خور۔ اور کیا تمہارے باپ نے کیا تھا"۔ غصہ کے مارے دوارکا داس کے منہ سے الفاظ بھی ٹھیک طرح ادا نہیں ہو رہے تھے۔

"کیشو تم ہمارے نمک خوار ہو! اس ملیچھ کے نہیں۔ ہمارے دشمن سے تمہارا یہ میل ملاپ ہمیں ہرگز پسند نہیں ہے"۔

"مہاراج! میں نے تو...." کیشو نے کچھ کہنا چاہا۔

"بس زیادہ بکواس نہ کرو۔ صرف یہ یاد رکھنا کہ وہ ماسٹر مسلا ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا اور اگر تم نے ہمارے خلاف کچھ سوچنے کی کوشش بھی کی تو اتنی بڑی سزا دوں گا کہ یاد رکھو گے...."

"لیکن مہاراج"!.....

"لیکن ویکن کچھ نہیں بس دفع ہو جاؤ"۔ اس نے اپنے پاؤں پڑے ہوئے کیشو رام کو لات مارتے ہوئے کہا اور وہ آنسو بھری آنکھیں پونچھتا ہوا باہر نکل آیا۔

عین اسی لمحے پردے کے پیچھے کھڑا منشی مہنگا مل بھی چپکے سے دبے پاؤں باہر نکل آیا۔ ایک مکارانہ مسکراہٹ اس کے بھدے ہونٹوں پر پھیل گئی جس نے اس کے چہرے پر برستی لعنت کو اور بھی چار چاند لگا دیئے تھے۔ "گدھا نہ ہو تو کہیں کا۔ مجھے رشتہ نہیں دے گا تو نہ دیا کا تو اور کیا اس نوٹ سے کھوسٹ سے بیاہے گا"۔

کیشو رام جب اپنی جھونپڑی میں داخل ہوا تو اوما ایک چارپائی پر گہری نیند سو رہی تھی۔ اس کے لمبے بالوں نے اس کا آدھا چہرہ ڈھانپ رکھا تھا۔ ایک لمحہ کے لئے اس کے ذہن میں رام پیاری کی تصویر ابھر آئی۔ بالکل اپنی ماں کی طرح ہے۔ جھونپڑی کے ایک کونے میں بھگوان کرشن کی مورتی رکھی ہوئی تھی۔ کیشو رام نے اچانک غصے میں آکر اسے اٹھایا اور سامنے دیوار سے دے مارا۔

"کیا ہوا کاکا"۔ اوما اچانک ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی اور پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس منظر کو دیکھ رہی تھی۔

"کچھ نہیں بیٹا کچھ نہیں" ــــ اس نے اوما کو اپنی آغوش میں لیتے ہوئے کہا۔

"جو بھگوان صرف برہمنوں کا ہو کر رہ گیا ہو! ہمارا اس سے کیا رشتہ۔ میری بچی"۔

"کاکا سچ بتاؤ کیا بات ہوئی ہے۔ تجھے میری جان کی قسم! کاکا سچ سچ بتا دے آج پھر پنڈت جی نے مارا ہے کیا"۔

اور جواب میں اس کا بابو صرف آنکھیں جھکا کر رہ گیا۔ جیسے وہ خود اوما اور اوما کیشو رام ہو۔

"بھگوان کیسا انیائے (انصاف) ہے تیرا۔ کیسا بھگوان ہے تو۔ سارے دن کی محنت کا صلہ ہمیں کیا اسی شکل میں ملا کرے گا۔ ہمارے بھاگ میں کیا یہی کچھ لکھا ہے"۔

WAQAR URDU
Scanned PDF

اس نے سسکیاں بھرتے ہوئے بھگوان سے پوچھا۔

اور بھگوان خاموش رہا۔

"تم نے بہت اچھا کیا کاکا! بہت اچھا کیا! ہم ایسے بھگوان کو کیوں پوجیں جس کے مندر میں بھی ہمیں جانے کی اجازت نہیں ہے۔"

وہ سسکیاں لیتی ہوئی اپنے کاکا سے لپٹ گئی۔

منشی مہنگا مل نے کل ہی دوا جیا رام کے ذریعے اپنے لئے اس کی لڑکی کا رشتہ مانگا تھا لیکن کیشو رام اس حرام خور کو اپنی لڑکی بیاہنے سے اس کا گلا گھونٹ دینا زیادہ بہتر خیال کرتا تھا۔

منشی اپنے شیطان مالک ہی کا چیلا تھا آخر۔

مہنگا مل کا خیال آتے ہی اس نے اچانک اپنے ذہن میں ایک فیصلہ کر لیا تھا۔ اوما کو ماسٹر نور محمد کے گھر ہمیشہ کے لئے رکھنے کا۔ وہ تو سارا دن کام پر رہتا تھا۔ بعد میں لڑکی گھر میں اکیلی رہتی تھی۔ رام جانے کس وقت اس پاپی کی نیت خراب ہو جاتے اور اس کی بیٹی کا مقدر بھی وہ ذلت اور رسوائی بن جائے جس سے کئی اچھوت لڑکیاں پہلے ہی دوچار تھیں۔

"چلو بیٹی میرے ساتھ۔" اس نے اچانک اوما کا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا۔

"کہاں کاکا ۔۔۔؟"

لیکن اس کے کچھ پوچھنے سے قبل ہی اس کا باپ اس راستے پر گامزن ہو چکا تھا جو ماسٹر نور محمد کے گھر کی طرف جاتا تھا۔

"آؤ آؤ کیشو رام! آج اس وقت اچانک یہاں کیسے ۔۔۔؟" ہمیشہ کی طرح سرخ چہرے اور سفید داڑھی والے ماسٹر نور محمد نے اسے فراخ دلی سے ملتے ہوئے سوالیہ لہجے میں پوچھا۔

"کچھ نہیں ماسٹر جی! سوچا درشن کئے کئی روز ہو گئے۔ کم بخت کام سے جان ہی نہیں چھٹتی۔ آج مہلت ملی تو چلا آیا۔"

وہ ماسٹر صاحب کے قریب ہی چارپائی پر بیٹھ گیا۔ اوما کو اس نے اپنے قریب ہی بٹھا

لیا تھا۔ پھر چائے بھی آ گئی۔ ایک ہی قسم کے برتنوں میں ایک ہی جگہ وہ ان کے ساتھ چائے بھی پی رہے تھے۔

کیشو رام عقیدت و احترام کے ملے جلے جذبات سے ماسٹر جی کی طرف دیکھے جا رہا تھا۔ جو سفید چشمہ لگائے اخبار پڑھ رہے تھے کتنا عظیم ہے یہ انسان!

اس کے دل سے رہ رہ کے آواز نکلتی۔

"ماسٹر جی"! بالآخر اس نے جھجکتے ہوئے بات شروع کر ہی دی۔

"ہوں"۔ ماسٹر جی بدستور اخبار پڑھے جا رہے تھے۔

"بات دراصل یہ ہے کہ ۔۔۔"

"ہاں ہاں کہو کہو! جھجک کیوں رہے ہو کوئی خاص بات ہے کیا؟" ماسٹر صاحب اخبار ایک طرف رکھ عینک اتار کر اس کے شیشے صاف کرنے لگے۔

"اوما! جاؤ تم بیٹی اپنی خالہ کا ہاتھ بٹاؤ رسوئی میں۔" انہوں نے اوما کو وہاں سے ہٹانا چاہا۔

نجانے کیشو بھی کیوں یہی چاہتا تھا کہ اوما بھی وہاں سے ہٹ جائے۔

پھر تمام باتیں دہرانے کے بعد کیشو رام نے کہنا شروع کیا "ماسٹر جی! آپ کے پہلے ہی مجھ پر اتنے احسانات ہیں ایک احسان اور کر دیجئے۔ اوما کو اپنے ہاں رکھ لیجئے۔ میں اسے یہاں آ کر مل جایا کروں گا۔ حالات بہتر ہوتے ہی ہم یہ گاؤں چھوڑ کر کہیں اور چلے جائیں گے۔" بوڑھے اور مجبور اچھوت کا گلا رندھ گیا۔

"کیشو رام! کیسی باتیں کرتے ہو، اوما تو ہمیشہ ہی میری بیٹی بن کر ہی رہی ہے۔ میں نے اسے ہمیشہ اپنے بچوں کی طرح جانا ہے۔ اس میں احسان والی کیا بات ہوئی ۔۔۔ پھر اس کا اور ہے بھی کون سوائے خدا تعالیٰ کے ۔۔۔"

"ماسٹر جی!" مقہور انسان عظمت کے اس مینار کے پاؤں سے لپٹ گیا۔ اس کے نزدیک اظہار عقیدت کا سب سے عظیم طریقہ یہی تھا۔ اس نے یہی کچھ جو سیکھا تھا۔

WAQAR Scan PDF

لیکن عظیم انسان نے مقہور انسان کو پاؤں سے اٹھا کر گلے لگا لیا۔ کواڑوں کے پیچھے چھپی ہوئی اوما کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر آئیں۔

عقیدت اور محبت کے آنسو۔ آنسو جو خاموش رہتے ہوئے بھی ہزار زبانیں رکھتے ہیں اور ہر زبان ایک کہانی لئے ہوتی ہے۔

شام کے دھندلکے آہستہ آہستہ ناگری کو اپنی لپیٹ میں لے رہے تھے۔ سامنے کی پہاڑیوں کے پیچھے ڈھلتے ہوئے سورج کی کرنیں اپنی لال سرخ زبان نکالے ناگری کو چاٹنے لگی تھیں۔ کھیتوں سے تھکے ہارے کسان گردنیں جھکائے اپنی بستی کو واپس چلے آ رہے تھے۔

اوما سوچ رہی تھی ابھی تک راشد نے اس کے خط کا جواب نہیں دیا۔ رام جانے کیا معاملہ ہے؟ اس کے دل میں عجیب عجیب وسوسے بیدار ہو رہے تھے۔ "کاش کہ ان کی محبت کا علم ہو چکا تھا۔ اور اس سے کسی بھی کمینگی کی توقع کی جا سکتی تھی۔" "نہیں خدانخواستہ اس نے ....." اور اس سے آگے وہ کچھ نہ سوچ سکی۔ وہ اس سے آگے کچھ سوچنا بھی نہیں چاہتی تھی، یہ سوچ ہی کتنی اذیت ناک ہے۔ اچانک محمد حسین اسے اپنی طرف آتا دکھائی دیا۔

محمد حسین نے اپنے ہاتھ میں راشد کا خط پکڑ رکھا تھا جو وہ اس کی معرفت بھیجا کرتا تھا۔ دھڑکتے دل سے وہ رسوئی میں بیٹھی تھوڑی دیر بعد راشد کا خط پڑھ رہی تھی جس نے لکھا تھا۔

"اوما"!

تمہیں پانے کے لئے مجھے ایک طویل ریاضت اور تپسیا سے گزرنا پڑا ہے۔ تم مجھ سے دور تو ہو سکتی ہو لیکن جدا کبھی نہیں ہو سکتی۔ جو کچھ میں دیکھ چکا ہوں اسے میری آنکھوں سے نوچ کر جدا نہیں کیا جا سکتا۔ محبت کی دنیا کا ہر اصول نرالا ہوتا ہے۔ یہاں کی راتیں بھی دن کے سائے ہیں۔ یہاں رات کبھی نہیں آتی۔ یہ سورج ایک بار طلوع ہو جائے تو کبھی ڈوبتا نہیں ہے۔ میں ان راہوں کی خوشبو کو اپنے ذہن سے کبھی محو نہیں کر پاؤں گا جو تمہیں میری اور مجھے تمہاری طرف لے جاتی ہیں۔

اوما! جب تم نے میرے سر پر اپنی محبت کا نورانی تاج رکھا تھا اس لمحے مجھے برہم گیان ہوا تھا۔ اسی لمحے میں نے نروان حاصل کیا تھا۔ وہی نروان جس کی تلاش میں گوتم نجانے کتنا عرصہ جنگلوں کی خاک چھاننی پڑی تھی۔ بادشاہت کی خوشیاں بھی اس کے مقابلے میں ہیچ ہیں۔ اب مجھے کچھ نہیں چاہیئے۔ زندگی کی ہر دولت میں نے پالی ہے۔ یہ ڈاکٹری کی ڈگری یہ زندگی ہیں گزارنے کی خواہش یہ سب کچھ تو تمہارے لئے ہے۔ تم جو محبت ہو میری محبت ہو۔ محبت ہو جانے کا یقین ہے۔ تمہاری محبت میرا ایمان بن چکی ہے۔ تمہارے بغیر آسمان کی نیلاہٹوں کا حسن ختم ہو جائے گا۔ ہواؤں کے طلسمی گیت کوئی نہیں سنے گا۔ زمین کی نیرنگیاں کوئی نہیں دیکھے گا۔ تم نہ ہو گی تو حیات کی نبضیں ڈوب جائیں گی۔ رگوں میں دوڑتا خون جم جائے گا۔ سانسوں کا تانا بانا بکھر کر ٹوٹ جائے گا اور تمہارے ہونے سے موت بھی زندگی بن جائے گی۔ تمہارے ہی دم سے زندگی میں للچاہٹ ہے، سرعت ہے، تڑپ ہے۔ زندگی زندہ ہے۔ یہ تم ہو جو مسکراہٹوں کو جنم دیتی ہو۔ جو چاند کی کرنوں کی طرح منزہ پاکیزہ اور نورانی ہو۔

میں اگلے مہینے آؤں گا۔ چاہتوں کا ایک طوفان سمیٹے ہوئے جو میرے دل میں تمہارے لئے مچل مچل جاتا ہے ۔۔۔ !!

ہمیشہ کی طرح اس نے خط کو عقیدت کے انداز میں چوما جس طرح ماسٹر جی کی بیوی قرآن شریف کو چوما کرتی تھی اور اسے اپنے چھوٹے سے ٹرنک کے سب سے نیچے جہاں اس نے اخبار بچھا رکھا تھا خط کو اس کی تہہ کے ساتھ رکھ کر تالا لگا دیا اور مکان کی اوپری چھت پر چلی آئی جہاں شام کے اندھیرے ناگری کو اپنے سیاہ دامن میں سمیٹنے کے لئے بڑھے چلے آ رہے تھے۔ سامنے اٹھتا ہوا ناخنوں کا جوڑا فضا میں کھو گیا تھا اور قصبہ نما وادی کی پری کسی پرانی داستان کی سو سالہ نیند میں کھو گئی تھی۔ اس نے محسوس کیا جیسے ناگری کے کھیتوں میں جنگل اگ رہے ہوں۔ اس کا سارا سبزہ خاردار جھاڑیوں میں بدل جائے اور اوما خود ایک پرانے قصبہ میں محبوس اس خاردار جھاڑی کی گہرائیوں میں گم سو سالہ نیند سو گئی ہو جیسے زندگی اور مسرت نے موت کا زہر ہلاہل پی لیا ہو۔ خوبصورتی

WWW.PAKSOCIETY.COM
Scanned PDF

اس سو سالہ نیند سے کب بیدار ہوگی؟ زندگی زہراب کے اس خشک چشمے سے کب ہریالی پھوٹے گی؛ اور مسرت کس طرح اس خارزار کی ہلاکت آفرین لپیٹ سے بچ کر فضا میں پرواز کرے گی؟

یہ تھے وہ سوال جو اس کے شعور کو ڈستے چلے جا رہے تھے۔ ان کی داخلی اذیت سے بیقرار ہو کر اوما کی کنپٹیوں کی رگیں تڑپنے لگی تھیں۔

رگھوپور پر اب موسم خزاں اپنا زہریلا سانس اگل رہا تھا، درختوں کی ٹہنیوں سے پتے جھڑ رہے تھے۔ زرد، پژمردہ اور خشک پتے بے جان ہو کر راستے میں آپڑے تھے۔ گھاس کاٹی جا رہی تھی اور زمین اس بھیڑ کی طرح ٹھٹھرتی ہوئی دکھائی دیتی تھی جس کی ساری اون گڈریے نے تراش لی ہو۔ ماسٹر نور محمد کے مکان کے آنگن میں کھڑا ٹنڈ منڈ درخت خزاں پر ماتم کناں تھا۔ اوما کی بادامی آنکھوں میں آنسو چمکنے لگے۔ اس کی نگاہوں میں ایک دھند کی پھیلنے لگی اور اسی دھند کی سیاہی اور سفیدی میں پچھلے ہفتے کے تمام واقعات ایک ایک کر کے اجاگر ہونے لگے۔

کیشو رام کو آج آئے ہوئے تین دن ہوئے تھے اور اوما کی چھٹی حس اسے چیخ چیخ کے کسی ہونے والے حادثے سے باخبر کر رہی تھی۔

"رام جانے کاکا کو کیا ہو گیا"۔ اس نے سوچا اور شام کے دھندلکے میں اس راستے پر چل دی جو سیدھا اس کے گھر کی طرف جاتا تھا۔ دھان کے کھیتوں میں سے گزرتے ہوئے اچانک وہ سہم کر رک گئی۔ سامنے سے منشی مہنگا مل چلا آ رہا تھا۔

"رام رام کاکا"۔! اس نے منشی کو نمسکار کیا۔

"اوہ! اوما! کیسی ہو بیٹی نظر آنے سے بھی رہی"۔ مہنگا مل نے کھیتوں کے چاروں طرف پھیلے اندھیرے پر نظر دوڑائی۔

"کاکا! کاکا آ گئے کام سے کیا"؟

نہیں وہ تو آج بہت مصروف ہیں، شہر سے پنڈت جی آ رہے ہیں نا! گھر میں کچھ کام تھا تم ملو گی اپنے باپو سے کیا"۔ ایک شیطانی مسکراہٹ مہنگا مل کے ہونٹوں پر پھیل گئی۔ جانے کب سے

وہ اس موقع کی تلاش میں تھا۔

"کہاں ہے کاکا ۔۔۔؟

"ادھر قریب ہی وہ سامنے والی حویلی میں۔ آؤ چلو آؤ"!

اوما پہلے تو کچھ ہچکچائی لیکن باپ کی محبت اس ہچکچاہٹ پر غالب آ گئی اور دونوں حویلی میں داخل ہو گئے۔ مہنگا مل کی آنکھوں میں شہوت کی لالی اتر آئی تھی۔ وہ اوما کے شباب کا چوری چھپے اندازہ لے رہا تھا۔ جس کے لچکیلے بدن کا ہر بل اس پر نئی قیامت ڈھا رہا تھا۔ اس کا خوابیدہ سانپ میں ڈھلا جسم مہنگا مل کے تن بدن میں آگ لگائے دے رہا تھا۔ اور وہ شدت سے اس لمحے کا منتظر تھا جب وہ اس کا سارا شباب چوس لے۔

"وہ سامنے والے کمرے میں چلی جاؤ"۔ مہنگا مل نے سامنے بنے ہوئے کمرے کی طرف اشارہ کیا اور خود لاپرواہی کے انداز میں دوسری طرف مڑ گیا۔

کہاں ہے کاکا"۔۔۔ اوما نے چاروں طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"اپنے گھر میں مر رہا ہو گا"۔ اس کے پچھلی طرف دروازے سے مہنگا مل کھڑا تھا۔ ایک لمحے میں اوما کو سب کچھ سمجھ آ گیا۔ وہ تیزی سے مڑی۔

"کہاں جاتی ہو میری رانی"۔ مہنگا مل اس پر گرتے ہوئے بولا۔

"کتے کمینے حرام خور! میں تیری بیٹی ہوں"! اس نے دو چار کھے مہنگا مل کو جما دیئے۔

"گئو ماتا کی قسم کتنی حسین ہیں یہ کلائیاں"۔ اس نے اوما کے دونوں ہاتھ تھام لئے۔

اچانک سامنے کا دروازہ کھلا اور مہنگا مل نے گھبراہٹ میں اسے چھوڑ دیا۔ ان کے سامنے ایشر سنگھ کھڑا تھا۔

"کیا کر رہے تھے اپنی بیٹی کے ساتھ"؟ اس نے منشی کو ماں کی ایک موٹی سی گالی دے کر پوچھا۔

"بھیا! یہ ..... یہ یہ ..... حرامی مجھے کاکا سے ملانے لایا تھا"۔ اوما ہچکیاں لے لے کر

Scan by PDF WALA

رو رہی تھی۔

"چپ کر جا بہن"! ایشر سنگھ نے زمین پر گرا دوپٹہ اس کے سر پر رکھتے ہوئے کہا اور پھر منشی مہنگا مل پر لاتوں اور گھونسوں کی بارش شروع ہو گئی۔ پہلے تو وہ بزدلوں کی طرح مار کھاتا رہا اور پھر اٹھ کر بھاگ گیا۔

ادا کمرے کے ایک کونے میں دبکی پنجاب سے آتے ہوئے اس کسان لڑکے کو سہمی سہمی سے آہستہ آہستہ سسکیاں لیتی گھور رہی تھی جسے بھگوان نے اس کی عزت بچانے کے لئے عین موقع پر نہ جانے کیسے نازل کر دیا تھا۔

"جاؤ بہن آئندہ اس کمینے سے بچ کر رہنا" اس نے اپنی پگڑی کو سر پر مضبوطی سے باندھتے ہوئے کہا۔

ایشر سنگھ سردار گورمیت سنگھ کا لڑکا تھا جو ناگری ہی کا ایک زمیندار تھا لیکن پنڈتوں کی طرح امیر نہیں۔ یہاں اس کے والد کو انگریز فوج کی خدمات کے سلسلے میں زمین الاٹ ہوئی تھی اور وہ سب بھائی باری باری پنجاب سے کچھ عرصے کے لئے یہاں چلے آئے تھے۔ گورمیت سنگھ کو یہ جگہ کچھ ایسی پسند آئی کہ اس نے یہاں مستقل آباد ہونے کا فیصلہ کر لیا اور اپنے بیٹے ایشر کو بھی جس نے کاشتکاری میں گریجویشن کی تھی اپنے پاس بلا لیا۔ باپ بیٹا مل کر زمین کاشت کرتے۔ سیدھے سادے جاٹ تھے۔ کبھی کسی معاملے میں دخل نہ دیا۔ بس اپنے کام سے کام رکھتے۔ پنڈتوں نے انہیں اس لئے چھیڑنا کبھی مناسب نہ سمجھا کیونکہ وہ اس بات سے بخوبی واقف تھے نہ یہ سکھ ہیں اور سیاست کی بجائے ہاتھ سے زیادہ کام لیں گے۔ اس کے علاوہ انہیں مسلمانوں کی مکمل حمایت بھی حاصل تھی اور عدالتوں کے چکر بھی جانتے تھے۔

آج ایشر سنگھ ایک کام کے سلسلے میں پنڈت دوارکا داس سے ملنے آیا تھا اور یہ حویلی مہمانوں کے لئے مختص تھی۔ واپسی پر جب اسے ایک کمرے سے ایک نوجوان لڑکی کی چیخیں سنائی دیں تو اس کی مردانہ غیرت جاگ پڑی۔ اس بات سے تو وہ بخوبی آگاہ تھا کہ پنڈتوں کا یہ پرانا

نعرہ ہے اور اب تو یہ لہو انہوں نے اپنے لوگوں کے منہ کو بھی لگا دیا تھا۔ لیکن کم از کم اس کے لئے یہ بات ناممکن تھی کہ اس کی آنکھوں کے سامنے کسی بے بس مظلوم کی عزت لٹ رہی ہو اور وہ خاموش تماشائی بنا دیکھتا رہے۔

ایشر سنگھ ادا کو ماسٹر صاحب کے گھر تک چھوڑ گیا تھا اور اب وہ سب سے الگ تھلگ ایک کمرے میں بیٹھی روتے جا رہی تھی۔ اسے سمجھ نہیں آتی تھی کہ آخر بھگوان کو ان پر رحم کب آئیگا۔ اس کے کاکا نے اسے بتایا تھا کہ ظلم کبھی نہیں پھلتا۔ ماسٹر جی نے تعلیم دی تھی کہ ظالم زیادہ دیر تک خدا کے قہر سے نہیں بچ سکتا۔ لیکن آخر بھگوان ناگری پر قہر کیوں نہیں ڈھاتا۔ کیسا بھگوان ہے یہ؟ وہ سوچتی اور آنسو بہاتی رہتی۔

"سرکار آج تو غضب ہی ہو گیا۔" منشی مہنگا مل ہانپتے ہوئے پرکاش کو سنا رہا تھا جو آجکل چھٹی پر گاؤں آیا ہوا تھا۔ "بڑی مشکل سے اس چھوکری کو منایا تھا آپ کے حضور لانے کے لئے۔ وہ تو مہاراج قابو ہی نہیں آ رہی تھی۔ آخر اسے پکڑ میں لا کر آپ کی خدمت میں لا رہا تھا کہ وہ حرامی بکھڑا جانے ہماری حویلی میں کہاں سے آن ٹپکا اور مجھے مارنے لگا۔" پھر وہ دردی صورت بنا کر پرکاش کو اپنے جسم پر چوٹ کے نیل دکھانے لگا۔

پرکاش غصے سے کانپنے لگا۔ اسے غصہ اس بات پر نہیں آ رہا تھا کہ ان کے منشی کو کسی نے مارا ہے بلکہ غصے کی وجہ تو یہ تھی کہ آج ادا کو اپنے بستر کی زینت بنانے کا موقع ملا تھا۔ اور آج ہی یہ بدشگونی ہو گئی۔ جانے کب سے وہ منشی کو کہہ رہا تھا اس کے لئے۔ آج تو اس نے منہگا مل کو بہت غصے میں باہر نکالا تھا۔ آخر کب تک صبر کر سکتا تھا۔ آج رات ہر قیمت پر وہ اسے اپنے بستر کی زینت بنانا چاہتا تھا۔ پرکاش کو دیوانہ تو اس کی ایک جھلک نے کر دیا تھا۔ اس روز جب اس نے ادا کو دھان کے کھیتوں میں راشد سے ملتے دیکھا تھا۔ اس کے بعد تو وہ اسے کئی بہانوں سے چوری چھپے دیکھ چکا تھا۔

باوائی آنکھوں والی اس انچھوت چھوکری نے اس کی راتوں کی نیند حرام کر رکھی تھی اور وہ

بڑی شدت سے اس دن کا منتظر تھا کہ کب موقع ملے اور وہ اس گندمی رنگ کے لچکیلے جسم والی لڑکی کے جسم سے کھیلے اور اپنی شہوت کی بھڑکتی پیاس بجھائے۔ وہ اکثر لڑکیوں کے ساتھ اس ظالمانہ فعل کا ارتکاب کر چکا تھا اور کوئی بھی ہفتہ یا مہینے سے زیادہ اس کے پہلو کو نہ گرما سکی لیکن اوما کے متعلق تو اس نے فیصلہ کیا تھا کہ ہمیشہ اس لڑکی کو اپنی داشتہ بنائے رکھے گا۔

اسے رہ رہ کر اس سکھ لونڈے پر غصہ آ رہا تھا۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ ابھی جائے اور اس کی بوٹیاں نوچ ڈالے۔ لیکن وہ پرانا شاطر تھا۔ اسے اس بات کا بھی بخوبی علم تھا کہ یہاں معاملہ مسلمانوں یا اچھوتوں والا نہیں ہے کہ جس کو دل چاہا دبا لیا۔ یہ پنجاب کے سرپھرے جاٹ تھے۔ کہیں لینے کے دینے ہی نہ پڑ جائیں۔ اور پھر ایشر سنگھ کا باپ گورمیت سنگھ بھی کوئی معمولی آدمی تو تھا نہیں۔ آخر کو وہ بھی زمیندار تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ ان کا ہم پلہ نہیں تھا۔ بہرحال کوئی ایسی بات تھی ضرور جو اسے کسی بھی قسم کی غیر ذمہ دارانہ حرکت کا ارتکاب کرنے سے روک رہی تھی اور اسے انتقام کا کوئی اور راستہ اختیار کرنے پر مجبور کر رہی تھی۔

یہ کوئی معمولی بات تو تھی نہیں۔ آج تک کبھی ایسا ہوا ہی نہیں تھا کہ کسی برہمن زادے نے کسی اچھوت لڑکی کو اپنانا چاہا ہو اور اس نے چوں چراں کی ہو۔ اکثر لڑکیاں تو اسے اپنی قسمت کا لکھا سمجھ کر ہی قبول کر لیتی تھیں اور چپ ہو رہتیں۔

"منشی"۔

"جی مہاراج"۔

"جاؤ ہم اس سکھ کے بچے سے نمٹ لیں گے۔ اس کی یہ جرأت کہ ہمارے ملازم پر ہاتھ اٹھائے"۔

"دھنے ہو مہاراج! پرماتما آپ کا اقبال بلند کرے"۔ منشی جھنگا بولا باہر آ کر اس نے اپنی چھوٹی چھوٹی مونچھوں پر ہاتھ پھیرا اور خود ہی مسکرا دیا۔ کس خوبی سے اس نے اپنے گلے سے بلا ٹال دی تھی۔ کہیں اس کے مالک کو پتہ چل جاتا کہ وہ خود اوما کی عصمت دری کرنا چاہتا

تھا تو نہ جانے اس کا کیا حال کرتا۔ جھنگا مل نے خود کو جی ہی جی میں داد دی اور اپنے گھر کی طرف چل دیا۔

اور اوما اکیلی روتی رہی۔!

اس نے کسی کو کچھ نہ بتایا اور بتاتی بھی کس کو؟ اپنے باپو کو جو پہلے ہی نہ جانے اتنے ظلم سہہ کس طرح زندہ تھا۔ ماسٹر جی کو جنہوں نے پہلے ہی کتنے روگ پال رکھے تھے۔ محمد حسین کو جس کے اپنے دکھ ہی سمیٹتے نہ سمٹتے تھے اور اس سنسار میں اس کا تھا بھی کون۔ بھگوان! لیکن اپنے بھگوان پر سے تو اس کا ایمان کبھی کا اٹھ چکا تھا۔ اس کا بھگوان اگر کسی قابل ہوتا تو نوبت یہاں تک پہنچتی کیسے۔ کبھی کا سب کچھ ختم نہ ہو گیا ہوتا۔

اپنڑ بالم پردیسواری سجنی جیارا دھڑت نہ ہی دھیر
تال میں چمکت چال مچھریا
کرن چمکے تلوار
سبھا میں چمکیں پی کی پگڑیا
ماتھے پہ بندیا ہمار
اپنڑ بالم پردیسواری سجنی جیارا دھڑت نہ ہی دھیر

ساتھ والے مکان سے رنگو مل کے گانے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ ہارمونیم کے سُر اس کے من پر آری سی چلا رہے تھے۔ جانے کس کرموں جلی کا بالم پردیسوا چلا گیا تھا اور اس نے یہ فریاد کی تھی۔ اس کا بالم بھی تو پردیسی ہی بن کر رہ گیا تھا اس کے لئے۔ کانپور کتنی دور تھا۔ وہاں سے صرف چالیس میل لیکن یہ چالیس میل کا سفر بھی چالیس صدیوں کی مسافت بن کر رہ گیا تھا اس کے لئے۔ آج اسے راشد بہت شدت سے یاد آ رہا تھا۔ آج اگر راشد یہاں ہوتا تو کم از کم وہ اس کے سامنے اپنا دل تو کھول کر رکھ دیتی۔

اس روز شام کے بڑھتے ہوئے سایوں میں راشد نے گومتی کے کنارے بنے ہوئے باغ

Scan & PDF WAQAR AZEEM

کے مشرقی ٹیلے پر جہاں سے سیڑھی سڑک ناگری کو جاتی تھی۔ بیٹھے ہوئے محسوس کیا۔ جیسے وہ آج اکیلا نہیں ہے جیسے ادما اب بھی اس کے ساتھ ہے۔ وہ اس کے مدھم شہد آگیں ماس کو اب بھی اپنے ماتھے پر محسوس کر رہا تھا۔ اس کی حنائی انگلیوں کے لمس سے اس کے دل کے دیوان میں گلاب کے لاتعداد پھول کھل رہے تھے۔ یہ مہکتی ہوئی فضا، یہ گومتی کا ترنم خیز پانی، یہ کنول کے خمار آگیں پھول ادما کی سحر انگیز ہنسی کی لے پر کانپ رہے تھے۔ تمنا ری کے لاکھوں سفید پھول اس بیل سے اڑ اڑ کر آسمان کی طرف جا رہے تھے اور انہوں نے رات کے سیاہ جوڑے میں ایک تاروں بھری کہکشاں بنا ڈالی تھی۔ کائنات کے ذرے ذرے میں زندگی کے کونے کونے میں — روح کے گوشے گوشے میں وہ آج ادما کے لطیف لمس کا احساس کر رہا تھا اور اس کا دل کسی نامعلوم خوف، کسی نامعلوم خوشی، کسی نامعلوم حسن کے احساس سے لرزنے لگا۔

ادما جو رعونت تھی — نغمہ تھی۔

جب وہ اپنی سیدھی مانگ نکال کر اپنے لمبے سیاہ اور سیدھے بالوں کو پیچھے کو سمیٹ لیتی تھی تو وہ ڈوچ فنکاروں کی تخلیق بن جاتی تھی۔ وہ ایسا کردار تھی جو اماداس کی پُراسرار کالی راتوں میں دنیا کی گونج اور دھمک کے ساتھ یک بیک جاگ پڑے جس کے نقوش سارناتھ کی دیواروں پر کندہ تھے۔ اسے دیکھ کر یوں لگتا تھا جیسے جلتی ہوئی لو جس کی سرخ پرچھائیاں آنکھوں میں لگتی چلی جاتی ہوں۔ وہ سوچتا رہا۔ پھر اٹھ کھڑا ہوا۔

کالج روڈ سے گاندھی چوک اور وہاں سے رنگا کھلی — "کافی ہاؤس" نہیں "تاج محل" نہیں تو پھر کہاں مروگے؟" — "مے فیئر" — !

اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ رنبیر "مے فیئر" ہی جائے گا کیونکہ ڈمپل وہیں اسے نظر آئے گی۔ امریکن کار کی نچلی نیتوں جیسا چشمہ لگانے والی ڈمپل، جسے رنبیر سے صرف اتنی دلچسپی تھی کہ وہ اس کی تصویر بڑے آرٹسٹک انداز سے بنا سکتا تھا — اور بس!

"مے فیئر" میں بن جانسن کا وہ پرانا نغمہ "جولیا سے" جو وہ جانے کتنی مرتبہ کالج میں سن چکا تھا

سن رہا تھا۔

"میرے لئے پیالے میں صرف ایک پیار چھوڑ دو اور مجھے شراب کی ضرورت نہ رہے گی۔ روح کی گہرائیوں میں سے پیدا ہونے والی تشنگی جس کے لئے کسی آسمانی الوہی مے کی خواہش ہوتی ہے۔ اگر مجھے اس کے لئے مقدس خداؤں کا امرت بھی ملے تو میں اس ایک پیالے کو اس سے تبدیل نہ کروں گا۔"

ریکارڈ ختم ہو گیا تال کے ساتھ فرش پر ادھر سے ادھر تھرکتے اور اس نغمے کے ساتھ آواز ملا کر آہستہ آہستہ گنگناتے جوڑے اپنی اپنی جگہ پر بیٹھ گئے۔

کافی کے دو پیالے تھامے وہ دونوں ایک میز کے گرد بیٹھے اس مرتی مارتی لڑتی جھگڑتی اور شور مچاتی ہوئی دنیا میں خود کو تنہا محسوس کر رہے تھے — دونوں ایک دوسرے کے لئے کچھ محسوس کر رہے تھے۔ غالباً محبت، ہمدردی، ذہنی رفاقت اور نہ جانے کیا کیا؟ رنبیر کافی کی پیالی میں چمچہ ہلانے لگا اور راشد نے قریب پڑا "آؤٹ لک" کا تازہ پرچہ اٹھا لیا اور اس کی ورق گردانی شروع کر دی۔

"یہ فلاں شخصیت کا کارٹون ہے۔ یہ مس فلاں کا پورٹریٹ ہے۔ فلاں کی عزت فلاں نے لوٹ لی۔ فلاں پارٹی کے لیڈروں کا گروپ فوٹو، گاندھی جی کا اپیل۔ احمق شکل کے حرام خور اور ان کی خوبصورت دلہنوں کی تصویریں۔ یہ بیچارے لوگ — یہ بیچاری دنیا یہ بیچاری زندگی!

اس نے پرچہ دوبارہ میز پر رکھ کر سگریٹ سلگا لیا صرف ایک لمحے کے لئے اس نے سوچا۔

اس وقت میرے سامنے کوئی مستقبل نہیں ہے۔ میرے پیچھے کوئی ماضی نہیں۔ احساس ہے تو صرف اس بات کا کہ وادیوں میں بہار کے پہلے سفید پھول کھل رہے ہیں اور بارش کی بوندیں اپنی جلترنگ سنا رہی ہیں۔ آؤ ہم سب اس طرح چپ چاپ بیٹھے رہیں — یہ رات کبھی ختم نہ ہوگی۔ پھولوں کی خوشبو ہوا میں اڑ رہی ہے۔ مجھے اس لمحے سب کچھ بھول جانے دو۔ بھول

WAQAR SCANNED BY

جانے دو کہ اس تھکے ہارے جیون میں بہت دکھ ہیں۔ بڑی بڑی پشیمانیاں ہیں ۔۔ جنم جنم کے کبھی نہ بہہ سکنے والے آنسو ہیں ۔۔ تم پیارے آرٹسٹ اس شہر میں روحیں ڈھونڈتے رہے یہ یہاں صرف صندلی جسم ہیں۔ جسم ہی جسم کھوکھلے ایک دم کھوکھلے ۔۔ اور پیارے آرٹسٹ یونہی چپ چاپ بیٹھے ڈمپل کو گھورے جاؤ جو اپنے منگیتر کے ساتھ ناچ رہی ہے۔ اس کے ہونٹوں نے اسے نئی ساڑھی لاکر دی ہے جو اس نے پہن رکھی ہے ۔۔ اس کو بھورا بال نے پیرس سے جو اس کا ہار منگوا کر دیا ہے جو اس نے پہن رکھا ہے ۔۔

تم بہت عظیم انسان ہو !!

بہت ہی پیارے ہو !!

بہت ہی اُلّو کے پٹھے ہو !!

ڈمپل کے عاشق ہو لیکن تمہارے باپ نے بھی کبھی بمبئی نہیں دیکھی ۔۔!

بس تم بچے عاشقوں کی طرح ٹکٹکی باندھے اسے گھورے جاؤ تاکہ ہم تیزی سے نکلتے ہوئے وقت کی پرواز کو روک کر فضائے بیکراں کی وسعتوں کے اس گونجتے ہوئے سناٹے میں کھو جائیں ۔۔ اور کچھ یاد نہ رہے ۔۔

لیکن ایسا نہیں ہوگا ۔۔!!

رات بہت جلد ختم ہو جائے گی۔ تم اک گیت سے جو ابھی بڑی شگفتگی سے گایا جا رہا تھا بہت جلد اکتا جاؤ گے اور اک اور دن طلوع ہوگا ۔۔ طویل اور بے رنگ اور اس کی چلچلاتی ہوئی روشن بدصورتی سے کہیں پناہ نہ مل سکے گی۔ کہیں بھی نہیں۔

اگلے روز وہ ناگری چلا آیا ۔۔!

ندی کے کنارے کنارے وہ دھان کے کھیتوں میں سے گزرتا ہوا اس راستے کی طرف چل دیا جہاں بڑے بڑے درختوں کی اوٹ میں دھرمسالہ تھا جہاں ایک اونچے مندر کی چوٹی کے نیچے باہر چند پتھر کی مورتیاں ایک بڑے درخت کے نیچے پوجا کو رکھی ہوئی تھیں۔

دھرمسالہ کے دوسری طرف پتلوں کے باغات میں بستی کے اچھوت مرد و عورتیں کام کر رہے تھے جن کے چہروں پر پوشیدہ حسرتیں اور نا آسودہ آرزوئیں مچل رہی تھیں۔ ان میں بہادری بھی تھی، مضبوطی بھی اور ڈر اور خوف بھی تھا۔ اس نے اُن سب کے چہرے پر ایک ناپسندیدہ ہی حسین خواب کا پرتو دیکھا جس نے ان سب کو الگ الگ صورتیں ہوتے ہوئے بھی ایسے کر دیا تھا جیسے وہ سب ایک ہی دھرتی کے بیٹے ہوں۔ ایسا ہی حسین خواب اس نے بھی ایک بار دیکھا تھا۔ آج سے کئی سال پہلے جب ادما اور وہ بہت چھوٹے چھوٹے ننھے ایک دم بچے ۔۔!!

اس نے سوچا تھا وہ پڑھ لکھ کر بہت بڑا ڈاکٹر بنے گا اور ایک روز ادما کو بیاہ کر لے جائے گا۔ اور آج اس کا خواب شرمندہ تعبیر ہونے میں مدت ہی کتنی رہ گئی تھی صرف سات دن ہاں صرف سات دن ہی تو تھے۔ اس کے بعد وہ ڈاکٹر ہوتا ۔۔ اور پھر تمام سنہرے سپنے ایک ایک کر کے حقیقت کا روپ دھار لیتے ۔۔!! اس نے سوچا انسان کتنا عظیم ہے !

جو پہلے اس خواب کو کتاب کے ایک ورق پہ تصویر کی ایک جھلک میں، سپنے کے کسی افق پہ جھلملاتے دیکھتا ہے ۔۔ اور پھر اپنی زندگی کی ساری کاوشوں سے اس سنہرے خواب کو دھرتی پر تعبیر کرنے لگتا ہے۔ حتیٰ کہ تاج محل وجود میں آجاتا ہے ۔۔ ایفل ٹاور بن جاتا ہے نیپر کا بند کھڑا ہو جاتا ہے اور کھیتوں میں ٹریکٹر چلنے لگتے ہیں۔ ندی نالوں کے رُخ، پہاڑوں کے گوشے، ہواؤں کے مزاج بدل جاتے ہیں۔ انسانوں کی محنت سے اک نئی دنیا، اک نیا جہان اور اک نیا سماج جنم لیتا ہے۔

گھر میں داخل ہوتے ہی اس کی آنکھوں نے سب سے پہلے ادما کو دیکھا۔ ہاں یہ وہی تھی جس کے لیے سیدھے سیاہ بال اور بادامی آنکھیں کسی ڈیچ فنکار کی تخلیق تھیں ۔۔ جس کا میلا دونا کا سا ارمنی چہرہ تھا۔ جسے دیکھ کر اس کے دل کی دھڑکن تیز ہو جاتی تھی اور یوں لگتا تھا جیسے کہیں آگ بھڑک اٹھی ہے یا کہیں ساز ناتھ کے اندھیرے مندر میں تیز سرخ، روشن، جاندار اور مخملیں گلاب

Scanned with CamScanner

جگمگا رہے ہیں۔ اس کے ہونٹ ہمیشہ ہی اتنے سرخ رہتے تھے۔

یہ وہ تھی جو اپنی الف لیلوی دنیا کے محرابوں سے نکل کر دفعتاً زندگی میں اس کے سامنے آگئی تھی۔ اس دنیا میں سے جس کی داستانیں گومتی کنارے جامنوں کے سائے میں بندھی ہوئی کشتیوں میں بیٹھے بوڑھے ملاح آج بھی اجنبی مسافروں کو سنایا کرتے ہیں ــــ وہ تو ایسے جانتا تھا ــــ ازل سے ــــ ان آنکھوں کی گہرائیوں کو پہچانتا تھا جو کہتی تھیں ــــ ہم تو کائنات کے سارے اسرار جانتی ہیں۔

"ادما" اس نے کھڑکی سے باہر کی سمت دیکھتی ہوئی ادما کے کندھے کو آہستہ سے تھپتھپایا۔

"راشد بابو"!

اور وہ بے اختیار اس سے لپٹ گئی۔ اس کے تمام بدن پر کپکپاہٹ طاری تھی۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے اسے سرسام ہو گیا ہو ــــ!

"ادما! کیا بات ہے! کیا ہو گیا تمہیں" ــــ! اس نے ادما کو سیدھا کرتے ہوئے بچوں کی طرح پوچھا۔

ادما کی خوبصورت آنکھوں سے آنسو بے اختیار جاری ہو گئے۔ وہ اس کے سینے سے لگ کر سسکنے لگی۔ وہ اس طرح اس سے پہلے کبھی نہیں روئی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے اس کے سینے میں، اس کے دل میں، اس کی روح کی گہرائیوں میں سال ہا سال تک یہ آنسو منجمد ہوتے رہے تھے۔ اک برف کی سل بن کر اس کی شخصیت کی تہوں میں سما گئے تھے اور بہہ نہ سکے۔

لیکن آج۔ آج تو جیسے وہ برسوں کی برف وہ صدیوں کے منجمد آنسو، برق تپاں کے لمس سے اس کے سینے میں، اس کے دل میں، اس کی روح کی پہنائیوں میں پگھلے جا رہے تھے ــــ اور وہ اپنے محبوب کے سینے سے لگی سسک رہی تھی۔ رو رہی تھی۔ اس نے اپنی مسکراہٹ بیکار سمجھ کر ہمیشہ کے لئے اتار پھینکی تھی۔ اور اپنی غریب اور بے کس زخمی زندگی کو اپنے محبوب کے سامنے ننگا کر دیا تھا۔

"کیا ہوا ادما" راشد نے حیرانگی اور دکھ سے پوچھا۔

لیکن ادما روتی رہی۔ اس نے اسے کچھ نہ بتایا۔ راشد نے اپنا ہاتھ اس کے سر پر رکھا اور اپنی انگلیوں سے اس کے بالوں میں کنگھی کرنے لگا۔ آخر ادما کے آنسو تھمے اور اس نے آہستہ آہستہ رک رک کر سسکیوں کے درمیان پچھلے تمام واقعات بیان کر دیئے۔

جب وہ اپنی حکایتِ غم سنا رہی تھی تو راشد کی حیات بدل رہی تھیں جیسے کسی غیر متعولی کیمیائی عمل نے زندگی کی ساری مسرتوں کو جلا کر راکھ کر دیا ہو۔ اس راکھ کا ذائقہ وہ نہ صرف اپنی زبان پر ہی محسوس کر رہا تھا بلکہ اس کی نظریں بھی اب اسے ہر چیز بدلی بدلی نظر آ رہی تھی۔ "ناگری" کی کھلی ہوئی دھوپ اسے یوں لگتی جیسے کسی نے ننگے جسم پر بھبھوت مل دیا ہو۔ بلبل کے شیریں نغمے کو جیسے کسی نے جلا کر راکھ کر دیا تھا۔ جیسے کسی نے آنکھوں، کانوں، خون، دل اور روح کے گوشے گوشے میں راکھ جھونک دی ہو اور وہ نہ کچھ پرکھ سکتا تھا نہ ہی کچھ سن سکتا تھا۔

اس حکایتِ خونچکاں کے اختتام پر اس کی آنکھیں کبوتر کی طرح سرخ ہو گئیں۔ یوں جیسے وہ آنکھیں ابھی لہو رو دیں گی ــــ اس کا سانس تیز تیز چلنے لگا۔ پھر اس نے اپنی آنکھیں آہستہ سے بند کر لیں اور ادما کو اپنے سینے سے لگا کر کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔

"چند دنوں کی بات ہے ادما! صرف چند دنوں کی۔ جیسے تیسے بھی صرف چند دن جی لو ــــ اس کے بعد یہ پنڈت تو کیا ان کا بھگوان بھی ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکے گا"۔

اس لمحے جب وہ دونوں الگ ہو رہے تھے کواڑوں کے پیچھے لال چہرے اور سفید ڈاڑھی والا ماسٹر نور محمد چھپکا کر رہ گیا۔

"خدایا! یہ سب کیا ہو گیا ہے! کیا تاریخ ایک بار پھر اپنے آپ کو دہرائے گی"!

ان کی آنکھوں میں اپنے بچپن کا وہ واقعہ گھوم گیا جب ایک برہمن لڑکی ایک نوجوان مسلمان کے ساتھ بھاگ گئی تھی اور براہمنوں نے مسلمانوں کی تمام بستی پھونک ڈالی تھی۔ پھر یہ فساد سارے شہر

WAQAR
Scan by PDF

میں پھیل گیا تھا ۔ سات دن تک گولیاں چلتی رہی تھیں۔ فساد ہوتا رہا تھا۔

ہر طرف آگ سی بھڑک اٹھی تھی۔ برہمن ایک ایک مسلمان بچے کو قتل کر دینے پہ تلے ہوئے تھے۔ بڑی مشکل سے گورا فوج کی ایک پلٹن نے آکر قابو پایا تھا۔ قصبے بھر میں نہ جانے کتنے معصوم اس محبت کی بھینٹ چڑھ گئے تھے۔

کیا پھر وہی فساد۔ وہی لوگ وہی خون "نہیں نہیں! کم از کم میری زندگی میں تو یہ ناممکن ہے" انہوں نے زیر لب دھرایا اور باہر چلے آئے۔

ادما سے ماسٹر صاحب کو اپنے بچوں سے بھی زیادہ پیار تھا ان کے لئے یہ ناممکن تھا کہ اسے خود سے الگ کر دیتے۔ ان کے دل میں فوراً یہ خیال آیا تھا کہ کیشو رام کو اس کی امانت سونپ دی جائے اور اب وہ اس سے صاف صاف کہہ ڈالیں کہ وہ امانت کا یہ بار اٹھانے کے قابل نہیں رہے۔

لیکن اُس غریب کا آخر ہے کون؟

پھر ادما کا کیا بنے گا؟

براہمنوں سے اس کی عزت کیسے بچے گی؟ اور اگر ان دونوں نے ایک ہونے کا فیصلہ کر ہی لیا ہے تو کیا وہ انہیں اس ارادے سے باز رکھ سکتے ہیں؟

یہ تھے وہ سوالات جو رہ رہ کر اس بوڑھے آدمی کو پریشان کئے دے رہے تھے۔!!

"مولا! تو ہی رہنمائی فرما"۔

جب کوئی بھی راستہ نظر نہ آیا تو انہوں نے خدا پہ ہی ڈوری چھوڑ دی۔

"ادما! بس ایک ہفتہ بعد مجھے ڈگری مل جائے گی۔ پھر ہم شادی کر لیں گے۔ سسٹر مرسی نوک کی بمبئی میں بہت بڑی افسر ہے وہ مجھے وہیں ملازمت دلا دے گی۔ اتنے بڑے شہر میں بس کو ضرورت ہو گی کہ ہمیں جانتا پھرے۔ بس وہیں اپنی ننھی سی الگ تھلگ دنیا بسا لیں گے پھر تمہارے باپو کو بھی ایک روز منا کر ساتھ لے جاؤں گا!"

بظاہر تو یہ بڑی معمولی سی باتیں تھیں لیکن ان کی سنگینی کا احساس ادما کو خوب تھا۔ وہ جانتی تھی براہمنوں کی اس نگری سے اتنا سا سکھ مانگنے کی کیا قیمت دینی پڑے گی۔

لیکن اس لمحے وہ کچھ سوچنا نہیں چاہتی تھی۔ وہ ان حسین لمحوں کو ایسی ناخوشگوار سوچوں کی نذر کرنے کی روادار نہیں تھی۔ اسے یہی چند لمحے تو زندگی کی مکمل ترین رعنائیوں کا احساس دلایا کرتے تھے۔ ورنہ دن رات اس کے ننھے سے معصوم دل پہ یہی ناگوار سوچیں تو سوار رہا کرتی تھیں۔ زندگی ملتی ہے تو سراب ہی سب کچھ ہو جاتے ہیں۔

دونوں مستقبل کے سہانے سپنوں میں کھوئے رہے اور رات چپ چاپ اپنا دامن سمیٹتی رہی۔

دھرمسالہ کے قریب سے گزرتے ہوئے اس کو سامنے سے آتے ہوئے منشی مہنگا مل اور پرکاش نے دیکھ لیا تھا لیکن وہ ان دونوں سے بے خبر امیر سنگھ کے کنوئیں کی طرف اس سے ملنے جا رہا تھا۔!

"یہی ہے مہاراج وہ ملیچھ جس نے جانے چھوکری پہ کیا جادو کر رکھا ہے کہ ہر سمے اسی کے گن گایا کرتی ہے"

"حرامی" پرکاش نے زیر لب راشد کو دو تین گالیاں بکیں۔ اس کی آنکھوں میں خون اتر آیا تھا اس کا جی چاہتا تھا اس ملیچھ کا گلہ گھونٹ دے۔

"بلاؤ اسے" اس نے منشی کو حکم دیا اور خود ایک درخت کی اوٹ میں کھڑا ہو گیا۔ اس کے بلانے سے قبل ہی وہ اس کے سامنے آن کھڑا ہوا۔

"کیا بات ہے پنڈت جی" راشد نے تمسخرانہ انداز میں پوچھا۔ اور براہمن کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔

"تم جانتے ہو تم کیا کر رہے ہو" قہر کا دیوتا پھنکارا جیسے اسے بھسم ہی کر ڈالے گا۔

"جانتا ہوں" اطمینان اور سکون سے جواب دیا گیا۔

"اس کا انجام بھی جانتے ہو" دھمکی آمیز لہجے میں اسے انجام کا احساس دلایا گیا جیسے اب تک وہ

SCAN BY PAKSOCIETY.COM

بے خبری ہی میں مبتلا تھا۔

"جانتا ہوں" لہجے کا سکون بدستور برقرار تھا۔

"تمہیں کیا حق ہے ہمارے گاؤں کی ایک لڑکی کو خراب کرتے پھرو؟" — !! غصّے سے پھنکارتے ہوئے پوچھا گیا۔

"آپ کو مجھ سے اس لہجے میں بات کرنے کا حق کس نے دیا" ترکی بہ ترکی جواب ملا۔

"پنڈت جی! یہ مت بھولئے معاشرے میں میرا بھی ایک مقام ہے۔ میں کوئی گرا پڑا اچھوت نہیں جو آپ کی دھمکیوں سے مرعوب ہو جاؤں گا۔ میں نے اوما سے محبت کی ہے اور زندگی کے آخری سانس تک کرتا رہوں گا۔ آپ تو کیا آپ کا سارا سماج بھی میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتا — یہ نہ اخلاقی جرم ہے نہ قانونی۔ مجھ پہ تعزیراتِ ہند کی کوئی دفعہ لاگو نہیں ہوتی۔ رہی آپ کے دھرم کی بات تو آپ یہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ آپ کا دھرم کیا ہے؟ آپ ایک لڑکی کو اپنی ہوس کا نشانہ بنانے کے لئے اپنے آباؤ اجداد کی صدیوں پرانی گندی اور بے ہودہ رسم کو توڑ کر ایک اچھوت لڑکی کو اپنے دھرم کا حصّہ بنانے پہ تلے ہوئے ہیں۔ اس کے متعلق اپنے پورانوں کا حکم آپ خود جانتے ہیں۔ ان بیچاروں کو تو آپ کے بھگوان کی عبادت کرنے کا بھی حق حاصل نہیں۔ ان کا مذہب سوائے آپ کی غلامی کے اور کچھ نہیں ہے۔ اوما آزاد دیش کی آزاد لڑکی ہے۔ اسے ہر وقت یہ حق حاصل ہے کہ اپنی زندگی کے متعلق کوئی فیصلہ کر سکے۔ وہ کوئی دودھ پیتی بچی تو ہے نہیں۔ اور نہ ہی آپ کی بہن ہے کہ آپ اس کی فکر کرتے پھریں۔"

اس کا لہجہ اشتعال انگیز ہو گیا تھا۔ نفرت کا وہ لاوا جو اس کے سینے میں ان وحشیوں کے خلاف نہ جانے کتنی دیر سے پک رہا تھا۔ آج آتش فشاں بن کر پھٹ جانا چاہتا تھا۔ اس کا جی چاہتا تھا اس ذلیل براہمن کا گلہ گھونٹ دے جو اس کی اوما پر اپنا حق صرف اس لئے جتا رہا تھا کہ اس کا باپ اس کا مالازم تھا۔ صدیوں سے وہ ان غریبوں کے اَن داتا بنے بیٹھے تھے۔

"شٹ اپ —" پرکاش آخری فقرے پر چیخ اٹھا "کتے کمینے ذلیل —" وہ غصّے سے

ہانپنے لگا۔ "تمہیں اس گستاخی کی ایسی سزا ملے گی کہ آنے والی نسلیں بھی یاد رکھیں گی" وہ غصّے سے سر پیٹتا چلا گیا۔

"کیشو رام" — پرکاش نے اپنے سامنے کھڑے کیشو کو گھورتے ہوئے کہا۔

"مہاراج" — کیشو نے دونوں ہاتھ جوڑ دیئے جیسے اس کے حکم پہ حاضر کیا گیا تھا۔

"اپنی لونڈی کو لگام دو وہ اس ملیچھ کے ساتھ رنگ رلیاں منانی پھرتی ہے۔ ہم گاؤں کی عزت مٹی میں ملتی نہیں دیکھ سکتے" !!

کیشو رام کانپ کر رہ گیا۔ اس کی لڑکی کی عصمت پہ الزام لگایا جا رہا تھا۔ اس کے سارے جسم میں چنگاریاں سی پھوٹنے لگیں۔ اس کا جی چاہا کہ اس براہمن زادے کا گلہ اتنی زور سے دبائے کہ اس کی آنکھیں پھٹ جائیں اس کی زبان کو کاٹ کر باہر پھینک دے۔

لیکن وہ کچھ نہ کر سکا۔ چپ چاپ باہر چلا آیا۔ اس کا جی بھر آیا تھا۔ اپنی اس بے عزتی پہ وہ چیخ چیخ کر لوگوں کو سب کچھ بتا دینا چاہتا تھا کہ کس طرح اس ذلیل براہمن نے اس کی شبنم کے مقدس قطرے کی طرح پاکیزہ لڑکی پہ الزام تراشی کی ہے — پہ وہ بتائے کس کو؟ کس کے سامنے فریاد کرے؟

اس کی بے بسی آنسوؤں کے راستے اس کی آنکھوں سے بہہ نکلی۔

کیشو رام سیدھا ماسٹر صاحب کے گھر آیا تھا! اوما نے رو رو کر برا حال کیا ہوا تھا۔

"کاکا! رام قسم میں بالکل پاک ہوں۔ ان چھوئی کلی کی طرح۔ اگر محبت کرنا پاپ ہے تو لوگ بھگوان سے کیوں محبت کرتے ہیں۔ میں نے پیار ضرور کیا ہے لیکن تیری عزت پہ حرف نہیں آنے دیا اور نہ کبھی جیتے جی آنے دوں گی۔ کاکا! تو میرا گلہ گھونٹ دے۔ مجھے جان سے مار دے پہ بھگوان کے لئے اس کمینے پنڈت کی بات کا یقین نہ کر وہ حرامی تو تیری عزت سے کھیلنا چاہتا ہے۔ کاکا! تو مجھے مار ڈال لیکن یہ نہ کہنا کہ رادھا کو بھول جاؤں"

"چپ کر جا میری بیٹی۔ بس چپ کر جا" کیشو رام نے رام پیاری کی نشانی کو خود سے

WAQAR
Scan & PDF

چنا لیا۔ وہ تو اس کے معمولی دکھ پہ تڑپ اٹھتا تھا۔ اس نے تو کبھی اپنی بیٹی سے پینے کو پانی نہیں مانگا تھا۔ وہ اس سے اتنی بڑی قربانی کیسے مانگے ۔۔۔ اسے کیسے کہے کہ راشد کو بھول جا۔ راشد اس کی کوئی بھول تو نہیں تھی۔ وہ تو اس کی بیٹی کی محبت تھا! محبت چٹان جیسا مضبوط جذبہ جو سارے سنسار سے ٹکرا جانے پہ تلا ہوا تھا۔

کیشو رام نے دل ہی دل میں فیصلہ کر لیا۔ اپنی ساری زندگی کی کمائی راشد کو سونپ دینے کا۔ وہ اپنے اس فیصلے کے انجام سے بخوبی آگاہ تھا جو سوائے موت کے اور کچھ نہیں تھا۔ برہمنوں کو چھوڑ خود اس کے اپنے بھائی بند بھی اسے مار ڈالتے۔ ان کے دھرم کی اس طرح بے عزتی کی جائے وہ کبھی برداشت نہ کر پائیں گے۔ لیکن وہ تو ان تمام باتوں سے بے نیاز ہو چکا تھا۔ وہ تو چاہتا تھا کہ رام پیاری کے سامنے شرمسار نہ ہو۔ ! وہ رام پیاری کی اس انمول نشانی کا دل توڑ کر بھی کب زندہ رہ سکتا تھا!

"ہم تو سیدھے سادے جاٹ ہیں بھیا جسے زبان سے بھائی کہہ دیں اس کے لئے سب کچھ تیاگ دیتے ہیں ۔۔۔ یہی ہمارے دھن گورو کا اپدیش ہے۔ اوما کو اس روز بہن کہا تھا اور ہم نہیں آج بھائی۔ جاؤ میرے جیتے جی! فکر سے آزاد ہو جاؤ۔ طاقت سے تو یہ پنڈت تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا اور سیاست کی مار سے تمہیں دگھور دیچا بادشاہ آپ بچا لے گا" ایشر سنگھ بولا۔

"بھیا!" راشد عقیدت و محبت سے رندھی ہوئی آواز میں اس سے آگے کچھ نہ کہہ سکا جب الفاظ کھو جائیں تو آنسو ہی زبان بن جایا کرتے ہیں۔ بس اس کی آنکھیں فرط عقیدت و محبت سے چھلک پڑیں۔

وہ ایشر سنگھ کے پاس اس کا شکریہ ادا کرنے آیا تھا اور کافی دیر تک دونوں آپس میں باتیں کرتے رہے، پھر ایشر سنگھ نے اسے تسلی دلا کر واپس بھیج دیا۔

اُس رات!

وہ بوڑھے انسان دو نوجوان دلوں کو جوڑنے کا عہد کر رہے تھے۔ جس کام کا بیڑا انہوں نے اٹھایا تھا وہ بظاہر آسان نظر آ رہا تھا لیکن اس کی سنگینی سے دونوں بخوبی آگاہ تھے۔

"ماسٹر جی کوئی شبھ گھڑی دیکھ کر مجھ ناچیز پہ یہ آخری احسان بھی کر ڈالیے۔ اس کے بعد آپ کو کبھی تنگ نہ کروں گا" کیشو رام نے اپنے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔

اُسی رات دوسری طرف پنڈت دوارکا داس کے گھر بھی محفل جمی ہوئی تھی وہاں لگ بھگ پچیس تیس "معزز برہمن" جمع تھے جنہیں پنڈت دوارکا داس نے ایک ضروری معاملے پر بات چیت کے لئے مدعو کیا تھا۔ ان میں لالہ لبھا رام، رام بھاشی رام، مست پرکاش، مہیش چند، اگم چند اور دیپک رائے سنتوش بھاٹیہ، سالگ رام، کونڈو مل وغیرہ سب ہی شامل تھے۔ یہ لوگ اپنی سانولی بلکہ اکثر حالتوں میں کالی رنگت، مکار قسم کی لمبی ناک اور مسکین لہجے سے بخوبی پہچانے جاتے تھے۔ آواز ریشم کی طرح ملائم لیکن ہر فقرہ ذو معنی دو دھاری تلوار جو دونوں اطراف سے کاٹ کرے۔ ان سب کے آپس کے ذہنی توازن نے ہی تو ان حرامیوں کو اتنا امیر بنا ڈالا تھا کہ یہ لوگ اپنی قومی خصوصیت کسی حال میں بھی چھوڑنے کو تیار نہ ہوتے تھے۔ ان سب کے سر پہ پگڑیاں مڑی ہوئی تھیں اور بھدے ہاتھوں کی انگلیاں سونے کی بیش قیمت لال رنگ کے نگینوں والی انگوٹھیوں سے آراستہ تھیں۔ ایک دو کے پاس سونے کی بیش قیمت جیبی گھڑیاں بھی تھیں جن کے ساتھ سونے کی زنجیر بھی لٹک رہی تھی اور وہ بار بار انہیں وقت دیکھنے کے بہانے نکال رہے تھے۔ گھڑیوں کے علاوہ اکثر کے ان کی موٹی توندوں نے بھی دوسروں سے ممتاز کر رکھا تھا۔

چند نمائندے سناتن دھرمی سکھوں کے بھی تھے جو بے پیندے کے لوٹے کی طرح ہوا کا رخ دیکھ کر پھر جایا کرتے تھے۔ گرودوارے میں واہگورو واہگورو کر لیا اور مندر میں شو جی کو پوج لیا۔ سردار نرمل سنگھ، پرتاب سنگھ وغیرہ ان میں نمایاں تھے۔ ناگری کے ساتھ ہی واقع موضع چوپانی سے بھی کچھ لوگ آئے تھے۔ پنڈت وساکھی رام، وشو امتر وغیرہ آج حجامت بنوا کر نئی قمیصیں پہنے ماتھے پر چندرا اور تلک لگائے اور گلے میں مالا ڈالے آلتی پالتی مارے سامنے براجمان تھے۔

دراصل یہ سب لوگ تھے یا بہت بڑے بڑے زمیندار دھرم شاستروں کو خاک بھی نہ سمجھ پاتے تھے چونکہ صدیوں سے برہمن چلے آ رہے تھے۔ لہٰذا اپنی اسی پنڈتائی کو برقرار

Scan by PJP WAQAR

رکھنے کے لئے اس محفل میں بڑے متین اور بزرگ صورت بنے بیٹھے تھے۔ پر چہرہ جو دل کا آئینہ ہے صاف ظاہر کرتا تھا کہ یہ نرے چغد ہیں اس معاملے میں۔ ! وہ بار بار بے چین ہو کر پہلو بدل رہے تھے۔ کبھی آپس میں کھسر پھسر کرنے لگتے یا کبھی کبھی آنکھیں بند کر کے کوئی انٹ شنٹر منتر شلوک کنگنانے لگتے تاکہ دوسروں پر رعب طاری کر سکیں۔ مذہبی سماج کی روایت پرستی اور جاہلیت اس مجلس میں پورے طور پر عیاں تھی۔

دوارکا داس کالٹہ کا پنڈت ادوم پرکاش آئی۔ سی۔ ایس اپنی تمام افسری بھول بھلا کر ملتے پر تمک لگائے اور دھوتی پہنے اِدھر اُدھر گھستا انہیں پانی شربت وغیرہ پلاتا پھر رہا تھا۔ اس کی کھسر پھسر اور کھسیانی ہنسی بار بار سنائی دے رہی تھی۔

"پنڈت رام سروپ جی ابھی نہیں آئے۔" لالہ وساکھی رام نے اپنی طلائی گھڑی غالباً دسویں بار جیب سے باہر نکال کر دوارکا داس سے پوچھا تھا۔

"اوپر ذرا دھیان گیان میں مگن ہیں۔ پوجا کر رہے ہیں۔ بس ابھی آئے ہیں۔" اور اس کی بتیسی باہر نکل آئی۔ اس کے سامنے کے دانت ایسے نظر آ رہے تھے جس طرح ہندو مصور اپنی دیومالا کی تصویریں کھینچتے وقت راکھشسوں کے دکھایا کرتے ہیں۔

عین اس لمحے پنڈت رام سروپ جی اندر داخل ہو گئے۔ سب لوگوں نے اسے نمسکار کیا اور کمرہ "پالاگن مہاراج" "پالاگن مہاراج" کی آوازوں سے گونج اٹھا۔ پنڈت جی مسکرائے ان کی باچھیں کھلی جا رہی تھیں۔ باوقار انداز میں آگے بڑھتے ہوئے وہ اپنی مسند پہ براجمان ہو گئے جہاں گاؤ تکیہ ان کا منتظر تھا۔ ساری مجلس خاموش ہو گئی۔ پنڈت جی کے نزدیک ایک چوکی پہ "یوگ واشسٹ" پڑا تھا اور دوسری پہ ایک پیتل کے تھال میں گھی کا دیا روشن تھا۔ دھوپ بھی سلگائی گئی جس کا مسطر دھواں کمرے کی فضا میں گھٹن سی پیدا کرتا چاروں طرف چکر کاٹتا پھر رہا تھا۔ سب لوگ ہمہ تن گوش تھے۔!!

"مترو! آج میں نے آپ کو ایک بہت ہی کٹھن بات پہ وچار (سوچ) کرنے کو بلایا ہے۔

کئی دنوں سے میں اس وشے (معاملے) پر سوچ رہا ہوں۔ من میں سو طرح کے وچار آتے ہیں۔ دھرم اور دھن کی لڑائی ہے۔ سوچتا تھا آپ کو بلاؤں یا نہ بلاؤں۔ کل رات "سوسی واچن" کرتے یوگ واشسٹھ کا پاٹھ کیا تو یہ منتر آیا۔"

پنڈت جی نے وہ منتر پڑھ ڈالا کسی کے پلے خاک بھی نہ پڑا لیکن سبھی "ہرے رام" "ہرے رام" کی رٹ لگانے لگے۔

"ہے بھگوان تیری لیلا اپرم اپار ہے۔" لالہ وساکھی رام نے اپنی پنڈتائی جتانی چاہی۔!

"مہاراج! یوگ واشسٹ کا کیا کہنا جو کوئی اس کا پٹھن پاٹھن کرے اس کا "پتوں یوگ" میں بھلا ہی بھلا ہے"۔۔۔! سالگ رام نے سوچا میں کیوں چپ رہوں۔"

پنڈت جی مسکرائے۔ اس منتر کا ارتھ ہے کہ زندگی دو گھڑی کا میلہ ہے"۔ اور اپنی کانی آنکھ سے بہتے پانی کو انگوچھے سے پونچھنے لگے۔

"لیکن سجنو! اس کا ارتھ یہ بھی ہے کہ اپنے دھرم سے غافل نہ ہو۔ اسی سے مکتی پراپت ہوتی ہے۔"

"سیتہ ہے مہاراج"۔ لالہ کونڈو رام نے دُھائی دی۔

"ست بچن مہاراج" سردار نرمل سنگھ ابھی تک خاموش تھا۔

"آپ کی بانی میں تو امرت ہی امرت گھلا ہے مہاراج"۔ پرتاب سنگھ بولا پھر وہ اپنی کرچی نما ڈاڑھی پر ہاتھ پھیر کر خاموش ہو گیا۔

"سجنو! آپ سب کو اس لئے تکلیف دی ہے کہ" پنڈت رام سروپ نے ان کی بکواس سے جان چھڑانی چاہی پھر اس نے خوب مرچ مصالحہ لگا کر اور ساتھ والے گاؤں کے پیچھ نوجوان کی رنگ رلیوں کی کہانی انہیں سنا دی۔ کہانی کے آخر میں پنڈت جی گرج کر بولے۔

"آپ کا دھرم آپ کے سامنے نشٹ ہو رہا ہے ۔۔ وہ اچھوتوں کی چھوکری ہم سب کا دھرم بھرشٹ کر رہی ہے اور آپ کی آنکھیں پھوٹ گئی ہیں کہ نظر ہی نہیں آ رہا۔ ہمارے دھرم

WWW.PAKSOCIETY.COM
Scanned By

پر کھلا حملہ کیا جا رہا ہے اور آپ سب دم سادھے بیٹھے ہیں۔ ایک دن اس دھرتی پر سے ہمارے دھرم کا ناش ہو جائے گا اور یہاں پر پرماتما کا وہ قہر نازل ہو گا کہ مہا بھارت کا یدھ بھول جاؤ گے۔"

ساری محفل پر کپکپی سی طاری ہو گئی تھی۔ ان کی گفتگو کے دوران تمام لوگ کانوں کو ہاتھ لگانے لگا کر "ہرے رام" "ہرے رام" "ست رام" "ست رام" کہے جا رہے تھے۔!!

"کلجگ گھور کلجگ" لالہ دساکھی رام بولے۔

"اندھیر ہے بھگوان کا" کوندو مل بولا۔

"رام نام ست ہے" سالگ رام منمنایا۔

"مہاراج اس پاپ کا کچھ اپائے کیجئے" سنتوش بھاٹیہ نے اونگھتے ہوئے کہا۔

پھر وہ سب مل کر کسی فیصلے پر پہنچنے کی کوشش کرنے لگے تاکہ اپنا دھرم نشٹ ہونے سے بچا لیں۔

عین اس لمحے جب پنڈت دوارکا داس دھرم بھرشٹ کا رونا رو رہا تھا اس کی نوجوان بیٹی شوبھا اپنے گھر کی مشرقی دیوار کی پرلی طرف پہنچ چکی تھی۔ دھان کے کھیتوں میں چھپے بھیکو نے اٹھ کر اس کی کلائی پکڑ لی اور اسے اپنی طرف کھینچتے ہوئے بولا! آج اتنی دیر کہاں لگا دی تھی کب سے تمہارا منتظر ہوں یہاں۔"

"ہائے ہائے" شوبھا نے تھوڑی سی لجا کر کہا "میں کیا کرتی جانے اتنے مہمان کہاں سے آن مرے۔"

"بھاڑ میں گئے تمہارے مہمان" — بھیکو نے اسے زمین پر بٹھاتے ہوئے کہا۔

"سینٹ میری کی سیڑھیوں کے باہر راشد بے چینی سے سسٹر مرسی فوک کا منتظر تھا۔ اسے دیکھتے ہی وہ بے تابی سے اس کی طرف بڑھا۔ مرسی فوک نے اسے کئی دفعہ ادا سے ملانے کے لئے کہا تھا۔

"بس اب اسے دو تین روز بعد آپ سے ملا دوں گا۔ سسٹر۔ کل مجھے ڈگری مل جائے گی اور پرسوں

میری شادی ہو جائے گی۔ اس سے اگلے روز ہم لوگ شہر چلے آئیں گے۔ سسٹر آپ بہت اچھی ہیں۔ بہت ہی اچھی آپ نے مجھے بہت سہارا دیا۔ میری تعلیم کے اخراجات بھی اتنے برداشت کئے۔ یہ سب کچھ آپ ہی کے کارن ہے۔ سب آپ ہی کا دیا ہے۔"

"ایسا مت کہو — سب اس خداوند کی طرف سے ہوا۔ خداوند یسوع کو یہی منظور تھا۔"

انسانیت کی دیوی اپنی خاموش سیاہ آنکھیں لئے چپ چاپ کھڑی تھی۔ سفید براق لباس میں ملبوس پاکیزہ فرشتوں کی مانند، اس نے کتنی ہی دکھی راشد کی یہاں، شہر میں اس کا اور تھا ہی کون جب وہ بچہ تھا تو ایک دن یہ نن اس کے سکول میں ایک ڈبے میں بیٹھ کر دودھ بانٹنے آئی تھی۔ پھر وہ اس سے کتنی باتیں کرتی رہی اور اگلے روز ماسٹر جی شہر آئے تو ان سے نہ جانے کیا باتیں کر کے اسے کانونٹ سکول میں داخل کروا دیا، جو چرچ ہی سے ملحق تھا۔ یہاں راشد بڑے بڑے امیروں کے بچوں کے ساتھ پڑھتا رہا۔ سکول سے کالج، سب جگہ سسٹر مرسی فوک اس کی کفالت کرتی رہی۔ اس نے کبھی ماسٹر جی کو بھی اس بات کا احساس نہ ہونے دیا۔ آج وہ ایک ڈاکٹر بن چکا تھا۔ کل اسے ڈگری مل جائے گی۔ اس روز سسٹر کتنی خوش ہو گی۔ اس نے سوچا اور آنے والے وقت کے تصور ہی سے اس کا دل کھل اٹھا۔ اس نے اپنی زندگی کا کوئی پہلو اس عظیم عورت سے نہیں چھپایا تھا۔ حتیٰ کہ وہ خط بھی جو ادا اسے لکھا کرتی تھی۔

"آسمانی باپ تم دونوں پر اپنی رحمتیں نازل کرے۔ مقدس فرشتے اپنے پروں کا سایہ تم پر ڈالے رکھیں تاکہ دنیا بھر کے دکھوں سے پناہ پائے رہو۔" سسٹر مرسی فوک نے محبت سے اس کا ماتھا چوم کر کہا۔

"برائے! مجھے کل مشن کے ساتھ جانا ہے — لیکن میرا دل ناگری میں تمہارے ہاں ہو گا۔ اللہ میری دعائیں نیک تمنائیں تم دونوں کے لئے — ! اوکے۔ وش یو گڈ لک۔"

اگلے روز ایک شاندار تقریب میں اسے ایم بی بی ایس کی ڈگری سے نوازا گیا۔ کالج پرنسپل نے خاص طور سے اس کی محنت سے بھرپور زندگی کی مثال پیش کی۔ ایک یتیم بچہ آج ایک مکمل ڈاکٹر

SCANNED BY WAQAR

تھا۔ برسوں پہلے یہ سپنا دیکھ کر اس کی ماں مرگئی تھی اور یہی سپنا آنکھوں میں لئے باپ نے آنکھیں بند کرلی تھیں۔ آج وہ سپنا وہ حسین خواب شرمندہ تعبیر ہو چکا تھا۔ وہ ایک ڈاکٹر تھا۔ فسٹ کلاس آنریز۔ زندگی کی ہر آسائش اس کی منتظر تھی ــــ!! ڈگری ہاتھ میں پکڑے جب وہ اپنے محسن ماسٹر نور محمد سے گلے ملا تو نہ جانے کیوں وہ پھوٹ پھوٹ کر بچوں کی طرح رو دیئے ــــ شاید پرانے زخم کھل گئے تھے۔ اپنے مرحوم دوست کی یاد تازہ ہو گئی تھی۔

ماسٹر صاحب تو اسی روز گاؤں چلے گئے انہیں کچھ خفیہ انتظامات کرنے تھے۔ یہ سارا کام خفیہ ہی کیا جارہا تھا کیونکہ برہمنوں سے کسی بھی کمینگی کی توقع کی جاسکتی تھی۔ ماسٹر نور محمد نے مسلمانوں کی بستی سے چند نوجوانوں کو اپنا ہم خیال بنالیا تھا اور وہ لوگ ان کی ہر طرح مدد کرنے پر تل گئے تھے۔

اُس رات جب محمد حسین کی بہن اور ماسٹر صاحب کی بیوی ادما کے حنائی ہاتھوں کو مہندی سے رنگ رہی تھی۔ عین اسی لمحے پنڈت اوم پرکاش کی حویلی میں اچھوت نوجوانوں کا ایک مجمع لگا ہوا تھا۔ یہ سب وہ لوگ تھے جو ادما سے بیاہ کے امیدوار تھے۔ ماسٹر صاحب کے ہمسائے کا لڑکا انہیں پل پل کی خبر پہنچا رہا تھا۔ رات اپنے دامن میں آنے والی صبح کی تباہ کاریوں سے بے نیاز جانے کتنے دلوں کی حسین تمنائیں سمیٹے آہستہ آہستہ رینگتی جارہی تھی ــــ

اینڈرسن نے کہا تھا :

"ہر انسان کی زندگی پریوں کی ایک کہانی ہے جو خداوند نے لکھی ہے"

لیکن اینڈرسن ایک تخیل پرست روحانی انسان تھا جس نے اسفوداہبٹ اور سنڈریلا کی ایک علیحدہ دنیا تخلیق کرلی تھی جو بچوں کو تو مطمئن کرسکتی ہے لیکن عام انسان کو نہیں۔ اسے شاید یہ علم نہیں تھا کہ اس بے نیاز خدا کی بنائی ہوئی خوبصورت دنیا میں بہت دکھ ہیں۔ بڑی تکلیفیں ہیں اور چھوٹے چھوٹے دکھی انسانوں کی زندگیاں پریوں کی کہانیاں کسی حالت میں نہیں ہوسکتیں۔

محبت کا یہ پٹھان ــــ یہ خوبصورت آنکھوں اور سیاہ بالوں والا داشہ اینڈرسن کی دنیا کی ان وادیوں میں خواب خرگوش کے مزے لے رہا تھا۔ جہاں پھول کھلتے ہیں ــــ اور برکھا کی ٹھنڈی پھوار برسا کرتی ہے۔

دسمبر کی اس برفانی رات جبکہ باہر خنک ہوائیں چنگھاڑ رہی تھیں۔ وہ اپنے ہوسٹل کے محفوظ کمرے میں مطمئن ہو کر اچھی اچھی چیزوں، خوبصورت زندگی کے سپنے دیکھ رہا تھا۔ محبت کی ان راتوں کے خواب جو اس نے ادما نے بھارت ندی کے کنارے ایک دوسرے کی آغوش میں دیکھے تھے ــــ ان پرانے گیتوں کے سپنے جو اس نے یوکلپٹس کے پھول کے کنج میں بیٹھ کر گائے تھے۔

سڑک کے اس پار سینٹ میری کے عبادت خانے میں آدھی رات کے ماس کے گھنٹے بجنے لگے۔ کہیں دور رات کے سناٹے میں کیرل گانے والی ٹولیوں نے اپنے نغمے شروع کئے تو اس کی آنکھ کھل گئی۔

"خاموش رات۔

مقدس رات۔

مقدس ماں اور اس کا بچہ۔

"اور سنو سنو چرواہا سب فرشتے گاتے ہیں۔"

رات ڈھلتے ڈھلتے ڈھل گئی۔

ایشر سنگھ چپ چاپ صاحب زیر لب گنگناتا کھیتوں کی طرف جارہا تھا۔ اس کی عادت تھی ہر وقت کچھ نہ کچھ گنگناتے رہنے کی اور اکثر وہ گورو گرنتھ صاحب کے اشلوک ہی گنگناتا تھا، یا ہیر وارث شاہ اور کوئی پنجابی فوک کہانی اس کے علاوہ اسے کچھ بھی پسند نہیں تھا۔

"ایشر بھیا!

"اوہ راشد" ــــ! ایشر سنگھ نے اسے دیکھ کر خوشی کا اظہار کرتے ہوئے آگے بڑھ کر گلے لگالیا۔ پھر وہ دونوں دوست کنویں پر ہی بچھی چارپائی پر بیٹھ گئے۔

"آج ہماری شادی ہو جائے گی" راشد نے خوشی سے بے قابو ہو کر اسے کہا۔

"واہگورو سچا پادشاہ تم دونوں کو سکھی رکھے" پھر وہ دونوں دوست آپس میں مشورہ کرنے

Scan & PDF WAQAR

کرنے لگے اور ایشر سنگھ نے اسے آنے والے تمام خدشات سے بے فکر ہو جانے کو کہا۔

"جب تک خالصہ زندہ ہے ۔ تب تک تو کسی کی جرأت نہیں اس کے بعد جو کرے کرتار"

۔ اس نے راشد کی حوصلہ افزائی کرتے ہوئے کہا۔ دونوں دوست کافی دیر باتیں کرتے رہے۔ پھر وہ گھر چلا آیا جہاں ماسٹر جی اور کیشو رام اس کے شدت سے منتظر تھے۔

غلام نبی، محمد یار، حسین خان اور فتح محمد کمہار کے علاوہ دو تین اور آدمی بھی ماسٹر جی کی بیٹھک میں کیشو رام کے ہمراہ بیٹھے تھے۔ وہ سب لوگ سر جوڑے کسی معاملے پر غور و خوض کر رہے تھے۔ ابھی ابھی رنگا مستی نے خبر دی تھی کہ پرکاش واپس نہیں گیا بلکہ اس نے مزید چھٹی منظور کروالی ہے اور بستی کے سارے اچھوتوں کو اپنے گھر میں اکٹھے کر رکھا ہے۔ شام مغرب کا وقت نکاح کے لئے مقرر ہوا اور فیصلہ کیا گیا کہ راشد صبح صبح ادا اور کیشو رام کے ہمراہ شہر چلا جائے۔

"بھائیو! تم سب کو یہاں اکٹھے کرنے کا مقصد تو تمہاری سمجھ میں آ گیا ہو گا۔ اب یہ تم پہ منحصر ہے کہ ان نیچوں کے ہاتھوں اپنے گاؤں کی عزت بھرشٹ کروانا پسند کرتے ہو یا نہیں۔ میری تو بھگوان سوگند یہی اچھا تھا کہ ادا کا وواہ تم میں سے کسی کے ساتھ ہونا چاہیئے تھا۔ اس لئے کہ وہ تمہاری جاتی کی ہے ۔ لیکن کتنے شرم کی بات ہے کہ ایک نیچ سے اس کا وواہ ہو رہا ہے اور اس کا پاپی باپ اپنے ہاتھوں ہی ہماری مان مریادہ بھرشٹ کرنے پہ تلا ہوا ہے" پرکاش بڑی مکاری سے زہر اگل رہا تھا۔

"بھائیو! ہم لاکھ بُرے سہی لیکن آخر آپ کے دھارمک بھائی بند تو ہیں۔ میں نے منشی جی سے کہہ دیا ہے اگر کسی کو شکایت ہو تو مجھ سے کہے میں آپ کا مالک نہیں۔ داس ہوں۔ اور اس ناطے آپ کی سیوا کرنا میرا دھرم ہے۔ آگے جو کچھ ہوتا رہا اس پر ہمیں شما کرنا بھائیو! لیکن بھگوان کے لئے آج کچھ کر دیں دھرم نشٹ ہو جائے تو ہمارے جینے پہ لعنت ...."

پرکاش مجمع کو خوب بھڑکا رہا تھا۔ آج وہ مالک سے نوکر بننے کو بھی تیار تھا۔ آج وہ اچھوتوں سے کئے گئے تمام مظالم کی معافی مانگ رہا تھا۔ محض اس لئے کہ ادا کی عزت سے کھیل سکے۔

"یہ وواہ نہیں ہو گا" ۔!

"ہم گاؤں کی عزت نہیں لٹنے دیں گے۔"

"ہم ان نیچوں کو بھرشٹ کر دیں گے۔"

"مہاراج پنڈت جی کی جے۔"

لوگوں کا جوش بڑھتا جا رہا تھا وہ اپنے دھرم کو نشٹ کرنے والوں کو نشٹ کرنے پہ تلے ہوئے تھے۔

"شانتی! شانتی بھائیو شانتی ۔"

پرکاش آگ بھڑکا کر اس پر دکھاوے کی پھونکیں مارنے لگا ۔!!

تمام اچھوت اور برہمن اپنے ہاتھوں میں ڈانگیں اور نیزے تھامے کھڑے تھے ۔ ایک دو کے پاس رائفلیں بھی تھیں جو انہیں شکار کرنے کے لئے پنڈتوں کی طرف سے ملی ہوئی تھیں۔

جیسے جیسے پرکاش بولتا جا رہا تھا ان کے غیظ و غضب میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا لیکن ابھی وہ انہیں قابو رکھنا چاہتا تھا وہ تو اپنے منصوبے کو جو اس نے شہر سے حاصل کئے گئے غنڈوں کی مدد سے تیار کر رکھا تھا۔ اس وقت عملی جامہ پہنانا چاہتا تھا۔ جب عین نکاح کا وقت ہو۔ اسے وکرم کے ذریعے پل پل کی خبر مل رہی تھی۔

منشی مہنگا مل نے اپنے آدمیوں کو اشارہ کیا جنہوں نے ایک طرف بچھی ہوئی چادروں پر کڑاہ سے بھری ہوئی کڑائے کی پلیٹیں چننا شروع کر دیں اور وہ خود سب لوگوں کو ضیافت کھانے کی دعوت دینے لگا۔ اچھوتوں کے دل میں آج پہلی دفعہ اپنے مالک کے لئے محبت اور ماسٹر صاحب کے لئے نفرت کے جذبات پیدا ہونے لگے۔

بے چارے سیدھے سادے انسان۔ انہیں ایسی چالبازیوں کا بھلا کیا علم ہو سکتا تھا۔ ان کے لئے تو باعث حیرت یہ بات تھی کہ آج وہ اپنے مالک کے گھر میں اس کی طرف سے دی گئی دعوت کھا رہے ہیں۔ ان کا مالک ان پر اتنا مہربان ہو گا اس بات کا وہ تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔

SCAN PDF WAQAR

وہ تو بیچارے سیدھے سادے انسان تھے جنہیں کوئی بھی کسی بھی وقت مذہب کے نام پر ورغلا سکتا تھا۔ جو دو چار گھاگ قسم کے تھے۔ وہ پہلے ہی سے پرکاش کی مٹھی میں آ چکے تھے۔ مستی پہنگاں نے ساری زندگی کی مالکوں کی نوازشات کا آج اس نازک موقع پر حق ادا کر کے رکھ دیا تھا۔ وہ لوگ آپس میں منصوبہ بنانے لگے اور شام ڈھلنے کے منتظر ہو گئے۔

مسلمانوں کی بستی سے حی علی الفلاح کی آواز آ رہی تھی۔

اور پرکاش بپھرے ہوئے اچھوتوں اور براہمنوں کا گروہ لے کر ہاتھ میں اپنا سرکاری پستول لیکے اُدھر آنے کو بالکل تیار کھڑا تھا۔

محمد حسین کی بہنوں نے اوما کو دلہن کی طرح سجا کر ایک کمرے میں بٹھا رکھا تھا۔ لال سرخ جوڑا اس کے لئے ماسٹر صاحب کی بیوی نے خود تیار کیا تھا۔ سرخ جوڑے میں سمٹی سمٹائی وہ آسمان سے اتری ہوئی حور معلوم ہو رہی تھی۔ بادامی آنکھوں کو کاجل نے دو آتشہ بنا ڈالا تھا۔ ہونٹوں کی لالی جیسے چناروں کو آگ لگ گئی ہو۔ حسن اور تقدس کا حسین سنگم جیسے خدائے ذوالجلال نے مونالیزا کی تصویر میں جان ڈال دی ہو۔

ماسٹر صاحب کی بیوی نہ جانے کتنی بار اسے چوم چکی تھی اور محمد حسین کی بہنیں تو باری باری اس کی ٹھوڑی کو ہاتھ سے پکڑ کر سر اونچا کر کے اس کی آنکھوں کے مدھ بھرے پیالوں میں خود کو ڈبو چکی تھیں۔

اجنتا کی تصویر مسکرا رہی تھی۔ اس کی تہذیب، اس کا تمدن، اس کا آرٹ سبھی کچھ زندہ تھا اس کے رخساروں کی چمک، اس کے ہونٹوں کی رخشندگی اس امر کی غماز تھی کہ اس نے ظالم سماج کو اپنی مٹھی میں جکڑ رکھا ہے۔

محلے کی مسلمان لڑکیاں اس کے گرد ہالہ سا بنا کر بیٹھی تھیں۔ سجی سجائی لڑکیاں جیسے چاند کے گرد ستاروں نے دائرہ بنا رکھا ہو ۔۔۔!!

اسی کمرے سے ملحق دوسرے کمرے میں راشد خان ایم بی بی ایس کے گرد آٹھ دس

مسلمان بیٹھے تھے۔ بس مولوی صاحب کی آمد کا انتظار تھا۔ سفید براق جیسے کپڑے پہنے کرے کے ایک گوشے سے لگا کیشو رام بھی ایک نظر اپنی زندگی بھر کی کمائی پر ڈالتا اور کبھی ایک نظر اپنی خوش بختی کے نشان راشد پر۔ زندگی یوں بھی ہو جائے گی اسے اپنی خوش بختی پہ یقین ہی نہیں آ رہا تھا ۔۔۔

کوئی طاقت نہ جانے کیوں اسے بار بار یہ احساس دلا رہی تھی کہ یہ خوشیاں مسرتیں یہ سب کچھ بس ایک لمحے کے لئے ہے۔ ابھی یہ سب کچھ ختم ہو جائے گا ۔۔۔!

نہیں نہیں! آخر تو بھگوان کو اس پر بھی ترس آنا تھا۔ اس کے دن بھی پھرنے ہی تھے۔ اس کے جیون میں بھی سکھ اور آنند کے یہ لمحے آنے ہی تھے۔

نہیں نہیں ۔۔۔ تو ایک معمولی اچھوت تیرا خوشیوں پہ کیا حق ہے۔ یہ مسرتیں تیرے لئے نہیں بنائی گئیں۔ پھر یہ سب کچھ؟ اسے اپنی آنکھوں پہ یقین کیوں نہیں آ رہا ۔۔۔ کیوں نہیں آ رہا ۔۔۔!!

اچھوتوں کا پنڈت آ گیا۔ مولوی صاحب بھی آ گئے۔

"کہو اعوذ باللہ"

اور راشد ان کے پیچھے پیچھے ابھی شیطان سے پناہ مانگنے ہی کو تھا کہ وہ دروازے پر آن دھمکا۔

ٹھک ٹھک ٹھک ۔۔۔ دروازہ کھٹکھٹایا جا رہا تھا۔

"دروازہ کھولو ورنہ ہم توڑ دیں گے" ۔۔۔!!

سب کو جیسے سانپ سونگھ گیا۔ پنجاب کا ملیا جلٹ السیشر سنگھ اپنی ڈانگ سنبھالے دروازے کے سامنے دیوار بن کر کھڑا ہو گیا۔ اس کے سامنے اردگرد کی بستیوں کے سینکڑوں مسلح ہندو کھڑے تھے۔ سب سے آگے ہاتھ میں بھرا ہوا پستول لے کر جگن ناتھ کھڑا تھا جو نگری کا مانا ہوا غنڈہ تھا اور جسے جیل سے صرف اسی مقصد کے لئے فرار کروایا گیا تھا۔ ایک

Scan PDF

طرف پنڈت پرکاش اور جھنگا مل بھی کھڑے تھے۔ پنڈت پرکاش کے ہاتھوں میں اس کا سنگار دان اور ریوالور تھا۔

"کیا چاہتے ہو؟" الیشر سنگھ للکارا۔

"تم ایک طرف ہٹ جاؤ ورنہ مارے جاؤ گے۔"

"ہم دھرم بھرشٹ نہیں ہونے دیں گے۔"

"کلجگ گھور کلجگ"۔۔۔

"مار ڈالو۔"

"ان کا گھر پھونک دو"۔!!

"ہماری ناکیا ہمارے حوالے کر دو ورنہ ایک ایک کو چن چن کر مار دیں گے۔"

طرح طرح آوازیں بلند ہو رہی تھیں۔

"ٹھہرو" اچانک ایک آواز ابھری اور کیشو رام ان کے سامنے آن کھڑا ہوا۔ اس نے اپنی پگڑی ان کے پاؤں میں رکھ دی۔ "مجھ پر دیا کرو، مہاراج دیا کرو"!

لیکن جگن ناتھ کی ایک ہی ٹھوکر نے اس کی پگڑی کو دور پھینک دیا۔

"ظالمو! تم مارنا ہی چاہتے ہو تو بھگوان کے لئے مجھے مار ڈالو۔ یہ سب کچھ میں نے ہی کیا ہے۔ میری جان لے لو لیکن"....

"بڈھے اپنی لڑکی ہمارے حوالے کرتا ہے یا...." اس کی بات کاٹ دی گئی۔

الیشر سنگھ طیش میں آ گیا۔

"سری واہے گورو جی کا خالصہ۔ سری واہے گورو جی کی فتح" اس نے للکارا اور لاٹھی جگن ناتھ کے سر پر مارنے کی کوشش کی۔ لیکن دائیں بائیں دو برچھیوں نے اسے چھید ڈالا۔ اس کے پیٹ سے خون کا فوارہ ابل پڑا اور خالصہ امر ہو گیا۔

"لے لی مترا رب دا کھا"۔۔۔ اس نے گرتے گرتے راشد کی طرف دیکھا جو اپنی خوبصورت

دشمنا پھٹی نظروں سے پتھر بنا یہ سب کچھ دیکھے جا رہا تھا۔

محمد حسین دیوانوں کی طرح لپک کر سامنے آیا۔ وہ بھی مارا گیا۔!

شیخ زادہ غصے اور سرخ چہرے والے بوڑھے انسان نے ان کے سامنے ہاتھ جوڑ کر کہا۔ "ہم سب کو مار ڈالو مگر خدا کے لئے اسے کچھ نہ کہنا"۔۔۔ راشد کو انہوں نے اپنی اوٹ میں چھپا لیا تھا لیکن وہاں کسی کی کون سنتا تھا۔ ان کے چہرے اور ڈاڑھی کا رنگ ایک ہی جیسا ہو گیا۔ گولی ان کے ماتھے پر لگی تھی۔ کیشو رام راشد سے لپٹ گیا لیکن اسے الگ کر کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا گیا۔

اوما یہ سب کچھ سن کر دروازے میں جلی آئی تھی اور پھٹی پھٹی آنکھوں سے یہ سب کچھ دیکھ رہی تھی۔ سب عورتیں اس کے قریب سے چیختی چلاتی بھاگ گئی تھیں۔

راشد پر پاؤں کی ایڑیوں سے لے کر کنپٹیوں تک ایک اذیت ناک کرب کا دور شروع ہو چکا تھا۔ وہ پتھر بنا کھڑا تھا۔ اسے یوں لگتا جیسے کوئی اس کے زخموں میں آتشیں سلاخیں چبھو رہا ہو بے رحمی سے۔ زور زور سے۔ زخموں کے دور اندر تک۔ روح کے آخری گوشے تک۔۔۔ اور وہ اس کرب انگیز درد کی تاب نہ لا کر کراہنے لگتا۔۔۔ اس کا جی چاہتا کہ اوما آ جائے کہیں سے آ جائے۔ بند دروازوں کو توڑ کر پتھر کی دیواروں کو پھاڑ کر۔ دونوں کے درمیان حائل پردے چیر کر۔

پھر یکایک اوما دلہن بنی موتیوں کا گجرا پہنے چنبیلی اور گلاب کے پھولوں کو اپنے بالوں میں گوندھے لال عروسی دوپٹہ اوڑھے۔۔۔ اس کی طرف بڑھ رہی تھی۔ وہ اندر آ گئی۔ راشد لال دوپٹے کے اندر سے اس کی شریر اور مسرت سے لبریز آنکھیں دیکھ سکتا تھا۔ اس کے لبوں پر وہی مکوتی حسن جگمگا رہا تھا۔ وہی مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔

پھر اچانک لال عروسی دوپٹہ اس کے چہرے پر جا گرا۔ وہ اس کے بہت قریب آ گئی تھی۔ اتنا قریب جہاں سے وہ اس کے چنبیلی اور گلاب کے پھول بھی سونگھ سکتا تھا۔۔۔ ان کی

Scan by PDF WAQAR

خوشبو محسوس کر سکتا تھا لیکن لال دوپٹہ اس کے چہرے پہ کیسے آن پڑا۔ اس نے سوچا یہ لالی کیسی ہے؟ چاروں طرف خون، سرخی ہی سرخی ہے! اس کی آنکھیں ڈوبنے لگیں۔

دلہن نہ آئی وہ ساکت و الے کھڑے رہے تھے۔ دونوں کے درمیان صرف ایک دیوار نہ تھی دونوں کی راہ پر چلا۔ نہ ہی محبت نے مسافر نے زندگی کے آخری لمحوں تک۔ اس کا انتظار کیا لیکن دلہن بھی نہ آئی۔ وہ اس کے اتنی قریب تھی لیکن اس کی آواز تک نہ سن سکی۔

ادما کے چاروں اطراف کائنات یکلخت بہت تیزی سے ڈولنے لگی فضا کی چیخیں بلند ہونے لگیں۔ شعلے اوپر ہی اوپر اور اونچے ہی اونچے اٹھتے گئے۔ زمین تا آسمان ساری دنیا۔ ساری کائنات نے سرخی کا لبادہ اوڑھ لیا۔ اس نے خوفزدہ اور پھٹی پھٹی آنکھوں سے۔ مرتے ہوئے انسانوں کو دیکھا اور دھڑام سے گر گئی۔

اس کے سرخ پپوٹوں میں انتہائی تیز جلن کہیں سے گھس آئی تھی۔ کرہ آفتاب اپنی تمام تر تیز رفتاریوں کے ساتھ زمین سے ٹکرا گیا تھا۔

یہ کیا ہو گیا؟ جیسے وہ سب لاشیں اسے کہہ رہی تھیں۔ خدا کی قسم یہ سب غلط ہے سراب ہے، دھوکہ ہے تمہاری نظر کا بہت برا خواب ہے۔ ابھی ہم جاگیں گے تب اس جھوٹے کی قلعی کھل جائے گی۔

لیکن یہ سب تو حقیقت تھی۔!!

راشد مر چکا تھا۔ اس کی موت سے خدا کی تخلیق کی ہوئی ایک خوبصورت زندگی کے ختم ہو جانے سے کسی چیز پہ کوئی اثر نہ پڑا تھا۔ کائنات کا نظام اسی طرح چل رہا تھا۔ ساری دنیا اسی طرح زندہ تھی۔ رونے والا بھی تو کوئی نہیں رہ گیا۔ ایک مکمل اٹھائیس سالہ جوان خوبصورت اور گرم زندگی کا خاتمہ ہو چکا تھا۔ وہ جوان کا دھرم "کرشنا" کرنے چلا تھا۔ اسے براہمنوں نے مار ڈالا۔ راشد اندھیروں کے پار چلا گیا جس کے متعلق ہی زندگی کی، جوانی کی، انسانیت کی، پاکیزگی تھی۔ جس کا کنڈان البیا رنگ تھا جس کی مقدس مرمریں نوک جیسی حیرت زدہ جھپکتی ہوئی بڑی بڑی

آنکھیں تھیں جس کے بالوں کی رات کے سمندر جیسے طرح طرح کے رنگ جھلکتے اور لہریں مارتے تھے جو زندگی کی ابدی خوبصورتی، ابدی محبت کا فرشتہ تھا جس طرح کے کرشن کے خوبصورت کارنامے ہیں پڑھے ہوتے ہیں۔

لیکن اس کا کنڈان البیا رنگ سیفر بن چکا تھا۔ اس کے ترشیدہ ہونٹ خون آلود تھے۔ اس کی حیرت زدہ حیرت زدہ آنکھیں بند ہو گئی تھیں۔ اس کے سمندر کی لہروں جیسے بال خون سے چپکتے گئے تھے۔ جوانی کی شدید پاکیزگی خون آلود ہو گئی تھی۔ وہ آنکھیں بند کئے کمرے کے بیچ پڑے فرش پہ کمیشور رام اور ماسٹر نور محمد کے درمیان لیٹا تھا۔ سرخ اور جیتے جاگتے جوان خون کی جھیل سی اس کے چاروں طرف بن گئی تھی۔

پہ کاش کی چلائی ہوئی پہلی گولی اس کے خوبصورت بالوں کو چیرتی اس کے حسین دماغ میں گھستی چلی گئی تھی۔ پھر چار مزید گولیوں نے اس کا جسم چھلنی چھلنی کر دیا تھا۔

سامنے دروازہ کھلا تھا اور محبت کا مسافر موت کے جنگل میں اکیلا چلا جا رہا تھا۔ باہر کائنات خاموش تھی اور شب تیرہ و تار۔! تاریک فضاؤں میں عناصر کے طوفان کی گھن گرج شدید ہو گئی تھی۔ جھکڑ جو بہت دیر سے آہستہ آہستہ چل رہا تھا رات کی ساعتوں کے گزرنے کے ساتھ ساتھ یکلخت زور پکڑ گیا۔

ادما کی آنکھ جہاں کھلی وہ ایک سجا سجایا کمرہ تھا۔ اس طرح کا کمرہ اس نے زندگی میں ایک بار پہلے دیکھا تھا وہ بھی ایسا نہیں بلکہ اس سے ملتا جلتا کمرہ تھا ایک بار جب وہ شہر گئی تھی۔

کمرہ اور حیرانگی کی ملی جلی کیفیت میں اس نے ایک نظر کمرے پہ ڈالی۔ وہ ایک خوبصورت فوم کے پلنگ پہ لیٹی ہوئی تھی بکھرے کمرے پہ گہرے نیلے پردے پڑے تھے اور کمرے میں سجاوٹ کا وہ سامان جس کا وہ تصور بھی نہ کر سکتی تھی۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ کہ کوئی مسلسل اس کے ذہن پہ ہتھوڑے برسائے جا رہا تھا۔ غنودگی! گہری غنودگی اور پھر نیند۔ وہ پھر سو گئی۔

ایک نرس اس کے سرہانے کھڑی تھی جو پتھر کے اس بت کو مختلف انجکشن لگانے جا رہی

SCAN BY PDF WALA

تھی، پھر اسے مکمل ہوش آ گیا۔

اسے آہستہ آہستہ سب کچھ یاد آنے لگا۔ اذیت کا ایک ایک لمحہ کتنا جاں گسل تھا، کتنا بھیانک تھا۔ وہ دھندلے دھندلے نقوش اب واضح ہوتے جا رہے تھے۔ سب مر گئے۔ سب کچھ ہی تو ختم ہو چکا تھا۔ اس نے سوچا پھر وہ آخر کیوں زندہ ہے؟ — وہ کیوں نہیں مر گئی۔ وہ سوچنے لگی۔

اسے آہستہ آہستہ سب کچھ یاد آتا جا رہا تھا۔ گزری ہوئی قیامت کا ایک ایک لمحہ اسے ازسرِ نو یاد تھا۔ سب کچھ اس کی آنکھوں ہی کے سامنے تو ہو گیا تھا۔ پھر وہ گر پڑی تھی۔ لیکن یہ اسے اچھی طرح یاد تھا کہ گرتے وقت کسی نے اسے تھام لیا تھا اور ایک ہیبت ناک سایہ اسے اٹھا کر لے گیا تھا۔ اس نے اپنے اغوا کرنے والوں کو اچھی طرح جان لیا تھا — یہ گھن ناتھ اور پرکاش تھے۔ ہیبت ناک وہ بے ہوش ہو گئی تھی اور آج اسے یہاں ہوش آیا تھا۔ اب اس کے اوسان مکمل بحال ہو چکے تھے۔ اندازاً یہ تیسرا دن تھا اسے ہوش میں آنے پر اس بات کا احساس کرنے میں لگی گھڑی نے بتایا تھا ورنہ اسے دن اور رات کا ہوش کہاں۔ اسے تو یہ بھی معلوم نہیں تھا وہ خوفناک کون ہے؟ کیا ہے؟ — ! وہ چپ چاپ اس کھنڈر کو نہارتی رہی جو ایک نرس اس کے لئے تین دنوں سے مسلسل لے کر آ رہی تھی۔ اس نے نرس سے کئی بار پوچھا۔ وہ کون ہے؟ کہاں ہے؟ — !

لیکن نرس شاید گونگی تھی اسے کوئی جواب نہ ملتا۔ پھر وہ اپنی سوچوں میں مستغرق ہو جاتی خیالات کے طوفان بڑھتے چلے آتے اور اس کی روح کے ساحل کی ریت پر پھیل جاتے۔ پھر یہ طوفان کتنے لمبے وقفے۔ تب لہریں اس ریت سے چھیڑ چھاڑ کرتے کرتے غائب ہو جاتیں اور وہ اپنے سامنے اس ساحل کی ریت کو چمکتا دیکھتی رہتی۔ یہ خیال ہر قسم کے احساس سے مبرا اور کچھ نہ سمجھ پاتی۔ ریت کیوں چمکتی ہے۔ لہروں کے نقوش قدم اس پر کیوں موجود نہیں رہتے اور وہ ساحل کا کنارہ کوئی کنارہ بھی نظر نہیں آتا سامنے کیوں ہے؟ سمندر کیوں ہو گیا ہے؟ — ! اور اسے آتے ہی طوفان گھسنے لگتا۔ اس کی لہریں آگے بڑھتے لگتیں اور چمکتی ریت پر چھا جاتیں۔

پھر وہ طوفان سے بے تعلق ہو جاتی اسے یوں لگتا جیسے وہ خود ایک تماشائی ہو اور یہ سب کچھ

اس کے سامنے بطور تماشا پیش کیا جا رہا ہو۔ وہ حیران تھی اتنا سب کچھ گزر جانے کے باوجود وہ روتی کیوں نہیں؟ وہ نازک خیال لڑکی جو معمولی باتوں پر رو پڑتی تھی آج نہ جانے اس کے آنسو کہاں کھو گئے تھے۔ اس کی آنکھوں کے سامنے اس کا سب لٹ گیا۔ سب کچھ چھن گیا اور وہ خاموش تماشائی بنی سب کچھ دیکھتی رہی۔!

لیکن تیسرے روز وہ اچانک پھٹ پڑی۔ وہ رونے لگی۔ آنسوؤں کی لہریں جنہیں اس نے چٹانوں کے نیچے مقید کر رکھا تھا۔ تمام دیواریں توڑ کر بہہ نکلیں۔ منجمد سیال آنسو جو اس کے سینے پر برف کا تودہ بن کر جم گئے تھے جیسے سورج نے انہیں پگھلا دیا ہو —

وہ روتی رہی تڑپتی رہی۔ اس نے شدت سے مرنے کی خواہش کی لیکن اسے موت نہ آئی اگلے روز صبح دروازہ کھلا تو پرکاش اپنی تمام تر شیطان کاریوں سمیت اس کے سامنے موجود تھا۔ اوما کا جی چاہا کہ اس ذلیل برہمن کا گلہ گھونٹ ڈالے لیکن یہ تو صرف سوچنے کی بات تھی۔ وہ پتھر کا بت بنی اس شیطان کو دیکھتی رہی جس نے اس کے ارمانوں کا گلہ اتنی آسانی سے گھونٹ ڈالا تھا جتنی آسانی سے کوئی مکھن میں سے بال نکال کر باہر پھینک دے۔

ذلیل، کمینے، کتے! اس نے نہ جانے ایک ہی سانس میں کتنی گالیاں پرکاش کو دے ڈالیں لیکن وہ ہنستا رہا۔

"اب جاؤ میری جان! آج بھی مجھ سے بچ جاؤ گی اب تو میں نے اُن دیواروں ہی کو گرا دیا ہے جو بیچ تمہارے اور اپنے درمیان حائل نظر آتی تھیں" وہ مسکراتا ہوا اوما کی طرف بڑھ رہا تھا شیطانیت نے اس کے چہرے کو بھیانک بنا ڈالا تھا۔ اوما کے سوگوار حسن نے اس کی آنکھوں میں شہوت کے لال لال ڈورے دیکھ لئے تھے۔

اوما نے اس کے منہ پر تھپڑ مار دیا۔

"اور مارو — میری جان! تمہارے جسم کے تو ایک ایک حصہ کی بھی یہ قیمت نہیں ہے اور پھر مجھے تو مزا ہی ایسے شکار کا آتا ہے" — وہ بدستور مسکرائے جا رہا تھا۔

SCAN BY PDF

لاچار اور بے بس عورت آخر تھک ہار کر گر پڑی: "مجھے جہان سے مار ڈالو۔ خدا کے لئے مار ڈالو۔۔۔!

"بول! ان لٹیروں نے تجھے یہ خدا کا سبق پڑھا دیا ہے۔ کیا سمجھتی تھی دھرم پرل پیٹھ سے تو ہم سے بچ جائے گی؟" وہ غصہ سے پھنکارتے ہوئے بولا۔

"خدا کے لئے پنڈت جی! مجھے مار ڈالئے۔ میرے ساتھ یہ ظلم نہ کیجئے" وہ اس کے پاؤں سے لپٹ گئی۔

اس نے ذلیل برہمن کے سامنے ہاتھ جوڑے۔ وہ روتی رہی، چیختی چلاتی رہی۔۔۔ اس نے ہزارہا بار خدا کو اپنی مدد کے لئے بلایا۔ گلہ پھاڑ چلا کر لوگوں کو آوازیں دیں لیکن سانڈ نما پروہت کے مرد نے اس کی آہ و بکا کو باہر نہ جانے دیا۔ اس کا دامن عصمت تار تار ہو گیا۔ کوئی اس کی مدد کو نہ آیا نہ زمین ہی پھٹی کہ وہ اس میں سما جاتی اور نہ آسمان ہی گرا۔ صبح سے دوپہر، رات اور پھر صبح۔ وہ لٹتی رہی۔

حکومت کا ایک اعلیٰ آفیسر اس کی عزت سے کھیلتا رہا وہ جو اسے اپنی جاگیر ہی کا ایک حصہ سمجھتا تھا۔ اس کی خصمت دری کرتا رہا۔ اسے کسی نے کچھ نہ پوچھا۔ کسی نے اسے شنگسار نہ کیا۔ کسی کی اتنی جرأت بھی نہ ہوئی کہ ناگری والے واقعہ کے سلسلے میں اس کا نام لے لیتا۔ پولیس آئی اعلیٰ حکام بھی موقعہ پر پہنچے اور پنڈت دوارکا داس کے ستائے ہوئے ملزموں کو گرفتار کر کے لے گئے۔

کسی نے ان سے کچھ پوچھنے کی زحمت بھی گوارہ نہ کی اس لئے کہ وہ برہمن تھے۔ اونچی جاتی کے تھے بہت بڑے جاگیردار ہونے کے علاوہ حکومت کے بڑے بڑے عہدوں پر فائز تھے۔ اور حکومت کے نزدیک معززین کی فہرست میں بھی شامل تھے۔ لہٰذا انہیں یہ اختیار بھی حاصل تھا کہ جو چاہیں کرتے پھریں۔

اوما نے کئی دفعہ مرنے کی کوشش کی لیکن وہاں اس سے یہ حق بھی چھین لیا گیا۔ پھر اس کے دل میں انتقام کی آگ بھڑک اٹھی یہ آگ تو نہ جانے کب سے بھڑک رہی تھی۔ لیکن آخر وہ انتقام لے تو

کس طرح؟ اس نے اب مرنے کا ارادہ ملتوی کر دیا۔ اب وہ زندہ رہنا چاہتی تھی صرف اس وقت تک جب تک کہ اس کے وہ دشمن جنہوں نے اس کی دنیا پھونک ڈالی تھی۔ اس کی ننھی منی خوشیوں کی دنیا میں آگ لگا کر اسے خس و خاشاک کا ڈھیر بنا ڈالا تھا۔ مر نہیں جاتے تھے اس نے راشد سے جینے مرنے کا وعدہ کیا تھا اور اسے نبھانا بھی تھا۔ وہ راشد کی روح کے سامنے شرمندہ ہونا نہیں چاہتی تھی۔ اس نے جانے کتنی دفعہ اکٹھے جینے مرنے کے پیمان باندھے تھے لیکن اب اسے ایک اور فرض بھی پورا کرنا تھا۔ اسے انتقام لینا تھا۔ وہ مشعلہ جوالہ بنتی جا رہی تھی۔ اس کی نس نس میں آگ سی بھر گئی تھی اور ہر لمحے وہ کسی موقع کی منتظر تھی۔۔۔!

پھر ایک روز اوما بھاگ گئی۔

وہ موقع پا کر فرار ہو گئی۔ حکومت کے کئی اعلیٰ افسر اس کے شناسا بن چکے تھے کیونکہ اسے باری باری ہر ایک کے بستر کی زینت بننا پڑا تھا۔ اس نے زندگی سے سمجھوتہ کر لیا تھا اور زندہ رہنے کے سارے ڈھنگ سیکھ لئے تھے۔ وہ اب اچھوت لڑکی نہیں تھی۔ اب تو وہ ناگن بن چکی تھی۔ سراپا انتقام ناگن۔ جو ہر ایک کو ڈس لینا چاہتی تھی۔

پرکاش کے ایک دوست سے ساز باز کر کے وہ اس کے ساتھ فرار ہو گئی اور پھر ایک روز اسے بھی زہر دے کر مار ڈالا اور بمبئی چلی آئی۔ جہاں ایک نئی زندگی اس کی منتظر تھی۔

کانپور سے بمبئی تک پہنچنے کی کہانی بڑی مختصر تھی۔ اس نے اپنی زندگی داؤ پر لگا دی تھی اسے ہر لمحے یہ خطرہ رہتا تھا کہ کسی بھی وقت پرکاش کے آدمی اسے مار ڈالیں گے اسے گوارہ نہ تھا کہ اپنا شکار اچھوڑ کر مر جائے۔ وہ بہت تیزی سے مختلف مراحل سے گزرتی ہوئی بمبئی کے اس بازار میں پہنچ گئی تھی۔

وقت نے اس نرم و نازک اور محبت کی ماری لڑکی کو ایک جہاں دیدہ اور مکار عورت بنا ڈالا تھا۔ اب اسے ہر لمحے اس موقع کا انتظار رہتا جب وہ اس بربریت کا حساب چکا سکے۔ سال بھر کے اندر وہ اوما سے "تلی بائی" بن گئی۔

WWW.PAKSOCIETY.COM
Scan by PDF

اس کے حسن کے چرچے بمبئی کی گلیوں اور بازاروں میں ہونے لگے تھے۔ ظالم کس غضب کا گاتی تھی۔ نہ جانے اتنا درد اس کی آواز میں کہاں سے آن بسا تھا۔ اس کے چاہنے والوں کی تعداد ہزاروں سے تجاوز کر گئی تھی۔ بمبئی لاکھوں کا شہر ہے۔ اس کا ہر کونہ "پتلی بائی" کے نام سے گونج رہا تھا۔ عام لوگوں سے لے کر اعلیٰ افسران تک اس کے گاہک تھے۔ ملک کی مقتدر ہستیاں اس سے شادی کی خواہش رکھتی تھیں۔ لوگ اس کی ایک جھلک دیکھنے کے لئے دیوانے ہوئے جا رہے تھے لیکن اسے ابھی تک کسی کا انتظار تھا۔ وہ ان تمام باتوں سے بے نیاز ہو چکی تھی۔ زندگی کی تمام رنگینیاں اس کے لئے بے معنی بن کر رہ گئی تھیں۔ وہ تو ہر لمحہ اس ہستی کی منتظر تھی جو اس کے انتقام کی آگ بجھانے میں اس کی مدد کر سکے۔

پھر ایک روز وہ گھڑی آ ہی گئی جس کے انتظار میں اس نے تین سال بتائے تھے۔

آسام کی سیتل گھاٹی تقسیم ہند و پاک سے قبل ہی ڈاکوؤں کا مسکن بن چکی تھیں۔ میلوں لمبی یہ پہاڑی جس کے دامن میں جنگلات کا سلسلہ پھیلتا چلا گیا ہے۔ اپنے دامن میں نہ جانے کب سے تمام انڈیا کے مشہور اور بدنام زمانہ افراد کو پناہ دیتے ہوئے تھی۔ آج تک حکومت وہاں سے کسی کو گرفتار نہیں کر سکی تھی۔ درجنوں بار ہوائی جہازوں سے بمباری کروائی گئی۔ باقاعدہ فوج کے دستے روانہ کئے گئے لیکن چند کھنڈروں اور جلے ہوئے درختوں کے علاوہ حکومت کو وہاں سے کبھی بھی کوئی شے حاصل نہ ہو سکی۔!

مشہور زمانہ ڈاکو مان سنگھ کا ساتھی جمعدار سنگھ ایک مرتبہ بمبئی آیا تو پتلی بائی کی ایک جھلک نے ہی اسے دیوانہ کر دیا اور آج وہ خاص طور سے اس کا گانا سننے کے لئے یہاں آیا تھا۔ پتلی بائی سراپا قیامت بنی اس کے سامنے بیٹھی تھی جس کی چھٹی حس بار بار اسے کہہ رہی تھی کہ یہی ہے جس کا تجھے تین سال سے اس شدت سے انتظار ہے ــــ! گانا شروع ہو گیا۔ پتلی بائی کی رسیلی آواز اور لہراتا بل کھاتا جسم جمعدار سنگھ تڑپ کر رہ گیا۔ اس کی مجرمانہ زندگی سے نہ جانے کتنی ایسی خوبرتیں روزانہ آئی اور چلی گئی تھیں لیکن ایک بھی تو اس پتھر دل کو موم نہ کر سکی۔ آج تو جیسے یہ پتھر موم کی

طرح پگھل کر رہ گیا تھا۔ پتلی بائی اسے یہاں سے بہت دور اس کے گاؤں میں لے گئی تھی۔ اس نے جمعدار سنگھ کو اس کا ماضی یاد دلا کر اسے رلا دیا تھا۔

"بس کرو" ــــ وہ جھنجلا کر کھڑا ہو گیا۔ چار سٹین گنوں نے اس کا احاطہ کر لیا تھا۔ اس کے ساتھی حیران تھے آج سردار کو کیا ہو گیا۔ نوٹوں کا بنڈل اس نے پتلی بائی کے پاؤں میں پھینکا اور واپس جانے لگا۔

"ٹھہریئے" اس نے ہاتھ کے اشارے سے سازندوں کو چلے جانے کا حکم دیا۔ اور اس "ٹھہریئے" کی آواز نے جمعدار سنگھ کے قدم پکڑ لئے۔ اس کے ساتھ ہی سٹین گنوں کا رخ بھی تبدیل ہو گیا۔

"تم ان کے بغیر کوئی بات نہیں کر سکتے کیا؟" پتلی بائی نے بڑے نخرے سے سٹین گنوں کو ایک نظر دیکھتے ہوئے پوچھا۔

جمعدار سنگھ نے ایک نظر اپنے ساتھیوں پر ڈالی اور چند سیکنڈ بعد وہ دونوں اکیلے وہاں کھڑے تھے۔ پتلی بائی نے اس کے نوٹوں کا بنڈل اسے لوٹا دیا۔

"کم ہیں کیا"؟ جمعدار سنگھ نے اپنے تھیلے میں ہاتھ ڈالا۔

"نہیں" ــــ

"تو پھر ــــ؟"

"شیر سے لوٹ کا مال نہیں کھاتے" ــــ!

"کیسے جان لیا کہ مال لوٹ ہی کا ہے"!

"ہم پیشہ ہوں۔ اتنی جان پہچان بھی نہ کروں گی"!

"تمہیں تو ایسی باتیں نہیں سوچنا چاہیئے۔ یہاں حلال کی کمائی تو آنے سے رہی"!

"اس بحث کو چھوڑیئے" پتلی بائی نے گفتگو کا رخ بدلا۔

جمعدار سنگھ کے چہرے نے کئی رنگ بدلے تھے اسے اپنی کمزوری پر غصہ آنے

Scanned with CamScanner

لگا تھا۔

"پھر مجھے جانے دو" اس نے مڑ جانا چاہا۔

"نہیں" ۔۔۔!! پتلی بائی اس کے سامنے تن کر کھڑی ہو گئی۔ اس نے اپنے بازو پھیلا رکھے تھے۔ جمعدار سنگھ پگھل کر رہ گیا۔

"کیا چاہتی ہو"؟ اس نے پُرسکون لہجے میں کہا۔

"سمجھوتہ کر لیں"

"مجھے گرفتار کرا دو گی کیا۔ جتنا مال پولیس سے لینا ہے وہ مجھ ہی سے لے لو"

"ڈاکو، ڈاکو کو گرفتار نہیں کرواتا"

"پھر کیا آخر"؟

"دونوں اکٹھے کام کریں"۔۔۔

"اور پھر" جمعدار سنگھ ہنسنے لگا "تم کیا کرو گی"؟

"جو کہو گے"

"اور معاوضہ"؟

"میرا ایک کام کر دینا"

"وہ میں اس کے بغیر بھی کر دوں گا" اور جمعدار سنگھ واپس چلا گیا۔

دوسرے روز وہ اکیلا دن کے وقت اسے ملنے آیا اور پھر یہ ملاقاتیں محبت میں بدل گئیں۔

لیکن جمعدار سنگھ کو حیرانی اس بات کی تھی کہ آخر وہ اس لڑکی کو عام لڑکیوں سے جدا کیوں تصور کرتا ہے۔ وہ کونسی طاقت ہے جو اسے ایسا کرنے سے روکتی ہے۔ اس نے کبھی پتلی بائی کو چھیڑ کر بھی نہیں دیکھا تھا اور نہ ہی کبھی اس کے سامنے جمعدار سنگھ کے دل میں کوئی ایسی خواہش پیدا ہوئی تھی۔ اسے اس لڑکی میں طوائفوں والی کوئی بات بھی نظر نہ آتی تھی۔

اور ایک روز ۔۔۔!!

اوما نے اسے اپنی کہانی سنا ڈالی۔ وہی کہانی جو جمعدار سنگھ کی تھی جو سیتل گھاٹی کے ہر مکین کی تھی۔ ظالم نے مظلوم سے زندہ رہنے کا حق چھین لیا اور مظلوم زیرِ زمین چلا گیا تاکہ اپنا حق ظالم سے واپس لے سکے۔ لیکن اوما کے المیے میں نہ جانے کونسی خصوصیت تھی کہ جس نے جمعدار سنگھ کو بھی گہرا ڈالا۔ پھر ان کا معاہرہ طے پا گیا۔ دونوں کا دکھ جو ایک تھا لہٰذا دونوں ایک ہو گئے۔

ایک روز لوگوں نے سنا کہ پتلی بائی بمبئی کے بازارِ حسن سے پُراسرار طور پر غائب ہو گئی ہے۔ جاننے والے جانتے تھے کہ اس کی دوستی ایک بہت بڑے ڈاکو سے ہو گئی جو اسے بھگا کر لے گیا تھا۔

بمبئی کا بازارِ حسن سونا پڑ گیا۔ پتلی بائی کیا گئی تمام رونقیں بھی اپنے ساتھ ہی لے گئی جانے کتنے دل اس کے یہاں سے چلے جانے پر تڑپ کر رہ گئے۔ پتلی بائی یہاں سے بہت دور آسام میں جا بسی تھی۔

سیتل گھاٹی کی مخلوق نے ایک مظلوم کے اضافے پر کوئی ردِ عمل ظاہر نہ کیا ۔۔۔ اسے بڑی فراخدلی سے اپنے دامن میں پناہ دے دی گئی۔ یہاں پتلی بائی نے عورت کا لبادہ اتار پھینکا۔ وہ مرد بن گئی تھی مکمل مرد۔ وہ اتنی تیزی اور پھرتی سے گولیاں چلاتی تھی کہ خود جمعدار سنگھ بھی حیران رہ جاتا ۔۔۔ دیکھتے ہی دیکھتے بھارت کے بڑے شہر اس کے نام سے گونجنے لگے۔ اخبارات نے اس کی مظلومیت کے قصے الاپنے شروع کر دیئے۔ وہ دن دیہاڑے اتنی دلیری سے ڈاکہ ڈالتی اور غائب ہو جاتی تھی کہ پولیس چکرا کر رہ جاتی۔

لوگوں کو حیرانگی اس بات کی تھی کہ آخر اسے ڈاکو بننے کی کیا ضرورت پیش آ گئی۔ وہ تو خود لاکھوں میں کھیلتی تھی۔ پولیس دن رات شکاری کتوں کی طرح اس کا پیچھا کر رہی تھی لیکن بے سود آج وہ آسام میں تھی تو دوسرے دن مدراس اور اس سے اگلے روز کلکتہ ۔۔۔ سفید کپڑوں میں ملبوس سی۔ آئی۔ ڈی کے خاص دستے دلّی سے منگوائے گئے تھے۔ لیکن وہ عورت پھر بھی دن دیہاڑے للکارتی پھر رہی تھی۔

WAQAR SCAN & PDF

اور ایک روز — اس کی سالوں کی تپسیا رنگ لے ہی آئی۔ آج اسے اپنے ازلی دشمن پر وار کرنے کا پہلا سمرقع ملا تھا۔ اس سے پہلے تو وہ شاید رہبر سل ہی کرتی رہی تھی۔ آج اس نے جی بھر کے اپنے ارمان نکالنے تھے۔ پنڈت دوارکا داس کی لڑکی ہملا دیوی کی آج شادی تھی۔

پرکاش کی بہن کی شادی، نہ جانے کب سے وہ ان لمحوں کی منتظر تھی۔

شہنائی گونج رہی تھی۔ ڈھولک بج رہی تھی۔ تمام جھونپڑیوں کو آج دلہن کی طرح سجایا گیا تھا۔ پنڈت دوارکا داس کی بیٹی کی شادی تھی۔ کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ سارے ناگری کی روشنی یہاں امنڈ آئی تھی۔ دوارکا داس اور منشی مہنگا مل دوسرے دوسرے بھر رہے تھے۔ بارات آگئی تھی۔

شہنائی کا نغمہ تیز ہوتا جا رہا تھا۔ ہوا رقص ہونے لگا۔ پنڈت آسن پر بیٹھے اشلوک پڑھ رہے تھے۔ آگ جل رہی تھی۔ دھوپ کا دھواں اور زعفران، سیندور اور گلاب کی پتیاں، گنگا جل، اور گھی کا جلتا ہوا چراغ رکھا تھا۔ لڑکیاں ڈھولک پہ بیاہ شادی کے گیت گا رہی تھیں۔

پھر پنڈت رام سروپ نے ہاتھ کا اشارہ کیا۔ سب خاموش ہو گئے۔ چاروں طرف سکوت چھا گیا۔ ہملا اور اس کا پتی ایک دوسرے کا دامن تھامے آگ کے گرد چکر لگانے لگے تھے۔

پنڈت اشلوک پڑھ رہے تھے۔ ہر طرف خاموشی تھی صرف ہون میں لکڑیوں کے چٹخنے کی آوازیں آ رہی تھیں یا گھی کے جلنے کی بو۔ پنڈت اب آخری اشلوک پڑھ رہے تھے جس کے بعد چندن، زعفران، سیندور، گلاب جل اور چاول کا ٹیکا لگایا جاتا ہے —!

اچانک ہی سامنے کا دروازہ کھلا اور پانچ چھ آدمی بڑی بڑی چادریں اوڑھے اندر گھس آئے۔

"کون ہے؟ کیا بات ہے؟ کیا لینے آئے ہو؟" پنڈت دوارکا داس نے گھبرا کر ان سے کتنے ہی سوال کر ڈالے۔

"تمہاری خوشیوں میں شرکت کرنے آئے ہیں دوارکا داس!" ایک آواز بلند ہوئی۔

"پتلی بائی!" کئی سرگوشیاں ابھریں۔

"مجھے غور سے پہچان ذلیل کتے!" پتلی بائی نے نقاب نوچ کر پرے پھینک دیا تھا۔

"اوما!" دوارکا داس کی چیخ نکل گئی۔ اس کی آنکھوں کے سامنے اوما ہاتھ میں سٹین گن تھامے شعلہ جوالہ بنی کھڑی تھی۔

"ہاں اوما۔ وہی اچھوت لڑکی جو تمہاری دانست میں مر چکی ہے!"

پنڈت دوارکا داس اس کے پاؤں سے لپٹ گیا۔ ساری محفل پر سکتہ طاری ہو گیا تھا۔ دوارکا داس کی بیٹی ہملا بت بن کر کھڑی رہ گئی تھی۔ پنڈتوں کے اشلوک کہیں کھو گئے تھے۔ ایک پرکاش تھا جو کسی طرح جان بچا کر کھسک گیا تھا ورنہ اس کے ساتھیوں نے ہر طرف گھیرا ڈال رکھا تھا۔

"ذلیل کتے!" اس نے دوارکا داس کو نفرت سے ٹھوکر ماری۔

"موت کے خوف سے ایک اچھوت لڑکی کے سامنے ہاتھ جوڑ رہا ہے۔ ہاتھ میں نے بھی جوڑے تھے میرے باپ نے بھی جوڑے تھے۔ لیکن تم نے ان پر ترس کھایا تھا کیا؟ —

"اوما بھگوان کے لئے مجھے مار ڈالو لیکن...."

"بکواس بند کر کتے!" وہ چیخ پڑی۔

"میرے باپ نے بھی تم سے یہی کہا تھا — ماسٹر جی نے بھی کہا تھا۔ لیکن تم نے ان سب کو مار ڈالا۔ بزدل برہمن تو آج نہیں مرے گا تجھے اپنے خاندان کا آخری انتقام دیکھنے کے لئے ابھی زندہ رہنا ہوگا۔ آج تو اوروں کی باری ہے۔" اس کے ساتھ ہی اس کی سٹین گن کی لمبی سرخ زبان ہملا کے شوہر کو چاٹ گئی۔

پنڈت دوارکا داس کے دونوں بازو کاٹ دیئے گئے تھے وہ ایک طرف بے ہوش پڑا تھا۔ پھر منشی مہنگا مل کو اس کے سامنے لایا گیا۔ موت کے خوف نے اس کی آدھی جان پہلے ہی نکال دی تھی۔ اوما نے اسے اذیتیں دے دے کر مارا اس کے دونوں ہاتھ اور بازو کاٹ کر سنگینے ہوئے ہون میں پھینک دیا گیا۔ پنڈت رام سروپ کو بھی انہوں نے مار ڈالا۔ پھر اس کے اشارے پہ براہمنوں کی حویلیوں کو اس کے ساتھیوں نے نذر آتش کرنا شروع کر دیا۔

ناگری پہ وہ رات قیامت بن کر ٹوٹی۔ براہمنوں کے قریباً سبھی سرکردہ لوگ مارے گئے لیکن

پرکاش کسی نہ کسی طرح جان بچا کر نکل گیا۔ اوما نے پرکاش کے باپ کو جس حالت میں چھوڑا تھا صبح تک وہ اسی حالت میں سسکتا رہا بالآخر مر گیا۔ ناگری کے اچھوت اس کی مدد کو نہ آئے۔

اس واردات کی بازگشت اخبارات سے نکل کر صوبائی اسمبلی کے ایوانوں میں بھی گونجی۔ ناگری میں "انکوائری کمیشن" آیا۔ اس کی رپورٹ پر اور اچھوتوں کے مسلسل احتجاج کے بعد حکومت نے پنڈت پرکاش کے بھی وارنٹ جاری کر دیئے۔

پنڈت پرکاش خود بھی یہی چاہتا تھا کہ کچھ عرصہ "حکومتی حفاظت" میں گزار دے۔ کیونکہ "بلی بائی" دیوانوں کی طرح اس کا تعاقب کر رہی تھی۔ جیل پہنچ کر پرکاش اپنی دانست میں محفوظ ہو چکا تھا لیکن وہ نہیں جانتا تھا کہ اوما اب وہ معمولی سی اچھوت لڑکی نہیں۔ ڈاکو ہے۔ اور اس سے بھی زیادہ مکار۔

ایک روز کانپور جیل کے دروازے پر رات گئے فوج کی ایک جیپ آ کر رکی۔ قیدیوں کی گنتی بند ہو چکی تھی اور سپرنٹنڈنٹ اپنے گھر آرام کر رہا تھا۔ جیپ میں تین مسلح فوجی اور ایک کیپٹن موجود تھا۔ کیپٹن ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ سے اس کے دفتر میں ملا اور ایک "خصوصی کاغذ" نکال کر اس کے سامنے رکھ دیا۔

اس سرکاری کاغذ پر انسپکٹر جنرل پولیس نے سپرنٹنڈنٹ کو حکم دیا تھا کہ وہ ایک معاملے کی تفتیش کے لئے "پنڈت پرکاش" کو فوج کے حوالے کر دے اور اس واقعے کی کسی کو کانوں کان خبر بھی نہ ہونے دے۔ یہ لوگ اسے اگلے روز رات گئے واپس کر جائیں گے۔ کاغذ کے اوپری حصے پر حکومت کی خصوصی مہر ثبت تھی اور سرخ سیاہی سے "انتہائی خفیہ" کے الفاظ لکھے گئے تھے۔

کیپٹن کے انداز تخاطب ہی سے ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ سہم کر رہ گیا۔ فوجی افسر نے اسے کچھ بھی سوچنے سمجھنے کی مہلت نہ دی اور "کاغذی کارروائی" مکمل کر کے اکہرے پریشان اور بوکھلائے پنڈت پرکاش کو ان کے حوالے کر دیا۔ آندھی کی طرح یہ لوگ آئے تھے اور طوفان کی طرح واپس چلے گئے۔

پنڈت پرکاش کے کسی بھی سوال کا جواب انہوں نے جیل میں دینے سے انکار کر دیا۔ اس نے اپنے وکیل سے فون پر بات کرنے کی اجازت مانگی تو کیپٹن نے اس کے منہ پر تھپڑ رسید کر دیا۔ ڈپٹی سمجھ رہا تھا کہ معاملہ خاصا سنگین ہے۔ پرکاش کو وہ لوگ آنکھوں پر پٹی باندھ کر باہر لے آئے اور ابھی جیپ میل ڈیڑھ میل دور ہی گئی ہو گی کہ ایک ندی کے نزدیک وہ لوگ رک گئے جہاں ایک اور جیپ ان کی منتظر تھی۔

پرکاش کو انہوں نے دوسری جیپ والوں کے سپرد کر دیا اور خود واپس چلے گئے جب اس کی آنکھوں سے پٹی اتاری گئی تو اس نے خود کو ایک کمرے میں بند پایا جس کے دروازے پر دو مسلح نگہبان کھڑے تھے۔ جب پرکاش کی آنکھیں دیکھنے کے قابل ہوئیں تو اس نے شدت سے خواہش کی کہ وہ اندھا ہی ہو جاتا یہ منظر دیکھنے سے پہلے اس کے سامنے اوما کھڑی تھی۔

قہر کی دیوی "بلی بائی" بن کر —!

"تم" — دہشت سے اس کی آنکھیں پھٹنے کو آ رہی تھیں۔

"ہاں میں" — اوما کا قہقہہ بلند ہوا۔ "غور سے دیکھ مجھے پنڈت پرکاش... دیکھ مجھے..." وہ رعد کی طرح کڑکی۔

"اوما بھگوان کے لئے — اب تو میرا سب کچھ ختم ہو چکا ہے، معاف کر دو مجھے —" وہ گھگیایا اور بزدلوں کی طرح رونے لگا۔

"بکو مت" — قہر کی دیوی دھاڑی۔ "تم جیسے کمزور انسانوں کا بوجھ جب تک اس دنیا پر رہے گا مجھ ایسی ڈاکو لڑکیاں پیدا ہوتی رہیں گی۔ اور میں نہیں چاہتی کہ میرے بعد کوئی اچھوت لڑکی میری طرح تباہی کے راستے پر چلے۔"

پرکاش نے چاہا کہ اس کے پاؤں چھو کر معافی مانگے لیکن منہ پر لگنے والی زوردار ٹھوکر نے اسے الٹا کر پرے پھینک دیا۔ اوما کے ہاتھ میں پکڑے کوڑے میں جیسے بجلی بھر گئی تھی۔

اگلے روز علی الصبح ناگری کے لوگوں نے دیکھا پنڈت پرکاش نیم مردہ حالت میں گاؤں کے باہر کوڑے کرکٹ کے ڈھیر پر پڑا ہے۔ اس کی دونوں آنکھیں نکال دی گئی تھیں۔ ہاتھ کٹے ہوئے تھے

WWW.PAKSOCIETY.COM
Scanned PDF

اور جسم کے بند بند پر اذیت کے نشان نمایاں تھے۔ پولیس کے اس تک پہنچنے سے پہلے وہ زندہ ضرور تھا لیکن جب اس کا منہ کھولا گیا تو زبان کٹ چکی تھی۔

وہ پولیس کو کچھ نہ بتا سکا۔ نہ ہی ڈاکٹر اس کے تن مردہ میں جان ڈال سکے۔ اس انتظام کے بعد شاید اوما کی کہانی مکمل ہو چکی تھی۔ کسی نے اس کے بعد "تتلی بائی" کا نام نہیں سنا۔ جمعدار سنگھ [illegible] میں مارا گیا تھا۔ لیکن "تتلی بائی" پولیس کو ہزار کوشش پر بھی نہ ملی۔ کبھی کبھی یہ سننے میں آتا تھا کہ اسے فلاں جگہ کسی خانقاہ پر دیکھا گیا۔ لیکن پولیس کے وہاں پہنچنے پر علم ہوتا کہ وہ کوئی اور تھی۔ تتلی بائی نہیں تھی۔

احتجاج

فائرنگ تھم گئی تھی۔!

پچھلے پندرہ بیس منٹ سے اس کے تعاقب میں لپکنے والے شعلے سرد پڑ چکے تھے۔ لیکن ابھی تک اس نے اپنا سر گھٹنوں سے باہر نہیں نکالا تھا۔ اس کی حالت ایسے چور کی سی ہو رہی تھی، گاؤں کے تمام کتے جس کو پھاڑ کھانے کے لئے بے قرار ہوں۔

گزشتہ پندرہ روز سے ایک دن بھی تو سکون سے نہیں گزرا تھا۔ ہر دوسرے تیسرے اسی طرح اچانک وہ سکیورٹی فورسز کے گھیرے میں آجاتا تھا۔ اس کی خوش قسمتی تھی، یا حسن اتفاق کہ اب تک وہ سکیورٹی سے بچا ہوا تھا۔ آج بھی پچھلے دس گھنٹے سے اس نے یہاں گاؤں کے باہر اپنے ایک دوست کی حویلی میں پناہ لے رکھی تھی۔ شام ڈھلنے پر اس نے واگھو رو کا شکار ادا کیا کہ اب رات سکون سے گزرے گی لیکن کسی مقامی مخبر کو اس پر شک ہو گیا تھا اور اس نے نزدیک ہی موجود فوجی آرمی کی پوسٹ پر اطلاع کر دی۔

یہ اس کی خوش قسمتی تھی اور آنے والوں کی بدبختی کہ وہ جیپوں میں بیٹھ کر یہاں آئے اور انہوں نے گاؤں کو گھیرے میں لے کر ہوائی فائرنگ شروع کر دی جس نے حوالدار کرمجیت سنگھ کو ہوشیار کر دیا۔ وہ اپنی گن سمیت یہاں سے نکل جانے میں کامیاب ہو گیا۔ کیونکہ وہ تربیت یافتہ کمانڈو تھا۔ شاید اسی لئے پولیس نے اس کے نزدیک جا کر اسے پکڑنے کا خطرہ مول نہیں لیا اور پہلے گھیرا تنگ کرنے کی کوشش

WWW.PAKSOCIETY.COM

کی اس کمزوری سے فائدہ اٹھا کر وہ نکل گیا اور کھیتوں کے بیچوں بیچ بھاگتا دریا کے کنارے بڑے بڑے سرکنڈوں میں چھپ کر بیٹھ رہا۔

اس کے تعاقب میں آنے والے اندھا دھند فائرنگ کر رہے تھے لیکن اس کے تربیت یافتہ اور حساس کانوں نے اندازہ کر لیا تھا کہ ان لوگوں کو ابھی تک اس کی سمت کا بھی علم نہیں ہو سکا۔ اور وہ خواہ مخواہ اسلحہ پھونک کر اسے خوفزدہ کرنا چاہتے ہیں۔ سرکنڈوں کے عین درمیان پہنچ کر وہ ایک جگہ سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ اپنی گن اس نے راؤنڈز سے بھرے پتلے سمیت گود میں رکھ لی اور سر پیچا کر کے بیٹھ رہا۔

سرکنڈوں کے باہر وہ رک رک کر فائرنگ کرنے والے عام سپاہی تھے اور کرمجیت سنگھ اندازہ کر سکتا تھا کہ فائرنگ کرتے ہوئے بھی ان کے ذہنوں پر اس کا خوف مسلط تھا۔ اگر وہ چاہتا تو اپنی تربیت کے بل بوتے پر ان میں سے ایک کو بھی زندہ نکل جانے کا موقع نہ دیتا۔ لیکن نہ جانے کیا سوچ کر اس نے وہیں دبک کر بیٹھ رہنے کا فیصلہ کیا۔ شاید اسے ان رنگروٹوں پر رحم آ رہا تھا جو اپنی تربیت مکمل کرتے ہی قربانی کے بکرے بنا کر یہاں پنجاب بھیج دیئے گئے تھے۔

پندرہ بیس منٹ تک اسلحہ پھونکنے کے بعد وہ لوگ واپس چلے گئے۔ کرمجیت سنگھ نے اپنا سر اوپر اٹھایا اور اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر صورت حال کا جائزہ لینے لگا۔ برسات کی رات تھی پچھلے دو روز سے بارش کچھ تھمی ہوئی تھی۔ لیکن آج سہ پہر شام ہی بادلوں کی ٹکڑیاں آسمان پر اٹکھیلیاں کرنے لگی تھیں اس نے آسمان کی طرف دیکھا جو بادلوں سے ڈھکا چکا تھا۔ چاند کسی بادل کی اوٹ سے سکڑا سمٹا کبھی کبھی باہر جھانک لیتا تو فضا قدرے روشن ہونے لگتی۔

قریباً آدھ گھنٹہ وہ اسی پوزیشن میں بیٹھا رہا۔ پھر نپے تلے قدموں سے دریا کی طرف روانہ ہو گیا۔ دریا کے کنارے پر رک کر اس نے تند ہتھیا جل کھاتی لہروں پر نظریں گاڑ دیں۔ کچھ ایسا ہی طوفان اس کے اندر بھی سب سے اٹھ رہا تھا۔ دریا اپنے کناروں سے باہر آنے کے لئے بے چین تھا۔ برسات نے اس کی طغیانیوں کو بری طرح بھڑکا دیا تھا۔ اسے یاد آ گیا جب وہ آخری مرتبہ اپنی کمپنی کے ساتھ تربیت میں اس

جیالی کے پل پر سے گزرا تو دریا بالکل سوکھا پڑا تھا۔ کہیں پانی جوہڑوں کی شکل میں جمع نظر آتا تھا جس میں نوعمر دیہاتوں کی گائیں اور بھینسیں بمشکل اپنا آپ بھگو رہی تھیں۔

ایک بڑے پتھر پر بیٹھ کر اس نے اپنے جوتے اتار کر ایک طرف رکھ دیئے۔ پتلون کے پائنچے چڑھا دیئے اور پاؤں گیلی ریتلی زمین پر رکھ دیئے۔ خیالات کا ایک جوار بھاٹا اس کے اندر بڑی تیزی سے اٹھا اور اسے بہا کر یہاں سے کچھ دور گورداسپور کے ایک سرحدی علاقے میں واقع اس کے گاؤں میں لے گیا۔

کرمجیت سنگھ اپنے باپ کا اکلوتا بیٹا تھا اور پیدائش پر اسے دشمنی ورثے میں ملی تھی۔ جس خاندان سے اس کا تعلق تھا اس کے آٹھ اور مخالفوں کے دس آدمی مارے جا چکے تھے۔ دونوں کا جیلوں میں آنا جانا لگا ہی رہتا تھا۔ لیکن مکھن سنگھ نے اپنے بیٹے کو کبھی تتی ہوا بھی نہ لگنے دی۔ اس کے بھائی اسے اکثر بزدل ہونے کا طعنہ دیتے کہ وہ اپنے بیٹے کو نپدر باپ کی طرح پال پوس رہا ہے۔ لیکن مکھن سنگھ نے کبھی اس کی پروا نہ کی۔ اکثر وہ کرمجیت کو اپنے ساتھ ہی رکھتا۔ گاؤں کے گوردوارے کا گرنتھی شام کے بعد اس کے ڈیرے پر ہی کرمجیت کو آ کر کچھ پڑھنا لکھنا جاتا۔ وہ اپنی اکیلی "رستان" کی زندگی کا خطرہ مول لینے کے لئے کبھی تیار نہ ہوا۔

جب برادری کے طعنے بہت بڑھے تو اس نے کرمجیت کو دل پر پتھر رکھ کر فوج میں بھرتی کروا دیا اور برادری کو یہی بتایا "چھ مہینے اس طرح رائفل چلانا سیکھ جائے گا"۔۔۔!

کرمجیت سنگھ کے آغاز میں بھرتی ہوا۔ اس کا قد کاٹھ دیکھ کر کوئی بھی اس کی عمر کے متعلق اندازے کی غلطی کا شکار کر سکتا تھا۔ ریکروٹ سنٹر میں دوران تربیت ہی اسے دوسرے ریکروٹوں سے الگ کر کے خصوصی کمانڈو ٹریننگ دی گئی تھی اور تربیت مکمل ہوتے ہی مشرقی پاکستان روانہ کر دیا گیا۔

مشرقی پاکستان میں ان دنوں بھارتی مداخلت اپنے عروج پر تھی اور بھارتی مداخلت کار کھلے بندوں اپنی کارروائیوں میں مصروف تھے۔۔۔ ان کی مدد کے لئے بھارتی افواج سرحدوں کے ساتھ ساتھ بڑی تیزی سے مورچہ بند ہو رہی تھیں تاکہ اشارہ ملتے ہی تراتی کا بازار گرم کر دیں۔

تب کرمجیت کو سیاست کی الف بے کا بھی علم نہیں تھا۔ وہ خود کو نہتا دیکھ کر بھارت ماتا کی

Scan by PDF WALA

تر کھشا" کرنے یہاں آیا تھا۔ اسے یہی تربیت دی گئی تھی کہ مسلمانوں نے ان کے گورؤں کو مار ڈالا تھا۔ مغلوں نے سکھوں کے ساتھ بڑے ظلم کئے تھے اپنی مذہبی تعلیمات کی رُو سے اسے مسلمانوں پر کبھی اعتبار نہیں کرنا تھا۔

جنگ شروع ہوئی تو وہ اپنی کمپنی کے ساتھ مختلف محاذوں پر برسرِ پیکار رہا۔ مذہبی جنون اور پروپیگنڈہ کے زیرِ اثر جس کا وہ اب تک شکار رہا تھا اس نے ہر محاذ پر داد شجاعت دی اور بڑھ بڑھ کر "مسلمان فوج" پر حملے کرتا رہا۔

جنگ کے خاتمے پر اسے پاکستانی قیدیوں کی ایک ٹرین کے ساتھ آسام کی طرف روانہ کر دیا گیا۔

— اسے آج ایک مسلمان فوجی کی کہی وہ بات بڑی شدت سے یاد آ رہی تھی جسے اس نے کھڑکی سے باہر جھانکنے کی کوشش کرنے پر ڈانٹا تھا۔ فوجی نے اس کی طرف بڑے تمسخر سے دیکھتے ہوئے کہا تھا:

"سردار جی! ہماری اور ہندو کی جنگ تو ہزار سال سے جاری ہے اور جانے کب تک چلتی رہے گی۔ یہ ہار جیت بھی لڑائی کا حصہ ہے۔ ہم اپنے دین اور وطن کی عظمت کے لئے لڑتے ہیں اور ہندو اپنے ماتا کے لئے — لیکن تم ہمارے بیچ کیوں آ گئے ہو — تم ابھی بچے ہو میری بات سمجھ نہیں سکو گے۔ ممکن ہے ہم سے بچ جاؤ لیکن ہندو تمہیں کبھی نہیں چھوڑے گا۔ یہ اپنی فطرت کے مطابق تمہیں ضرور ڈسے گا۔ پھر تمہاری اپنی پہچان ہے بھی کیا؟"

آج دریائے بیاس کے کنارے اپنے پاؤں پانی میں لٹکا کر بیٹھا کرمجیت سوچ رہا تھا۔ واقعی اس کی پہچان کیا ہے؟ اسے رہ رہ کر ایک یہی پچھتاوا ڈس رہا تھا کہ آج سے ۴ سال پہلے اس نے مسلمان فوجی کی بات کا مطلب کیوں نہ جان لیا۔

"کرمجیت سیاں" — کوئی اس کے اندر سے پکارا۔ "تجھے پتھر چاٹ کر بھی واپس مڑنا ہے۔"

تب شاید اسے اتنا شعور بھی نہیں تھا کہ بُرے بھلے کی تمیز کر سکتا یا پھر وہ اپنی سطح سے آگے کچھ سوچ ہی نہیں سکتا تھا۔ جنگ کے خاتمے پر اسے بہادری کے اعزاز سے نوازتے ہوئے خصوصی کمانڈو ٹریننگ کے لئے بھیج دیا گیا۔

جب وہ ٹریننگ حاصل کر کے واپس لوٹا تو مثلی کمانڈو اور لانس نائیک بن چکا تھا۔ اپنی یونٹ میں وہ کبڈی کا بہترین کھلاڑی گنا جاتا تھا۔ جب کبھی چھٹی پر کرمجیت گاؤں جاتا اس کا والد اپنے مسلح محافظوں کے ساتھ ریلوے سٹیشن پر ہی اسے لینے آ جاتا — وہ اپنے بیٹے کی زندگی کا خطرہ مول نہیں لینا چاہتا تھا۔

اس نے بھی اپنی دشمنی کی ہوا بھی کرمجیت کو نہ لگنے دی۔ اکثر مواقع پر اس کے بھائی کرمجیت کو ورغلانے کی کوشش کرتے اور اس کی غیرت کو للکار کر اسے بدلہ لینے پر تیار کرتے۔ لیکن اس کا باپ مکھن سنگھ اسے بازو سے پکڑ کر کھینچتا ہوا گھر لے آتا۔

اس نے اپنے بھائیوں سے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ وہ ان کی لاکھ خواہش کے باوجود اپنے بیٹے کو جلتی ہوئی آگ میں نہیں پھینکے گا"!

خود کرمجیت بھی اپنے والد کے جذبات کا احترام کرتا۔ پھر وہ خود کو فوجی ہونے کے ناطے بھی ان سے الگ تھلگ کوئی چیز سمجھتا تھا۔ اسے اپنا مستقبل خاصا روشن دکھائی دیتا تھا۔ اسے امید تھی کہ وہ اپنے ساتھیوں سے آگے نکل جائے گا۔ بریگیڈ کمانڈر پریڈ کا معائنہ کرتے ہوئے بھی دو تین مرتبہ اسے خود مخاطب کر کے شاباش دی تھی —!

کرمجیت اپنے باپ کی خواہش کا احترام ضرور کرتا اگر اس نے ستونت کور کو نہ دیکھا ہوتا۔ ایک روز جب وہ مویشیوں کو تاؤ دیئے کر پان ہاتھ میں تھامے اپنے گاؤں کے باہر کچی سڑک کی طرف لاری پر بیٹھ کر شہر جانے کے لئے جا رہا تھا تو کھیتوں کی ایک پگڈنڈی پر کو عبور کرتے ہوئے ستونت کور اچانک ہی اس کے سامنے آ گئی — کرمجیت اپنے خیالوں میں مگن چلا جا رہا تھا اس کے کمپنی کمانڈر نے اس کے نائیک ہونے کی سفارش کے کاغذات ہیڈ کوارٹر کو بھیج رکھے تھے اور وہ یہ سوچتا اور مسکراتا ہوا لاری اڈے کی طرف جا رہا تھا کہ جب چھٹی کاٹ کر یونٹ میں پہنچے گا تو اس کے نائیک ہونے کے آرڈرز بھی آ چکے ہوں گے۔

اچانک ہی جب ستونت کور اس کے سامنے آئی تو ایک زلزلہ سا تھا جس سے اس کے خیالات کا تسلسل ٹوٹ گیا۔ ستونت کور بھی کھیتوں کے بیچوں بیچ بھاگتی ہوئی آ رہی تھی۔ ایک دوسرے کو اچانک

WAQAR
Scan & PDF

آمنے سامنے پاکر دونوں ہی ٹھٹک کر رہ گئے ۔ !

اپنے دشمنوں سے کر مجیت کا براہ راست ٹکراؤ نہیں ہوا تھا۔ لیکن ایسی بات بھی نہ تھی کہ اب وہ حاکم سنگھ کی بیٹی کو نہ پہچانتا۔ دونوں نے اپنا بچپن اکٹھے ان ہی پگڈنڈیوں پر جیتا یا تھا۔ وہ تو گردش حالات تھی جس نے دونوں کو کھینچ کر الگ کر دیا تھا اور ان کے درمیان ایک مضبوط دیوار بھی تان دی تھی جس کے آر پار جھانکنا ہی دونوں کے لئے ممکن نہیں رہا تھا۔

"ست سری اکال" ۔۔۔ پہل ستونددر کور ہی نے کی۔

"جے ہند" ۔۔۔ کر مجیت نے اپنے خول سے باہر نکلنا پسند نہ کیا۔

"اونہہ! رہا نہ وہی فوجی کا فوجی" ۔۔۔ ستونددر کور نے کہا اور ہنستی ہوئی بھاگ گئی۔

کر مجیت کا دل دھک سے رہ گیا۔ اس نے سوچا واقعی اسے کبھی کبھی عام انسان بھی بننا چاہیئے لیکن بر کا ہوا اس کی تربیت کا جس نے اسے کمانڈو بنا دیا تھا اور ہر وقت وہ خود کو آن ڈیوٹی ہی محسوس کرتا تھا۔

ستونددر کو اس نے آج کم و بیش چار پانچ سال کے بعد دیکھا تھا اور دیکھتا ہی رہ گیا۔ وہ اس کے خاندانی دشمن حاکم سنگھ کی بیٹی تھی۔ لیکن کر مجیت نے اندازہ کر لیا تھا کہ اس کی طرح ستونددر بھی ان دشمنیوں کے چکر میں پڑنا نہیں چاہتی۔ اس نے ملاقات پر کسی "خوشگوار تاثر" کا اظہار نہیں کیا تھا۔ لیکن اس کے سلام کا جواب جس انداز سے کر مجیت نے دیا اس پر نہ جانے ستونددر کیا سوچتی ہوگی؟ یہی کچھ سوچتا وہ اداری انداز سے کی طرف چل پڑا دیا۔

شام گئے وہ جب واپس گاؤں لوٹا تو کھیتوں کے سلسلے میں اسی موڑ پر ایک مرتبہ پھر ستونددر سوال بن کر اس کے سامنے آن کھڑی ہوئی۔ اب وہ اتنا بے وقوف بھی نہیں تھا کہ یہ اندازہ بھی نہ کر پاتا کہ یہ ملاقات "اتفاقی" نہیں۔

صاحب سلامت کا سلسلہ طے کرنے پر جب اس نے قدم آگے بڑھایا تو ستونددر نے اپنا بازو اس کے سامنے کر کے رکنے کا اشارہ کیا! ۔۔۔

"دشمنی تمہارے اور میرے باپ کی ہے میری اور تمہاری نہیں" ۔۔۔ پنجابی جٹی کی آواز پر پچھتاوے

یا تاسف کا گمان قطعاً نہیں ہوتا تھا۔

"گاؤں میں کسی نے مجھے اور تمہیں بات کرتے دیکھ لیا تو قیامت آجائے گی" ۔۔۔ اس نے فرار چاہا۔

"مجھے پروا نہیں کسی بھی قیامت کی۔ میں نہیں ڈرتی کسی سے ۔۔۔ اور تم ۔۔۔ تم فوجی ہو کر اتنے بزدل کیوں ہو۔ میں نے سنا تھا تمہیں بہادری کا تمغہ بھی ملا ہے ۔۔۔ تمہاری ترقی ہو گئی ہے۔ تم ڈرتے کیوں ہو؟"

ستونددر اس کے بارے میں اتنی باخبر ہے کر مجیت کے لئے یہ سوچ بھی بڑی خوشگوار تھی۔

"میں ڈرتا نہیں ہوں" ۔۔۔ اس نے جاٹ سکھوں کے مخصوص لہجے میں کہا۔ "بس یونہی جھگڑے میں پڑنے کو جی نہیں چاہتا"

"کس نے کہا ہے تم سے اس جھگڑے میں پڑنے کو۔ ختم کرو یہ جھگڑا" ستونددر نے اپنا بازو اس کی طرف بڑھا دیا۔

کسی لاشعوری عمل کے تابع اس نے ستونددر کا بازو پکڑ لیا۔ اسے بالکل احساس نہیں ہو رہا تھا کہ وہ کیا کرنے جا رہا ہے۔

"اب مرد بنا۔ اگر بازو تھاما ہے تو اسے چھوڑنا نہیں" ستونددر نے پھر اس کی مردانگی کو للکارا۔

"یہ ایک سکھنی کا وچن ہے ستونددر۔ میں اگر شادی کروں گا تو تم سے ۔۔۔ ورنہ اور کسی سے نہیں"

اس کی بات مکمل ہوتے ہی کھیتوں میں سرسراہٹ ہوئی ۔۔۔ دونوں چونکے شاید کوئی اسی طرف آ رہا تھا۔

"میں تمہارا انتظار کروں گی ۔۔۔ نہ آئے تو زہر پھانک لوں گی" ۔۔۔ ستونددر نے اپنے بازو پر سے اس کا ہاتھ آہستگی سے علیحدہ کرتے ہوئے کہا اور وہ جس طرح اچانک نمودار ہوئی تھی اسی طرح غائب بھی ہو گئی۔

ساری رات کر مجیت نے کروٹوں کی نذر کر دی۔ کیا مجال جو ایک پل کے لئے بھی اس کی آنکھ لگی ہو۔ اسے ستونددر کے چلے جانے کے بعد احساس ہوا تھا کہ نادانستگی میں کیسا وچن اس نے ستونددر کو دے دیا ہے۔ حاکم سنگھ کے جیتے جی اس کی اکلوتی بیٹی سے شادی ۔۔۔ یہ بات تو سوچی بھی نہیں جا سکتی تھی۔

Scan by PDF

اچھی بھلی گزر رہی تھی، ستونڈر نے اچانک ہی اس کا بچپن اسی کے سامنے زندہ کر دیا۔ اسے سب کچھ یاد آ گیا۔ ستونڈر کے ساتھ کھیلنا۔ دونوں کا اکٹھا مل کر گھر اور گڑیاں بنانا۔ اب تو حیرت اس بات پر ہو رہی تھی کہ آج تک اسے کبھی ستونڈر کا خیال اس شدت سے آیا کیوں نہیں؟

کہ محبت نے جو کہا کر کے دکھا دیا۔!

تین چار ماہ بعد جب بھی وہ چھٹی پر آتا ستونڈر سے ضرور ملتا۔ دونوں نے اپنی ملاقاتوں کے لیے متبادل تلاش کر لیا تھا۔ سائیسوں کی مائی منگتی کا گاؤں کے ہر گھر میں آنا جانا تھا۔ اس کے ذریعے دونوں کے پیغامات ایک دوسرے کو منتقل ہوتے رہتے تھے۔

بات منہ سے نکلی اور شہر میں پھیلی ستونڈر کو کریدکر جیتو نے اس سے کہ محبت کی محبت کا اقرار کروا لیا۔ اگلے ہی روز حاکم سنگھ خونخوار آنکھوں کے ساتھ اس کے سامنے موجود تھا۔!

"بے غیرت۔ تجھے لاج نہ آئی۔ دشمن کے بیٹے سے ملتی ہے۔ تیرا شیر جیسا بھائی اس کے ماموں نے مار ڈالا تھا۔ آج زندہ ہوتا تو....." حاکم سنگھ کی آواز بھرا گئی۔ اسے اپنا بیٹا یاد آ گیا تھا جسے کہ محبت کے ماموں نے بٹالہ کچہری میں سب کی آنکھوں کے سامنے گولی مار دی تھی۔

"بالو! اس میں کہ محبت کا کیا قصور۔ وہ تو کبھی لڑائی جھگڑے میں آیا ہی نہیں۔ اس کے باپ نے بھی کبھی حصہ نہیں لیا۔ بس یہی گناہ ہے ان کا کہ وہ ہمارے دشمنوں کے رشتہ دار ہیں۔"

"زبان بہت چلانے لگی ہے تو۔ اکیلی ستتان ہے نا ورنہ تیرے ٹکڑے کر کے ابھی مکھن سنگھ کے گھر کے سامنے پھینک آتا۔ آج کے بعد اگر گھر سے پاؤں باہر نکالا تو....." حاکم سنگھ غصے میں کھولتا ہوا باہر نکل گیا۔

دروازے پر اس کی ملاقات گیانی کرپال سنگھ سے ہو گئی۔!

"واہے گورو جی کا خالصہ۔ واہے گورو جی کی فتح۔" اس گیانی سنگھ کو دیکھتے ہی "فتح" بلائی۔

"کیا بات ہے حاکم سیہاں۔ بڑے پریشان نظر آ رہے ہو۔" گیانی نے "فتح" کا جواب دیتے ہوئے کہا

"کیا عرض کروں گیانی جی!" حاکم سنگھ کو سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ انہیں کیا کہے۔ "ادھر آؤ میرے ساتھ

... بڑھے گیانی نے اسے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔ دونوں گوردوارے میں آ گئے۔ حاکم سنگھ گیانی جی کا دل سے احترام کرتا تھا۔ سارا گاؤں ہی ان کا عقیدت مند تھا۔ کیونکہ گیانی نے کبھی کوئی غیر مذہبی بات نہیں کہی تھی۔ کوئی غیر اصولی حرکت نہیں کی تھی۔ وہ خود اچھا بھلا زمیندار تھا لیکن "گورو گھر" کی محبت [illegible] کا ہو رہا۔ گاؤں کی پنچائت میں اس کا خاصا رسوخ تھا اور آج تک وہ کسی کے سامنے جھکا نہیں تھا۔ اس کی یہی خوبی اسے دوسروں سے ممتاز کرتی تھی۔

"میں جانتا ہوں حاکم سیہاں! تم مجھ سے کیا چھپاؤ گے۔ لیکن میری ایک بات غور سے سن لو۔ واہگورو نے تمہیں ایک موقع دیا ہے سنبھلنے کا۔ اس قتل و غارت کو ختم کرنے کے لئے اگر تم سے کوئی نیک کام ہو جائے تو اس میں شک محسوس نہ کرنا۔ حاکم سیہاں! میری زندگی کا بھروسہ نہیں۔ لیکن میری ایک بات کان کھول کر سن لو۔ ہماری قوم پر بہت برا وقت آنے والا ہے۔ مجھے "گورو دسم پادشاہی" نے برسوں درشن کروائے تھے۔ "نکئی دھر پادشاہ" نے مجھے بتا دیا ہے کہ "نیچھ" کی "ہرخمدی کلا" کو خطرہ آیا کہ آیا۔ حاکم سیہاں ہندو نے ہم سے جو کام لینا تھا لے لیا۔ ۱۹۴۷ء میں مسلمانوں کا قتل عام کروایا۔ اب سکھ فوجیوں سے پاکستان توڑنے کا کام لیا ہے۔

حاکم سیہاں توڑ پھوڑ کا عمل شروع ہو چکا ہے۔ اب ہماری باری بھی آئی۔ یاد رکھنا ہندو ہمیں معاف نہیں کرے گا کیونکہ اس نے محسوس کر لیا ہے کہ اب سکھ قوم میں اپنے تشخص کا شعور بیدار ہونے لگا ہے ہندو تمہیں "ہندوستانی بنو" کا درس دیتا رہے گا اور خود صرف "ہندو" بنتا جائے گا۔ حاکم سیہاں ۱۹۴۷ء کی غلطی کا احساس آج مجھے ہو رہا ہے۔ رب کا واسطہ اپنی ذاتی دشمنیاں بھول کر اب "نیچھ" کی "ہرخمدی کلا" کے لئے اکٹھے ہو جاؤ۔ میں نے کل مکھن سیہاں کو بھی یہی سمجھایا ہے۔ وہ راضی ہے۔ تمہارے گھر آ کر رشتہ مانگے گا۔ تیری اکلوتی بیٹی ہے اور اس کا اکلوتا بیٹا۔ تم دونوں اس دشمنی کے چکر سے نکل جاؤ۔"

گیانی جی کے منہ سے پہلی مرتبہ حاکم سنگھ نے سیاسی گفتگو سنی تھی۔ اس سے پہلے اس نے گاؤں کے کچھ لڑکوں کو جو امرتسر سے آئے تھے "مدی کمال" کے سنت جرنیل سنگھ کی باتیں کرتے سنا تھا۔ یہ

WWW.PAKSOCIETY.COM
Scanned PDF

نوجوان سنت جی سے کچھ زیادہ ہی متاثر ہو گئے تھے۔ گاؤں واپسی پر انہوں نے بتایا تھا کہ سنت جی انہیں "امرت دھاری" بنا دیا ہے اور اب وہ ان کے حکم کے مطابق ہر وقت "مسستر" لگا کر رکھیں گے۔

ان نوجوانوں کے لیڈر کو جو سکھ سٹوڈنٹس فیڈریشن کا سرگرم رکن بھی رہا تھا۔ کل ہی سیکورٹی والے پکڑ کر لے گئے تھے۔ آج شام تک اس کا کوئی سراغ نہیں ملا تھا کہ اسے کہاں لے جایا گیا ہے۔ بس سرپنچ کو تھانے کے منشی نے اتنا بتایا تھا کہ اسے سیکورٹی والے امرتسر لے گئے ہیں۔ اب اس کی واپسی قسمت سے ہی ہوگی۔

"مہاراج جی! میری مجال نہیں کہ آپ کی بات ٹال سکوں لیکن آپ تو جانتے ہیں گاؤں والے میرا جینا دوبھر کر دیں گے۔ مجھے بھی اس لڑائی جھگڑے سے اتنی ہی نفرت ہے جتنی مکھن سنگھ کو۔ اور یوں بھی چھندے کے مرنے کے بعد میرا اب رہا بھی کون ہے یہاں۔ اس دشمنی نے میرا بیٹا مجھ سے چھین لیا۔ میرا دل یہ نہیں چاہتا کہ اپنی بیٹی کو بھی دکھی کر دوں۔ لیکن گیانی جی! آپ تو میری برادری کو جانتے ہی ہیں ناں!"

"جہنم میں گئی تمہاری برادری حاکم سیہاں! میں نے مکھن سے بات کر لی ہے۔ تم اپنا من صاف کر لو واہگورو کرپا کرے گا۔"

پندرہ بیس روز بعد "گرپورب" کے روز گاؤں کے تمام لوگ بڑی حیرانی سے یہ منظر دیکھ رہے تھے جب گیانی کرپال سنگھ نے ارداس کے خاتمے پر گورنجش سنگھ اور حاکم سنگھ کو بغل گیر کرواتے ہوئے دونوں کی زبانی اعلان کروا دیا کہ آج سے ستوندر اور کرمجیت بیتی بنتی ہیں۔ دونوں کی منگنی کا اعلان وہیں کر دیا گیا۔ گیانی کرپال سنگھ نے ہی گاؤں والوں سے کہا کہ اگلی چھٹیوں پر فوجی کرمجیت سنگھ کے "پھیرے" ستوندر سے ہو جائیں گے۔!

دونوں برادریوں پر یہ خبر بجلی بن کر گری۔!

دونوں برادریوں نے حاکم اور مکھن کا ایک طرح سے سوشل بائیکاٹ ہی کر دیا۔ لیکن وہ ذہنی طور کسی بھی ردعمل کے لیے تیار تھے۔ دوسری طرف ستوندر سے منگنی کی خبر نے جیسے کرمجیت کے جسم میں بجلیاں بھر دیں۔ اس نے کمانڈو کورس میں اپنے گروپ میں ٹاپ کیا اور ایک روز وہ بھی آ گیا جب

کرمجیت سنگھ حوالدار بن کر گاؤں واپس لوٹا۔

حالات کا دھارا بڑی تیزی سے اپنا رُخ بدل رہا تھا۔ کرمجیت دو چار محکمانہ امتحانات پاس کرنے کے بعد اب حالات کو سمجھنے بوجھنے لگا تھا۔ اس نے واضح طور پر محسوس کر لیا تھا کہ فوج میں ایک سازش کے تحت سکھوں سے نجات حاصل کی جا رہی ہے۔

جنرل شوبیگ سنگھ کو جسے بھارتی فوج میں "مکتی باہنی" کے ذریعے پاکستان کو دو ٹکڑے کرنے کے ضمن میں ہیرو کی حیثیت حاصل تھی۔ مکھن سے بال کی طرح الگ کر دیا گیا تھا۔ بجائے اس کے کہ اسے کوئی سینئر رینک دیا جاتا اسے فوج سے نکال دیا گیا۔!

جس روز یہ اطلاع سکھ یونٹوں میں پہنچی اسی روز پہلی مرتبہ دوسرے سکھ فوجیوں کی طرح کرمجیت نے سوچا کیا ہماری قربانیوں کا یہی صلہ ہے؟ اس کے بعد سے تو یہ سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ شاید ہی کوئی سینئر رینک کا سکھ آفیسر بھارتی فوج میں باقی رہ گیا ہو۔ ورنہ تو سب کو جبری ریٹائرمنٹ پر گھر واپس بھیج دیا گیا تھا۔

اسی دوران سکھوں کے مقدس مقام دمدمی ٹکسال کے گرنتھی سنت جرنیل سنگھ بھنڈرانوالہ کی شخصیت سکھ مصلح قوم کی حیثیت سے نمایاں ہونے لگی تھی۔ ان کی تقریروں کے کیسٹ چوری چھپے سکھ یونٹوں میں آنے لگے تھے لیکن جس کسی سے یہ کیسٹ برآمد ہو جاتا اسے سزا ملتی تھی۔ حوالدار کرمجیت سنگھ کو اس فیصلے سے بڑی الجھن ہوتی۔ وہ سوچنے لگتا کیا اپنے مذہبی رہنما کے خیالات سے استفادہ کرنا بھی جرم ہے؟

اس کے دیکھتے ہی دیکھتے سکھوں اور ہندوؤں کے درمیان ایک دوسرے کو قتل کرنے کی مہم بھی شروع ہو گئی۔ سنت جرنیل سنگھ بھنڈرانوالہ نے اپنے پیروکاروں کو تبلیغ کرنا شروع کر دی تھی کہ وہ سکھ روایات کے مطابق خود کو مسلح رکھیں اور فوجی تربیت حاصل کریں۔ انہیں ہندوؤں سے نجات حاصل کر کے بہرحال الگ ملک بنانا ہوگا۔ سنت جی نے اپنی قوم کے دلوں میں ایک آگ سی لگا دی تھی۔ اس آگ میں جہاں ہندو ذہنیت جھلسی وہاں اس کے شعلوں سے سکھوں کے

Scan by PDF WAQAR

بھی محفوظ نہ رہے اور دیکھتے ہی دیکھتے جعلی پولیس مقابلوں کی ایک لہر چل نکلی۔

آئے روز پنجاب کے اخبارات ایسی خبروں سے بھرے ہوتے تھے کہ فلاں جگہ جعلی پولیس مقابلے میں سکھ ڈاکو یا مفرور مارا گیا۔ حوالدار کرمجیت اپنی کڑمائی کے لئے جس روز چھٹی پر گاؤں آیا اس روز شام کو گیانی کرپال سنگھ اسے گھر پہ ہی ملنے آگیا۔ اس نے کرمجیت کو بتایا کہ نزدیکی دور کے دیہاتوں میں اب تک قریباً بیس سکھ نوجوانوں کو جعلی پولیس مقابلوں میں ہندو پولیس نے مار ڈالا ہے۔

پیلی پگڑی باندھے ہوئے گیانی کرپال سنگھ نے اس روز حوالدار کرمجیت سنگھ سے کہا تھا۔

"فوجی سیہاں! وہ بہت جلد آنے والا ہے جب تم بھی یہی بسنتی پگڑی باندھ لو گے۔"

اگلے روز دونوں کی سگائی ہوگئی۔ کرمجیت اور ستوندر کے کسی نزدیکی رشتہ دار نے اس تقریب میں شرکت نہیں کی تھی، کیونکہ دونوں برادریاں اس فیصلے سے مطمئن نہیں تھیں۔ لیکن نزدیک دور کے دیہاتوں میں شاید ہی دونوں کا کوئی ایسا جاننے والا ہوگا جس نے اس موقع پر خوشی کا اظہار نہ کیا ہو۔

اس سگائی سے کرمجیت اور ستوندر کی گودلی مراد بر آئی تھی۔ لیکن کرمجیت نے واضح طور پر محسوس کیا کہ لوگ بڑے خاموش، سہمے ہوئے اور ناراض نظر آرہے تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے کوئی زبردستی ان سے ان کا اپنا پن چھین رہا ہو۔

اب وہ بچہ نہیں رہا تھا۔ اسے حالات کی سنگینی کا احساس ہونے لگا تھا۔ گاؤں میں ہونے والے واقعات پر اس کی نظر تھی۔ اسے علم تھا کہ کتنے نوجوانوں کو اب تک سیکورٹی والے تفتیش کے بہانے لے جا چکے تھے۔ اسے بسا اوقات غصہ بھی آتا لیکن فوجی ڈسپلن اب اس کی زندگی کا حصہ بن چکا تھا۔ اس کو سوچنے کی بھی مکمل آزادی نہیں تھی۔

اس مرتبہ حوالدار کرمجیت سنگھ کو ایک ہفتے کی چھٹی ملی تھی لیکن اسے امید تھی کہ دو تین ماہ بعد وہ اپنی شادی کے لئے ایک ماہ کی چھٹیاں لے لے گا۔ اس لئے اس کے باپو نے اس مرتبہ

سگائی پر ہی اکتفا کیا تھا۔

بھوگپور کے مکینوں پر وہ رات قیامت ڈھا گئی جب اچانک ہی آدھی رات کے بعد بی ایس ایف بارڈر سیکورٹی فورس نے سارے گاؤں کو گھیرے میں لے لیا اور ہوائی فائرنگ شروع ہوگئی۔ حوالدار کرمجیت سنگھ ہڑبڑا کر اٹھا اور اس نے چاہا کہ بھاگ کر باہر نکل جائے لیکن اس کا باپو دروازے میں دیوار بن کر بانہیں پھیلائے کھڑا تھا۔

"نہ بچہ! تو سو جا۔ آرام کر۔ تجھے کیا جانے کیا معاملہ ہے۔" اس نے کرمجیت کو ہاتھ کے اشارے سے واپس جانے کو کہا۔

"باپو! مجھے دیکھنے تو دو۔" کرمجیت نے دوبارہ آگے بڑھتے ہوئے کہا اور اپنے باپو کا بازو آہستگی سے ہٹا کر باہر نکل آیا۔

گوربخش سنگھ بیٹے کے تعاقب میں باہر لپکا۔ باہر گلی میں گاؤں کے کچھ اور لوگ بھی جمع تھے۔ سب کا رُخ گاؤں کے گوردوارے کی طرف تھا۔ فائرنگ کی آوازیں اب اسی سمت سے آرہی تھیں۔

گوردوارے سے پہلے ہی گلی کے خاتمے پر تمام لوگ رک گئے۔ گوردوارے کی بتیاں روشن تھیں اور انہیں سامنے کا منظر بخوبی دکھائی دے رہا تھا۔ گوردوارے کو بی ایس ایف کے جوانوں نے گھیرے میں لے رکھا تھا اور وہ ہوائی فائرنگ کر رہے تھے۔ یہ دیکھ کر کرمجیت کا خون کھول اٹھا اس نے ہجوم کو چیرتے ہوئے آگے نکلنا چاہا تو حاکم سنگھ اور گوربخش دونوں اس کی ٹانگوں سے لپٹ گئے۔ کرمجیت کو سمجھ نہیں آرہی تھی کیا کرے؟ کیسے کرے؟

"ٹھہرو سب لوگ! میں دیکھتا ہوں" — سرپنچ کی آواز سنائی دی۔

وہ ہجوم میں راستہ بناتا گوردوارے کی طرف بڑھا۔ اپنی روایت کے مطابق کرپان اس نے ہاتھ میں پکڑی تھی۔ جیسے ہی وہ گوردوارے کے نزدیک پہنچا گھات میں لگے بی ایس ایف کے جوانوں نے اپنی رائفلیں سیدھی کیں اور گاؤں کے لوگوں نے دیکھا کہ گوردوارے کی سیڑھیوں تک پہنچنے سے پہلے ہی سرپنچ زمین بوس ہوگیا۔ کسی نہ کسی طرح وہ گھسٹتا ہوا گوردوارے کی

Scan & PDF
WAQAR

سیڑھیوں تک پہنچ ہی گیا تھا۔ پھر اسے کرزٹ لینے کی بھی مہلت نہ ملی۔۔۔

آخر وہ پر دہشت طاری ہو گئی۔ غم و غصے سے لوگوں کا برا حال تھا۔ اچانک اپنا گوردوارے کے سپیکر چلانے لگے۔ گیانی کرپال سنگھ گاؤں والوں سے مخاطب تھا۔ وہ انہیں کہہ رہا تھا "دشمن کے واسطے کوئی اس طرف نہ آئے۔ یہ لوگ صرف میری جان لینا چاہتے ہیں میرے ساتھ کوئی اور نہ مرے" اس کے ساتھ ہی "اردا اس" شروع ہو گئی۔

"اردا اس" کے آخر میں جب گیانی کرپال سنگھ نے "جے کارہ" بلند کیا تو سارا گاؤں اس کا ہم آواز تھا۔ لوگوں نے دیکھا گیانی جی ہاتھ میں ننگی کرپان لیے سر پر کیسری دستار سجائے گوردوارے سے برآمد ہوئے۔ وہ اونچی آواز میں "جپ جی" کا پاٹھ کر رہے تھے اس کے ساتھ ہی گولیاں چلنے لگیں۔ گھات میں لگے بی ایس ایف کے جوانوں کو شاید یہ حکم ملا تھا کہ زندہ کسی کو گرفتار نہ کرنا۔ دوسرے ہی لمحے گیانی کرپال سنگھ کا جسم بے جان ہو کر گوردوارے کی سیڑھیوں پر گر پڑا۔ خون ان کے جسم سے نکل کر سیڑھیوں پر پھیلنے لگا تھا۔

گیانی کے گرتے ہی بی ایس ایف کے جوان چیخنا چلانا شروع کر کے ٹرک میں بیٹھ گئے اور ٹرک گاؤں کی لہلہاتی فصلوں کو اپنے بڑے بڑے بے ہنگم ٹائروں تلے کچلتا تیزی سے پکی سڑک کی طرف بھاگنے لگا۔

وہ رات بھوگپور کے مکینوں پر بہت بھاری رہی۔ سارے گاؤں میں صفِ ماتم بچھ گئی۔ گیانی کی موت نے نزدیک دور کے دیہاتوں کو رلا دیا۔ لوگ جوق در جوق اس طرف اللہ سے چلے آتے تھے۔ گیانی کے متعلق اس علاقے کا بچہ بچہ جانتا تھا کہ وہ ایک امرت دھاری سکھ ہے اور دوا دارو کا بیروکار۔ اس کے علاوہ اس پر کوئی الزام عائد نہیں کیا جا سکتا تھا۔

حوالدار کرمجیت سنگھ کا خون دوبارہ تب کھولا جب صبح اس نے اخبار کی چٹنی چاٹتی سرخیوں میں ایک خبر یہ بھی دیکھی۔

بھوگپور کا سرپنچ بیجا سنگھ اور گیانی کرپال سنگھ پولیس مقابلے میں مارے گئے۔ دونوں

دہشت گرد اور پولیس کو متعدد مقدمات میں مطلوب تھے۔ گیانی کرپال سنگھ کے گاؤں کے لوگ غم و غصے سے باؤلے ہوئے جاتے تھے۔ لیکن وہ کچھ کر نہیں سکتے تھے۔ ان کے متعلق گوردوارے کی بے حرمتی ہوئی تھی۔۔۔ گاؤں کے دو معزز بزرگ بے گناہ مارے گئے تھے۔ ان کے دلوں میں موجود نفرت کی جڑیں اور گہری ہو گئیں۔ اب انہیں اس بات کا یقین ہو چلا تھا کہ حکومت کے نزدیک "دہشت گرد" کون ہے؟

کرمجیت کے لئے اپنے جذبات پر قابو پانا بڑا مشکل تھا۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ جیسے بھی ممکن ہو گیانی اور سرپنچ کے قاتلوں سے بدلہ لے۔۔۔ لیکن اس کی سرکاری حیثیت کرمجیت کو ایسا کرنے سے روک رہی تھی۔

اگلی صبح گوردوارے سے گیانی کا نائب اپنے ساتھیوں کے ساتھ "بھجن کیرتن" کر رہا تھا۔

جے تم پریم کھیلن کا چاؤ
سر دھر تلی گلی مورے آؤ

اشلوک نے کرمجیت کے دل میں آگ لگا دی تھی۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ وہ بھی گاؤں کی پنچائیت میں پہنچ جائے جہاں لوگ اکٹھے ہو کر ہند سرکار کی جان کا ماتم کر رہے تھے۔ سارا گاؤں نفرت کی زبان بنا ہندوؤں کو گالیاں دے رہا تھا۔ گاؤں کے باہر جانے والے تمام راستوں پر پولیس اور بی ایس ایف کا پہرہ تھا اور یہاں موجود لوگوں کی حیثیت محصورین کی سی ہو کر رہ گئی تھی۔ نزدیک دور کے دیہاتوں سے آنے والے لوگ بھی بھوگپور میں پھنس کر رہ گئے تھے۔

گاؤں والوں نے "اکھنڈ پاٹھ صاحب" کا بھوگ ڈال دیا تھا اور نوجوان، بوڑھے سب مل کر ننگی کرپانیں ہاتھوں میں لئے گوردوارے میں موجود تھے۔ کرمجیت کو آج پہلی دفعہ اپنی وردی سے نفرت کا احساس ہوا تھا۔

دوسرے دن حوالدار کرمجیت کی چھٹی ختم ہو گئی۔۔۔!

اپنی پلٹن میں واپس لوٹتے ہوئے وہ دل میں بڑا بوجھ محسوس کر رہا تھا۔ کمپنی میں پہنچنے پر یہ

WAQAR
Scan x PDF

خبر بم کے دھماکے کی طرح اس کے ذہن میں پھٹی کہ اس کی کمپنی کے تین سکھ فوجی اپنے اسلحے سمیت فرار ہو کر امرتسر پہنچ گئے ہیں اور انہوں نے دربار صاحب میں سنت جرنیل سنگھ بھنڈرانوالہ کے پاس پناہ لے لی ہے ۔ اس سے پہلے کہ مجیت کو خبر مل چکی تھی کہ سنت جرنیل سنگھ نے خود کو دربار صاحب میں محصور کر لیا ہے اور ان کے پیروکار اسلحہ لے کر ان کی حفاظت کر رہے ہیں۔ اسی اثنا میں پنجاب کے قریباً ہر دیہات میں سنت جی کے پیروکار سنت کا یہ پیغام پہنچا چکے تھے کہ تمام سکھ خود کو جس حد تک ہتھیاروں سے مسلح کر لیں۔ کسی بھی لمحے انہیں زندگی موت کا معرکہ پیش آ سکتا ہے۔

کرمجیت نے پروگرام کے مطابق اپنا ایک اور پیرا کمانڈو کورس کرنے ڈیرہ دون جانا تھا اور ذہنی طور پر خود کو اس کے لئے تیار کر رہا تھا۔ اچانک اسے حکم ملا کہ اس کا کورس منسوخ ہو گیا ہے اب اس کورس میں صرف ہندو فوجی ہی شرکت کر سکیں گے۔ ملک کے مختلف حصوں سے سکھ فوجیوں کے فرار ہو کر زیر زمین سرگرم عمل خالصتان تحریک میں شامل ہونے کی اطلاعات نے فوج میں موجود باقی سکھوں کے خلاف شک کی دھند پیدا کر دی تھی اور یہ خبریں بھی ملنے لگی تھیں کہ بیشتر رجمنٹوں میں سکھوں سے بتاری اسلحہ بھی واپس لیا جا رہا ہے۔ ایک خاص حکمت عملی کے تحت سکھ فوجیوں کو چھاؤنیوں تک محدود کر دیا گیا۔

کورس سے اپنی علیحدگی کو کرمجیت نے بڑی شدت سے محسوس کیا وہ کمانڈو تھا اور اس کی فطرت میں مصروف پیکار رہنا داخل ہو چکا تھا لیکن یہاں اسے کوارٹر گارد کمانڈر بنا کر صرف چھاؤنی تک محدود کر دیا گیا تھا۔ اس دوران وہ اپنے گاؤں کے متعلق بڑی تشویش میں مبتلا رہا ۔ وہ سمجھتا تھا کہ آرمی انٹیلی جنس سکھوں کے خطوط سنسر کرتی ہے اس لئے اس نے گاؤں میں کبھی خط نہ لکھا۔

وقت جیسے گزر ہی رہا تھا۔ جب یہ خبر بجلی بن کر کرمجیت پر گری کہ بھارتی فوج نے دربار صاحب پر حملہ کر دیا ہے ۔ اندر موجود سنت بھنڈرانوالہ کے ساتھی جنرل شوبیگ سنگھ کی کمان میں زندگی اور موت کا معرکہ لڑ رہے ہیں ۔ اس روز کرمجیت اسنگھ کو شدت سے وہ مسلمان جنگی قیدی یاد آیا جس نے اس سے کہا تھا "ہماری اور ہندوؤں کی لڑائی تو ہزار سال سے جاری ہے تم دونوں کے

بیچ کہاں سے آ گئے"۔

"واقعی اس نے سچ کہا تھا" ۔ کرمجیت بڑبڑایا۔

یہ خبر اس یونٹ میں دوپہر کے بعد پہنچی تھی۔ کرمجیت اپنی بیرک کے باہر کھڑا تھا۔ جب بیرک کے ایک کونے سے اس نے "ست سری اکال" اور "خالصتان زندہ باد" کے پرجوش جے کارے سنے۔ اس کے دل کی دھڑکن بے قابو ہونے لگی۔ پھر اس نے دیکھا۔ پانچ غیر مسلح سکھوں کے ہاتھ ان کی پگڑیوں سے باندھ کر ہندو فوجی انہیں گنوں کے بٹ مارتے ہوئے اس طرف لا رہے تھے ۔!!

"حوالدار صاحب ! انہیں کوارٹر گارد میں بند کر دیں" ایک ہندو نائیک نے اس کے نزدیک پہنچ کر اسے سلیوٹ مارتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے" مشکل اس کے منہ سے نکلا۔ وہ اس وقت کوئی بھی غلط قدم اٹھانے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا۔

جب وہ اپنی گن سنبھالتا ہوا سکھ فوجیوں کو اپنی نگرانی میں بند کردار ہا تھا تو ایک سکھ فوجی نے نفرت سے اس کے منہ پر تھوک دیا۔

"تم کسی سکھ کے جنے ہی نہیں ہو بے غیرت، بے شرم ہرمندر صاحب تباہ ہو گیا اور تو ابھی تک ہندو کی نوکری کر رہا ہے لعنت ہو تجھ پر"۔ کرمجیت کا خون کھول اٹھا۔ لیکن مصلحت خاموشی ہی میں تھی۔

وہ سر جھکائے کھڑا رہا۔

پانچوں کو الگ الگ سیل میں بند کر کے انہوں نے چابیاں حوالدار کرمجیت کو لوٹا دیں اور اسے سلیوٹ مار کر واپس چلے گئے۔ کرمجیت بھی ان کے ساتھ ہی واپس لوٹ آیا۔ کوارٹر گارد میں موجود جوان پہرے کے لئے وہاں موجود رہے۔ ابھی تک مشتعل سکھ فوجی اسے گالیاں دے رہے تھے۔

میدان صاف ہوتے ہی کرمجیت ان کے نزدیک آ گیا ۔!

"سنو" ! اس نے گالیاں بکتے سکھوں کو جوش غضب سے للکارا ۔ "میں بھی جٹ کی اولاد ہوں

SCANNED BY WAQAR

جاؤ! تمہاری طرح ایڑیاں رگڑ رگڑ کر نہیں۔ کچھ کر کے مروں گا۔ آؤ میرے ساتھ۔!" اس نے موقع پر موجود سکھ لانس نائیک کو جس نے کوٹھریوں کی چابیاں پکڑی ہوئی تھیں۔ اشارہ کیا اور چند منٹ کے بعد وہاں کرمجیت اور اس کے ساتھی سکھ لانس نائیک سمیت سات آدمی موجود تھے۔

"ادھر آؤ۔" اس نے باقیوں کو اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔

حوالدار کرمجیت کا رُخ اسلحہ خانے کی طرف تھا۔!

تھوڑی ہی دیر کے بعد ساتوں بپھرے ہوئے سکھ فوجی ایک ٹرک میں سوار جسے کرمجیت کا لانس نائیک مہندر سنگھ چلا رہا تھا۔ میرٹھ چھاؤنی سے برآمد ہوئے۔ چھاؤنی کے دروازے پر جب انہیں مشتبہ سمجھ کر روکنے کی کوشش کی گئی تو حوالدار کرمجیت سنگھ کی سٹین گن کی سرخ زبان نے موقع پر موجود دونوں گارڈز کو چاٹ لیا۔

میرٹھ سے دہلی جانے والی سڑک پر پہنچنے سے پہلے ان کے فرار کی خبر جی ایچ کیو میں پہنچ گئی تھی۔ اور ان کی سرکوبی کے لئے مناسب اقدامات کر لئے گئے تھے۔ چھاؤنی سے بمشکل دو کلومیٹر کے فاصلے پر ان کا پہلا ٹکراؤ اپنی ہی کمپنی سے ہوا۔ اس حملے میں جہاں کرمجیت سنگھ کے تین ساتھی مارے گئے وہاں دشمن فوج کو بھی خاصا جانی نقصان اٹھانا پڑا۔ اسی بغاوت کو کہ بھارت کی بیشتر چھاؤنیوں میں پھیل چکی تھی لیکن میرٹھ شاید پہلی جگہ تھی جہاں "باغیوں" سے مقابلے میں ایک ہندو کرنل کو جان سے ہاتھ دھونے پڑے۔

تعاقب کرنے والے فوجیوں کو بتایا گیا تھا کہ مفرور ٹرک میں سوار حوالدار کرمجیت سنگھ بڑا پختہ ہوا کمانڈو ہے اور اس کو زندہ یا مردہ بہرحال پنجاب میں داخل ہونے سے پہلے روکنا ہے۔

دوسری طرف میرٹھ سے ہی کرمجیت نے باقی ساتھیوں سے علیحدگی اختیار کر لی۔ اسی کے مشورے پر تمام لوگ اب الگ الگ سفر کر کے امرتسر کی طرف ان ہزاروں سکھوں کی طرح بڑھ رہے تھے جو یہاں محاصرے میں آئے اپنے "سورماؤں" کی مدد اور "پنتھ دی چڑھدی کلا" کے لئے اس طرف یلغار کر رہے تھے۔ شام تک اس نے خود کو کھیتوں میں چھپائے رکھا اور اندھیرا ہونے پر باہر نکل آیا۔ سویلین کپڑوں کا حصول اس جیسے ماہر کمانڈو کے لئے کوئی ایسا مشکل مسئلہ نہیں تھا۔ اسی کی تلاش میں بھارتی فوج کی

WIQAR
Scan x PDF

انتظامیہ کے لوگ پاؤں پاؤں ہوتے ہوتے تھے لیکن وہ ان کی دسترس سے باہر تھا۔

اگلے روز جب شام ڈھلے وہ امرتسر پہنچا تو شہر میں کرفیو نافذ تھا اور چپے چپے پر فوج پہرہ دے رہی تھی۔ شہر کو اس طرح فوج نے محاصرے میں لیا ہوا تھا کہ کسی پرندے کا پَر مارنا بھی ممکن نہیں رہا تھا۔ شہر سے باہر دیہاتوں میں مشتعل اور غم و اندوہ کے مارے سکھ کرپانیں لہراتے ہوئے دھاڑیں مار مار کر رو رہے تھے۔

یہیں اسے یہ جاگداز خبر بھی مل گئی کہ جنرل شوبیگ سنگھ اور سنت جنڈرانوالہ مارے گئے ہیں۔ مزاحمت ختم ہو گئی ہے اور دربار صاحب کے اندر بند فوج نے خون کی ندیاں بہا دی ہیں۔ اندر موجود شاید ہی کوئی خوش قسمت زندہ بچ کر آیا ہوا۔

امرتسر کے گرداگرد موجود قریباً ہر دیہات میں فوج کے ہاتھوں زخمی ہونے والے سکھ موجود تھے جنہیں لوگوں نے گھروں میں چھپایا ہوا تھا۔ رات گئے یہاں اطلاع پہنچ گئی کہ فوج نے بھگوڑے سکھ فوجیوں اور مشتبہ سکھوں کی تلاش میں امرتسر کے نزدیکی دیہاتوں پر دھاوا بول دیا ہے اور کسی بھی لمحے یہاں فوج پہنچ جائے گی۔

حوالدار کرمجیت سنگھ نے اپنے ایک جاننے والے کے گھر میں پناہ لے رکھی تھی اور وہ نہیں چاہتا تھا کہ ان لوگوں پر اس کی وجہ سے کوئی مصیبت آئے۔ گاؤں کے جذباتی سکھ نوجوانوں کو جب علم ہوا کہ وہ مفرور فوجی ہے تو وہ اس کے پاس کرپانیں اور پستول لے کر پہنچ گئے۔ وہ لوگ بضد تھے کہ کرمجیت کی کمان میں نزدیکی تھانے پر حملہ کریں گے۔ کرمجیت ایک تربیت یافتہ کمانڈو تھا اور اس طرح ان لوگوں کو اندھے کنوئیں میں چھلانگ لگانے کی اجازت نہیں دے سکتا تھا۔ اس نے نوجوانوں کو سمجھانے کی بہت کوشش کی لیکن یہ لوگ کسی طرح قابو میں نہیں آ رہے تھے۔ اس طرح انہیں اکیلا مرنے کے لئے چھوڑ دینا اس کی غیرت نے گوارا نہ کیا اور تھوڑی ہی دیر کے بعد گاؤں کے پچاس سے زائد بپھرے ہوئے سکھ حوالدار کرمجیت سنگھ کی رہبری میں تھانے کی طرف یلغار کر رہے تھے۔

تھانے پر اس نے حملہ اتنی تنظیم سے کروایا تھا کہ وہاں موجود پندرہ بیس اہل کاروں کو سنبھلنے کی مہلت ہی نہ مل سکی اور وہ قابو آ گئے۔ اسلحہ لوٹ لیا گیا اور حملہ آوروں نے پانچ سکھ اہل کاروں کو زندہ چھوڑ

دیا۔ باقی دس ہندوؤں کو گولیاں مار کر ہلاک کر دیا جس جس سکھ نوجوان کے ہاتھ رائفل لگی وہ دوبارہ اپنے گاؤں کی طرف نہیں گیا۔ حوالدار کرمجیت کے حساس کانوں نے گاؤں کی طرف جانے والی پکی سڑک پر سے آتی کنوائے کی آوازیں سن لی تھیں۔ اس کا رُخ کنوائے کی مخالف سمت ہو گیا۔ گاؤں پہنچنے پر فوج کو سب سے پہلے لوٹ نے اغلاق کر دی کہ نزدیکی تھانے کو لوٹنے اور ہندو پولیس اہل کاروں کے قاتل کا نام حوالدار کرمجیت سنگھ ہے۔

تھوڑے عرصے کے بعد ہی کرمجیت سنگھ کا شمار بھارت کے مستند "دہشت گردوں" میں ہونے لگا۔ بھارت سرکار نے اس کے سر کی قیمت پہلے پچیس ہزار پھر پچاس ہزار چھ ماہ بعد ایک لاکھ روپے مقرر کر دی۔!

اس دوران کرمجیت نے اپنے والد سے صرف دو مرتبہ ملاقات کی تھی۔ اس کی حیرانگی کی انتہا نہ رہی جب اس نے دیکھا کہ بابو کا رویہ پہلے سے یکسر بدلا ہوا ہے۔ اسے یہی امید تھی کہ بابو اس کی اس حرکت پر برہمی کا اظہار کرے گا لیکن اس نے زندگی میں پہلی مرتبہ شاباش دیتے ہوئے کہا "پتر! مجھے امید نہیں میرا خون بے غیرت نہیں ہو سکتا۔"

دوسری مرتبہ جب کرمجیت اپنے والد سے مل کر گیا اگلے ہی دن اسے اطلاع مل گئی کہ اس کے والد کو پولیس پکڑ کر لے گئی ہے۔ اس درمیان اس کا رابطہ اپنے جتھے "تین چار اور بھگوڑے فوجیوں" سے ہو گیا تھا۔ یہ لوگ اب گروہ کی شکل میں کام کر رہے تھے۔

وہ روز بُدھ کی کرمجیت نے دیکھ لیا جب اسے اطلاع ملی کہ اس کا بوڑھا باپ "پولیس مقابلے" میں مارا گیا ہے۔ اس روز پہر حوالدار کرمجیت سنگھ کو بڑی شدت سے وہ "سلمان فوجی قیدی" یاد آ گیا۔ اسے اب "بھارت ماتا" سے گھن آنے لگی تھی۔ وہ "بھارت ماتا" جس کے لئے اپنی جان دینا اس کی زندگی کا سب سے بڑا "آدرش" تھا اسے سیکولرازم کی خود ساختہ اصطلاح سے جتنی نفرت آج محسوس ہو رہی تھی اتنی شاید پہلے کبھی نہ ہوئی تھی۔ اب اسے یقین ہو چلا تھا کہ ہندو جو بظاہر ہر بھیڑ کی کھال اوڑھے ہوئے ہے اس سے زیادہ خونخوار بھیڑیا شاید روئے زمین پر اور کہیں نہیں پایا جاتا۔

"سمندر سنگھ" — اس نے غم و غصے کی شدت سے کھولتے ہوئے اپنے ساتھی کو مخاطب کیا۔ "مجھے قسم ہے واہگورو کی! اگر کل رات تک تھانیدار ورما کو گاڑی نہ چڑھا دوں تو کسی سکھ کا جنا نہیں —!"

"ہم تیرے زندگی موت کے ساتھی ہیں حوالدار" — لانس نائیک سمندر سنگھ نے اس کی ہاں میں ہاں ملائی۔

واقعی اس نے جو کہا کر دکھایا۔ اگلے روز علی الصبح کرمجیت اپنے تین ساتھیوں کے ساتھ تھانیدار ورما کو گاؤں کے باہر لاری اڈے پر گھیرنے میں کامیاب ہو گیا۔ ورما کسی گشت سے واپس آ رہا تھا جب وہ اور اس کے دونوں سپاہی کرمجیت کی گولیوں کی بھینٹ چڑھ گئے۔ کرمجیت تو آندھی کا جھونکا تھا جانے کدھر سے آیا اور کدھر نکل گیا۔ سیکورٹی والے اس کے متعلق سوچ کر پریشان ہو ہو جاتے تھے۔ ان کا واسطہ اپنی ہی فوج کے کمانڈو سے پڑ گیا تھا۔

اس پی کھوسلہ نے چارج لیتے ہی سب سے پہلے کرمجیت کی فائل طلب کی اور رات دیر گئے تک اس کا مطالعہ کرنے کے بعد ایک نتیجے پر پہنچ کر خود ہی مسکرا دیا۔ اس نے کرمجیت کی غیرت پر ہاتھ ڈال کر اسے بلیک میل کر کے گرفتار کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ صبح دیر گئے تک وہ سوتا رہا۔ اگلے روز اس نے ایک خصوصی میٹنگ علاقے کے پولیس افسران کی طلب کی تھی۔ ایک ٹیم کا انتخاب عمل میں لایا گیا — کوئی بھی رائز فاش ہو جانے کے خوف کے پیش نظر کھوسلہ نے یہ خصوصی احتیاط برتی تھی کہ اس ٹیم میں کوئی سکھ اہل کار شامل نہ کیا جائے۔

اس روز رات کے دو بجے بھوگپور کے لوگ پھر ایک نئی قیامت کا سامنا کر رہے تھے۔ حاکم سنگھ کے مکان کو سیکورٹی حکام نے گھیرے میں لے رکھا تھا۔ وہ لوگ حاکم سنگھ کی بیٹی ستوندر کو گرفتار کرنے آئے تھے۔ پولیس کو شک تھا کہ ستوندر بھگوڑے دہشت گرد کمانڈو کرمجیت کی ساتھی ہے اور اس کے خفیہ ٹھکانوں کا علم رکھتی ہے —!!

حاکم سنگھ نے صورت حال کی نزاکت جانتے ہوئے برچھا خود تھام لیا تھا اور کرپان اپنی بیٹی کو تھما دی تھی۔

"میری بچی! رب راکھا! جیتے جی ان موزیوں کے ہاتھ نہ آنا — اگر بچ کر نکل سکو تو نکل جاؤ اب تیری زندگی کرمجیت کے لئے ہے۔ تو اس کی عزت ہے۔ جٹ کی بچی بننا میری بچی! میرے

WAQAR
Scan x PDF

مرنے کے بعد دنیا کو یہ کہنے کا موقع نہ ملے کہ حاکم سنگھ کی بیٹی کو ہندو کے غلیظ ہاتھوں نے چھو لیا تھا۔" دنگو رومی کا خالصہ دا بگو رد جی کی فتح ــــ" حاکم سنگھ تیزی سے باہر نکل گیا۔

"بالو! میری رگوں میں بھی اگر تیرا ہی خون ہے تو دنیا جان لے گی کہ خالصہ دولت کی زندگی پر عزت کی موت کو ترجیح دیتا ہے۔" اس کے ساتھ ہی اس نے بھی "فتح" بلائی اور باپ کے پیچھے پیچھے باہر لپکی۔

دونوں کے تیور دیکھ کر کھوسلہ نے جو خود اس مہم کی کمان کر رہا تھا اندازہ لگا لیا کہ یہ زندہ واپس آنے والے نہیں۔ ان کی طرف بڑھنے والے دونوں پولیس کے جوان چند منٹ ہی میں برچھے اور کرپان کی چبھن سے چیخ اٹھے گئے۔

اور ــــ تھوڑی دیر بعد بھوگپور کے لوگ پھر وہی تماشہ دیکھ رہے تھے جو اس گاؤں کا شاید نصیب بن چکا تھا۔ باپ بیٹی خون میں لت پت گھر کی دہلیز کے سامنے گرے پڑے تھے اور پولیس ان کی لاشیں گھسیٹ کر ساتھ لے جا رہی تھی ــــ اس منظر نے گھر گھر میں اور دروازوں کی اوٹ سے جھانکتی آنکھوں کو خون میں رلا دیا۔ کسی سمت سے "جیکارا" گونجا اور گاؤں کے لوگوں نے پولیس پارٹی کو گھیرے میں لے لیا۔ انہوں نے پولیس کو مجبور کر دیا کہ لاشیں گاؤں سے باہر نہیں جانے دیں گے۔ کھوسلہ نے ایک نیا دیکھی تھی۔ وہ ٹھنڈے دماغ کا افسر تھا۔ بپھرے ہوئے ہجوم سے اپنی بوٹیاں نچوانے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا۔

پولیس لاشیں چھوڑ کر چلی گئی ــــ!

آخری رسومات میں کرجیت نے شرکت کی اور پولیس کی آنکھوں میں دھول جھونک کر نکل گیا۔ اب باغیوں کا گاؤں تھا۔ اس کے بعد ہندو پولیس پیچھے پیچھے تھی اور وہ آگے آگے۔

بیاس سے راتوں رات سفر کر کے وہ گورداسپور کے ایک سرحدی گاؤں میں اپنے ایک ساتھی کے ٹھکانے پر آ گیا تھا۔ تین چار دن یہاں چھپا رہا اور ایک روز مقامی ٹاؤٹ کی نظروں میں آ گیا۔

اس رات جب وہ یہاں سے نکلنے کی تیاریاں کر رہا تھا تو انڈین فوج کی ایک پوری کمپنی نے

گاؤں کو گھیر لیا۔ اس مرتبہ مقابلہ اپنے ہی جیسے لوگوں سے تھا۔ کرجیت نے جی کے ارمان خوب خوب نکالے لیکن قسمت نے وفا نہ کی اور اسلحہ دغا دے گیا۔ خالی ہاتھ وہ سرحد کی طرف بھاگا اور بمشکل چند گز بھاگنے پر ہی گولیوں کا نشانہ بن گیا۔

اگلے روز بھارتی ذرائع ابلاغ نے آسمان سر پہ اٹھا رکھا تھا۔ خبروں کے مطابق، "مشہور دہشت گرد کرجیت سنگھ سابقہ حوالدار پاکستان سے اسلحہ لے کر بھارت کی سرحد میں داخل ہو رہا تھا کہ سرحدی محافظوں کے ساتھ مقابلے میں مارا گیا۔"

اس کے ساتھ ہی بھارتی حکومت نے پاکستان سے زبردست احتجاج کیا تھا کہ وہ سکھوں کے تربیتی مراکز بند کر دے۔

مطبوعہ فیروز سنز (پرنٹنگ) لمیٹڈ لاہور۔ باہتمام عبدالسلام پرنٹر اینڈ پبلشر

WAQAR
Scan PDF

WAQAR

Scan x PDF

یہ کہانیاں جو آپ پڑھیں گے میں نے وقتاً فوقتاً لکھی تھیں اب کتابی صورت میں ایک جگہ اکٹھی کر دی گئی ہیں۔ کیسی ہیں؟ اچھی! بُری! مجھے اس سے غرض نہیں۔ یہ فیصلہ آپ کرتے رہیں۔ اس منافقانہ دَور میں دو ٹوک رائے نہیں دی جاتی۔ تجربات اور مشاہدے نے مجھے سکھا دیا ہے کہ زندگی سفید یا سیاہ نہیں۔ اس کے اور بھی بہت سے رنگ ہیں جس پر جو رنگ چڑھ جائے، چڑھ جائے۔ بس یہ ہے کہ دُلہن وہی جو پیا من بھائے۔!

سچائی کو ہم اپنی ہی عینک سے دیکھنا چاہتے ہیں۔ یہی ہے اس دَور کی سب سے تلخ سچائی۔ اب کوئی مانے، نہ مانے۔

زندگی کی بندر بانٹ میں جنھیں جو اجارہ داریاں الاٹ ہو گئیں، وہ ان پر پشتینی گدی نشینوں کی طرح ڈٹ گئے۔

اب یوں ہے کہ مریدانِ باصفا بھی پیرانِ تسمہ پا ہونے لگے ہیں اور آنکھ وہ کچھ دیکھتی ہے کہ جسے نہ دیکھنے کی دعائیں مانگی جاتی تھیں۔

اَدب برائے اَدب نہیں، برائے شہرت بن گیا ہے اور

"اَدب برائے زندگی" کو یار لوگوں نے اَدب برائے بندگی بنا کر رکھ دیا ہے۔ یہ بھی ہے کہ "شہرت" اور "بندگی" کے بھی اپنے اپنے معیار اور اطوار ہیں۔

کوئی ان پر اِتراتا ہے اور کوئی تاک جھانک چڑھاتا ہے۔

صاحبو! گوشے کا چیلہ اور من مرنے کا میلہ۔

نکھنا میرا "کسب" ضرور ہے لیکن "کمال" مجھے حاصل نہیں کہ "عزیز جہاں" ٹھہرتا۔ بہر حال ہُنرمندوں کی اس بھیڑ میں ایک بے ہُنر نانے کو بھی جیسے تیسے قبول کیجیے۔

فیروز سنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ

لاہور کراچی راولپنڈی

969 0 00972 9